

مئی 2015

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

د



WWW.PAKSOCIETY.COM

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈائجسٹ
کراچی

فینچنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 60/- روپے

سالانہ قیمت - 1080/- روپے

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقاً تو ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

خواتین کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ صائمہ کراچی

ماہنامہ صائمہ میں آپ بھی اپنی رومانوی کہانیاں، افسانے، غزلیں، شاعری، بیوٹی ٹپس، کھانا پکانے کے طریقے، مشکلات کا حل، اور گھریلو ٹوٹکے وغیرہ بھی شائع کروا سکتی ہیں۔ آپ اپنی کاوشیں ارسال کریں تاکہ ماہنامہ صائمہ میں آپ کے نام سے آپ کی کاوشیں جلوہ گر ہو سکیں۔ یاد رکھیں! ماہنامہ صائمہ میں صرف خواتین کی ہی تحریریں شائع ہوں گی۔ اور کہانیاں افسانے وغیرہ صرف عشق اور محبت پر مبنی ہوں۔

کہانیاں ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتا ہے۔

ماہنامہ
صائمہ

نورانی آرکیڈ۔ میزاناؤن فلور رتن تلاء نمبر ۳، کراچی

رابطے کے لئے:- 021-32711915
021-32744391

زہریلی حسینہ

16

08

قرآن کی باتیں

ضرغام محمود

ادارہ

یقین شدائے والی عجیب و غریب لرزہ بر اندام
دل و دماغ پر سکتہ طاری کرنی حقیقی روداد

دین و دنیا میں فلاح پانے کیلئے قرآن کی
باتوں پر عمل کرنا انسانی زندگی کیلئے اہم ہے

موت کا تحفہ

35

29

دلہن کی روح

مدرسہ بخاری

احسان سحر

خوفناک کہانیوں کے حلقہ میں لوگوں کے
لئے دل و دھڑکنے والی عجیب و غریب سنا کر کہانی

رہت کے حلقے میں خوف و ہراس پھیلاتی
حقیقت سے ترس کر دماغ کو بھرت کرنی کہانی

موت کا بدلہ

67

42

رولو کا

مریم فاطمہ

اے وحید

خوف و ہراس کے قہقہے میں جکڑی ہوئی ایک
دہشت ناک، خوف ناک، تھیرا گینز کہانی

دہ دہاتی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی
جادو کی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

خوف کا شکار

81

73

سکتے کی موت

خلیل جبار

ایس امتیاز احمد

حقیقت سے فرار انسان کو ناقابل ازیت
سے رو پار کر دیتا ہے، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

ایک عجیب و غریب عقل کو اچھٹے میں ڈالتی
ناقابل یقین سوچ سے بالآخر حقیقت

87

ناگ منکا

عابد علی جعفری

عقل کو حیران اور دل کو خوف کے قہقہے میں
جکڑتی عجیب و غریب ناقابل فراموش کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس ٹالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

عشق کے اسرار

119

94

زندہ صدیاں

سیدہ عطیہ زاہرہ

ایم اے راحت

عشق کیا نہیں جانتا بلکہ عشق ہو جاتا ہے
..... اس کے صداق سبق آموز کہانی

سوج کے نئے در پہ کھلتی اپنی نوعیت کی
بے مثال، لا جواب اور دلغریب کہانی

مہنگی پیاس

139

135

آدم خور پودے

انیس حبیب خان

ساجدہ راجہ

لفظ لفظ سے خوف نپکا لوز جسم و جہاں کے دو ٹکے
کھڑے کرتی حقیقی سبق آموز اور شاہکار کہانی

خوشی میں اکثر حواس کھودینے والے
تا قاتل کھاتی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں

روح کا انتقام

180

154

عشق ناگن

ملک این اے کاوش

ایم الیاس

خوف و تجسس اور سسپنس جو کہ پڑھنے
والوں کو درمیان حیرت میں ڈال دے گا

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ
رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

خاموشی

207

200

قوس قزح

ساحل دعا بخاری

ادارہ

برسوں دل و دماغ سے کھنڈ ہونے والی حقیقت
کے لہارے میں لپٹی ہوئی شاہکار کہانی

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں

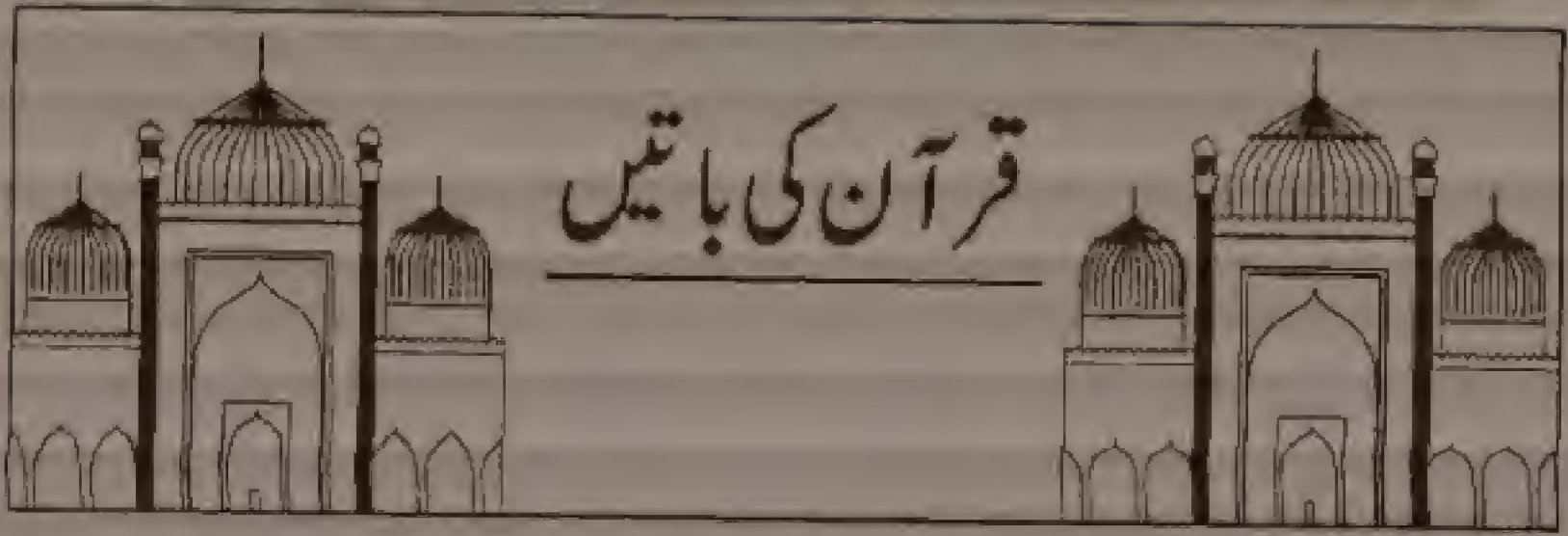
216

خناس

وجیہ کھر

ابھی کہانوں کے حلاشی قارئین کے لئے
حیرت انگیز خوفناک حیرت ناک حقیقی کہانی

خط و کتابت گلیتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیواری بازار کراچی: 32744391



قرآن کی باتیں

☆ مشرکوں کو زیبا نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ ان لوگوں کے سب اعمال بے کار ہیں اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں داخل ہوں کیا تم نے حایوں کو پانی پلانا اور مسجد محترم یعنی خانہ کعبہ کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 17 سے 19)

☆ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر مقتدر ہو تو تم کو تمہارے دین سے بھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال، نیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 217)

☆ مومنوں! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور ان کو راہ اللہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 34)

☆ مومنوں! کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنا راز دار نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی اور فتنہ انگیزی کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے ان کی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو ایسے ان کے سینوں میں بٹھی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تم کو اپنی آیتیں قبول کھول کر سنا دی ہیں دیکھو تم ایسے صاف دل لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور وہ تمہاری کتاب کو نہیں مانتے اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ بد بختو غصے میں مرجاؤ اللہ تمہارے دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 118 سے 119)

☆ مومنوں! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 59)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شیخ سبک الجبسی کراچی)

صباح محمد اسلم کو جرنال سے، السلام علیکم! وہ ماہ سے ڈرڈائجسٹ کے خطوط کی محفل میں شامل نہ ہو سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابو تخت طیل تھے اور سارے گھر کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا، ہم تمام گھر والوں کا دن کا چین اور رات کا سکون ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ہم اپنے بھاگ دوڑ اور پریشانوں سے چھٹکارا نہ پاسکے اور پھر وہ کچھ ہو گیا جو ہم تصور نہ کر سکتے تھے، ہمارے ابو ہم سے جدا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہر کسی نے موت کا ڈانٹ چکھتا ہے اور ایک نہ ایک دن ہر کسی نے اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ لیکن کچھ رشتے اور ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ابو کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، اب ہم ان کے لئے اشک بھری آنکھوں سے دعا ہی کر سکتے ہیں، خیر ڈرڈائجسٹ کے قارئین سے میری التجا ہے کہ میرے ابو کے لئے دعا مغفرت ضرور کریں۔ شکر ہے۔

بلا تلامہ صاحب: ہماری اور تمام قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ابو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین کو میر جمل۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کسی نے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے چلے جانا ہے اور باقی رہے گا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا، جو، اللہ تعالیٰ ہم تمام پاکستانیوں اور تمام مسلمانوں پر اپنا فضل و کرم برکے اور ہمیں نیک عمل کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

وجیبہ سحر جو ہر آباد سے ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے اور ڈائجسٹ کے رائٹرز میں شامل کر لیا۔ ان قارئین کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانی ”خناس“ کو پڑھا اور میری کاوش کو سراہا۔ میں ایک عرصے سے ایک میگزین کے لئے لکھ رہی ہوں لیکن ڈرڈائجسٹ میں کہانی شائع ہونے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اپنے جیسے لوگوں میں آئی ہوں، پراسرار موضوعات پر کہانیاں لکھتا میری حلقہ قلمی صلاحیت ہی نہیں میرا شوق بھی ہے۔ مارچ کا ڈرڈائجسٹ بہترین کہانیوں کا مجموعہ تھا خاص طور پر ملک این اے کاوش کی کہانی ”تمہی دست“ اور بلقیس خان کی کہانی ”موت کا قلعہ“ بہترین تحریریں تھیں۔ انہوں نے کہانیوں میں سبق آموز ہونے کی بات مشترک تھی۔ ایسا ہے راحت کی سلسلہ دار کہانی ”زندہ صدیاں“ اور ایم الیاس کی عشق ناگن نظر انداز اور اچھوتے حقائق کی بہترین مثال ہیں۔ شاعری کا سلسلہ پسند آیا۔ میں بھی اپنی دو غزلوں کے ساتھ اس سلسلے میں شامل ہو رہی ہوں، اگر پسند آئیں تو ضرور شائع کیجئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ کے لئے نت نئے موضوعات پر کہانیاں لکھوں گی۔ بس ڈرڈائجسٹ کے رائٹرز کو اتنا پیغام دوں گی کہ پراسرار موضوعات پر کہانیاں اس طرح لکھیں کہ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہ ہو۔

بلا تلامہ وجیبہ صاحب: بہت بہت شکر ہے کہ آپ نے ڈرڈائجسٹ واہمیت دی اور ڈرڈائجسٹ کے لئے اپنے مثبت خیالات کا اظہار کیا، کون سا اعتراض بھی کہانیاں لکھتا ہے، یہ قارئین کی پسند پر منحصر ہے کہ قارئین اس کی کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں، امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون ڈرڈائجسٹ سے ساتھ جاری رہے گا۔ Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! امید اٹھتی ہے کہ اردو نیچے وہ فیت سے ہوگا اور زندگی کے کاموں کو با احسن انداز میں ادا کر رہا ہوگا، ڈرڈائجسٹ ماہ اپریل 2015ء کا شمارہ 22 تاریخ کو ملے گا، بالکل پرسوجو وہ حسینہ بہت ہی معصوم بھولی بھالی لک رہی تھی۔ خیر اپنی کہانی ہیت دیکھ کر دلی طرہ سے تھی۔ ڈرڈائجسٹ میں اس ماہ کے خطوط بہت اچھے اور پیارے تھے، کہانیوں میں خواہش کا تمام پڑھ کر خوف کے روپ لئے کھڑے ہو گئے، ویلڈن عثمان غنی، آپ ریگولر کیوں نہیں ہو جاتے، منظر کہانیاں لکھنے میں آپ ماہر ہیں، ایس اتیار احمد عجیب تلوک زبردست، ظاہرہ آصف جادوئی پیر بہترین کہانی، جنات سے دوستی شگفتہ ارم درانی انو محی، اچھوتی کہانی۔ قسط دار تحریروں میں روٹو کا اچھی سے ازمدہ صدیاں تھوڑی سی ابھی ہے۔ عشق ناگن پرانے دور کی ہندوستان لک رہی ہے۔ رقص اجل، شہزادہ چاند زیب صاحب آپ کی تحریر کے معیار کے مطابق نہیں تھی، ایم الیاس کی جیل نا گیری کی طرز کی بھی ہوئی کہانی تھی جس میں خوف سے زیادہ ایٹشن قلم بند کیا گیا ہے۔ میری کہانی آخری خواہش آپ کے پاس ہے۔ جلد شائع کر کے شکر ہے کا موقع فراہم کر دیں۔

بلا تلامہ بلقیس صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر ہے، جن رمانوں کی زیادہ کہانیاں موجود ہوتی ہیں وہ ریگولر ہوتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ہر ماہ ایک کہانی بھیج کر انتظار کرنا پڑے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس موضوع پر پہلے سے کہانی موجود ہوتی ہے، کیوز شدہ لہذا

کہانی التوا کا شکار ہو جاتی ہے، جب دو تین کہانیاں ہوتی ہیں تو کوئی نہ کوئی کہانی ضرور شامل اشاعت ہوتی ہے۔ امید ہے خود فرمائیں گی۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے، السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ایک طویل وقفے کے بعد دوبارہ ملاقات ہو رہی ہے۔ نہ تو کوئی ضروری کام تھا نہ کوئی مصروفیت، پھر بھی نہ جانے کیوں رابطہ ہی نہ ہو پایا۔ ہر ماہ رابطہ کرنے کا ارادہ ہاں دھتا مگر پھرتے جانے کیسے وقت ہی گزر جاتا اور بات اگلے مہینے کے حوالے ہو جاتی۔ یوں دھیرے دھیرے کتنا ہی وقت گزر گیا۔ یا شاید دھیرے سے تو نہیں وقت تو بہت تیزی سے گزر گیا ہے۔ مگر میں شکر گزار ہوں آپ کا۔ اور سب قارئین کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ جو میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور انہی کی بدولت مجھے لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ جس کا نتیجہ کہانی کی شکل میں آپ کی میز پر ہوتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی اس تحریک کا نتیجہ ہے۔ میں کسی ایک کا خصوصیت سے نام تو نہیں لوں گا کیونکہ سب قارئین ہی بہت اچھے اور پیار کرنے والے ہیں اور مجھے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہے کہ انہوں نے مجھ کا چیز کو یاد رکھا کیونکہ اس مضمحل میں مجھ سے زیادہ اچھے لکھنے والے، اچھا تخیل رکھنے والے موجود ہیں اور ان کے ہوتے کسی کی کمی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جہاں اتنے اچھے قلم کار موجود ہوں وہاں جگہ حاصل کرنا ہی اعزاز کی بات ہے۔ آپ کے ”حسن نظر“ کی ”نذر“ یہ ”زیر نظر“ کہانی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔ تبصرے کا منتظر رہوں گا۔

آپ سب کا شکر یہ۔ اللہ سب کو خوش رکھے اور سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

میرا نام صاحب: بہت بہت شکریہ کہ اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر ذرا انجسٹ کو یاد رکھا اور کہانی ارسال کی، اچھے لوگ اکثر یاد آتے ہیں اور ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ کہانی اور خط و لی لگاؤ کے لئے ہوتے ہیں اور اس طرح زبان پر خیر و غایت کے الفاظ پھلنے لگتے ہیں، خیر امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے، کہانی لیٹ موصول ہوئی، لہذا آئندہ ماہ شامل اشاعت ہوگی۔

شرف الدین جیلانی شذوالہ یار سے، ایڈیٹر صاحب سلام مسنون، آپ کی اور آپ کے اسٹاف کی خیریت کا طالب ہوں، میری طرف سے ان سب کا شکر یاد رکھیں جنہوں نے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا اور میری اہلیہ کے لئے دعائے مغفرت کی، اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ شوکت علی بلوچ صاحب آپ کے روحانی الفاظ پر عمل کریں۔ اللہ اپنی رستہ لی بارش کرے گا۔ آئندہ تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ ذر کے نئے پرانے، تخیلوں کے لئے دعائیں۔

میرا شرف الدین صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی انتھک مصروفیات کے باوجود لی چند بات کے لئے وقت نکالا، آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔

ضرغام محمود کراچی سے، تسلیات: ماہ اپریل 2015ء کا ذرا انجسٹ خوب صورت سرورق کے ساتھ ملا، سرورق پر نظر پڑتے ہی دل کی دھڑکیں بے ترتیب ہو گئیں، سرورق پر دوشیزا اپنی تمام تر مصومیت کے ساتھ اپنے حنائی ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر مصومیت کا وہ عالم تھا کہ

اتنی	نہ موشی	سی	معموم	نظر
مصرف	دعا	ہو	چھے	کوئی

دل پر جبر کر کے اسٹکوں کو دھری دے کر سرورق سے نظر ہٹا لی اور شہرے کے اندر بھاگ کر قرآن کی باتیں پڑھتے ہوئے غلطوب تک آ گئے، اس دفعہ غلطوب میں کہانیوں پر تبصرہ کم تھا، پچھلے شمارے پر میں نے سیر حاصل تبصرہ لکھ کر سیل کیا تھا، شاید آپ تک نہیں پہنچا اس لئے اس دفعہ ذرا کم سے تبصرہ روات کر رہا ہوں۔ غلطوب میں تمام جنہوں بھائیوں کے غلطوب پڑھتے ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھ کا چیز کی تحریروں کو پسند کیا۔ غلطوب سے آگے بڑھے تو کہانیوں کی باری آئی، سب سے پہلے سلسلے دار کہانیاں پڑھیں۔ رولو کا دزد و صدیاں، عشق ناگن اور فٹاس چاروں کہانیاں نہایت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں، مگر چار چار قسط دار کہانیاں۔ باقی تحریروں میں شہزادہ چاند زیب عباس کی تحریر ”رقص اجل“ سیونی کے دور کی بہترین تحریر مودی تھی جس میں دو ہیرو اور ایک ہیروئن کے درمیان محبت و نفرت کی کشمکش کو عمدگی سے پیش کیا گیا حالانکہ تحریر بہت اچھی تھی مگر اس تحریر میں خوف یا ڈر کا عنصر نہیں تھا۔ ہاں تحریر بہت تھا۔ طاہرہ آصف صاحب کی جاوہر چتر بھی بہترین تحریر تھی۔ خلیل جبار کی پراسرار جوہلی نے بھی متاثر کیا۔ غیبی محافظ اور خونی موٹی بھی اچھی تحریروں تھیں جبکہ اس شمارے کی سب سے بہترین تحریر بلقیس خان صاحب کی جیت تھی مختصری تحریر کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا تھا بہت خوب بلقیس خان صاحب اللہ کر کے زور قلم اور یاد۔ شہزادہ انجسٹ کی مزید ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

بہت بڑا ضرغام صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے غلوں میں دل ارسال کیا، امید ہے آپ ہر ماہ خوب صورت لکھنوں کو تحریر کی صورت میں بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم! شمارہ مارچ ڈیڑا انجسٹ ملا، "نئی دست" بہترین تحریر تھی! آج کل نوجوان نئی نسل جوانی کے نشے میں سب کچھ بھول رہی ہے اور ان کا انجام ملک ملی زمان جیسا ہی ہوتا ہے جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا، نئی نسل کو اس کہانی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ "نیارشتہ" بھی خوب رہا، اندھا قتل "موت کے پنجے" خواب پریشان "موت کے شکنجے میں" غلط فہمی اور "تماشا اجل" یہ ہی کہانیاں پڑھ کر، چھوٹی چھوٹی کہانیاں بہت اپنے اندر دلوں کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی تھیں۔ سلسلے وار تحریریں رولو کا، عشق ناگن رائٹرز کا نام زندہ رکھیں گی! توں قوس بھی پسند آئے، ہر ورق تو اپنی مثال آپ ہوتا ہے! ابھی یہاں ہجواب میں بارشوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے، اور ڈر کے لئے غلط پوسٹ کرنا پھر لیٹ ہوتا جا رہا ہے! خدا جانے اس بار بھی شامل اشاعت ہوتا ہے یا رہ جاتا ہے! تمام رائٹرز کو غلوں میں دل سے سلام!

ہم! اسحاق صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام اہل خانہ پر اپنی رحمت کی بارش برسائے، اور آپ کو کھلی صحت عطا کرے، غلط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

احسان سحر میانوالی سے، السلام علیکم! اللہ پاک تمام اہل مسلم کو جہاں بھی رکھے امن و سکون سے رکھے۔ اچھی باتیں دل سے نکل کر دل میں ہی جا جاتی ہیں، خوشگوار یادیں بھی انسان کے دل و دماغ کو شاد رکھتی ہیں، ہم بھی آج کل موسم بہار کی خوبصورتی کو سمیٹنے اپنے بچوں آئے ہوئے ہیں، جب بھی بہار آتی ہے میں شہر کے شور و غل سے فرار ہو کر اپنے گاؤں کی باتیں میں جا جاتا ہوں۔ امی، ابو اور بھائیوں کے ساتھ وقت اتنا سہانا گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ پھر جب جانے کا وقت آتا ہے تو ہر چہ اداس ہو جاتی ہے۔ خیر یہ تو زندگی کا حصہ ہے آتا جاتا، اور جا کر آتا، جدائی، ملن، خوشی، غمی، یہ زندگی کے تحفے ہیں۔ خیر اپنی محفل میں حاضری، اگر کبھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے... زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوں گے۔ اگر کی کہانیوں پر تفصیلی تبصرے کے ساتھ۔ شاید انکل، جو اب انکل ام اور دوست زیادہ ہیں سے کافی دلی لگاؤ ہے مجھے، غلوں پر ان سے مجھے شک سے حالات کا رونا رونا کافی اچھا لگتا ہے اللہ پاک انہیں صحت و الاسکون عطا فرمائے اور ساتھ تمام قارئین کو بھی آمین۔

ہم! احسان صاحب: غلط لکھنے اور حال دل سنانے اور خیر خیر کیلئے Thanks! امید ہے آئندہ ماہ بھی حال دل سنا کر شکریہ کا موقع دینگے۔
قدیر رانا راولپنڈی سے، قابل احترام امیڈیٹر صاحب، آداب عرض! آپ کی خیریت کا طالب ہوں، اپریل کے شمارے میں غزل کی اشاعت پر تہ دل سے مشکور ہوں۔ امید ہے کہ جاری تعاون کا یہ سلسلہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ میرے بڑے بھائی اور استاد محترم جناب رانا حنیف عاطر صاحب پچھلے تین ماہ سے سخت بیمار ہیں انہیں قافی کا ایک ہوا ہے، قارئین ڈر سے مود باندا تمنا ہے کہ ان کے حق میں دعا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت عطا فرمائے، آمین۔ میں ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں کہ وہ میرے تمام کاتہرہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہم! قدیر صاحب: ہماری اور قارئین کی تہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رانا حنیف عاطر صاحب کی تمام پریشائیاں اور بیماریاں ختم کر کے ملی صحت عطا کرے اور اپنے فضل و کرم سے نوازے۔ (آمین)

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ وعدے کے مطابق Short Story بھیج رہے ہیں۔ بھوت ہاؤس، ہر اسل، غزل ارسال خدمت ہے۔ پریز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ ہماری طرف سے آپ کو اور اسلاف کو دعا سلام اپنا خیال رکھئے گا۔

ہم! امتیاز صاحب: دعا ہے کہ خوش و فرم رہیں، ہر ماہ کہانی بھیجتے رہیں اور ہاں خاص طور سے تجزیہ لکھنا بھولے گا۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کام کی مصروفیات کی وجہ سے جلدی شہر بک اسٹال پر نہ جا سکا۔ آج ہی شہر گیا تو ڈیڑا انجسٹ اپریل کے پرچے سے ملاقات ہو گئی، جسے پا کے میرا دل خوشی سے بارغ بارغ ہو گیا، ہر ورق بہت خوب صورت تھا پرچے کے اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہو گئی، یہ ایک معیاری پرچہ ہے، جو ہمیں مقررہ تاریخ پر مل جاتا ہے، غزل اور غلط شائع کرنے کا شکریہ، پرچے کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ اس بار غلط لیٹ ہو گیا ہے آئندہ ایسا نہیں ہو گا، موسم کافی حد تک بدل گیا ہے۔ ہر طرف رنگ برنگے پھول چمک رہے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ قرآن کی باتیں بہت اچھا سلسلہ ہے، کہانیوں میں جیت، تپائی، بر باد، عشق ناگن، خونی حریف وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر اچھی تھیں، اگر آپ پرچے

میں کچھ تبدیلیاں کریں تو پرچے کو چار چار چاند لگ جائیں گے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی ترقی شہر سے میں جلد سے دیں۔
 ہذا ہذا مسلم صاحب خط لکھنے اور پرچے کی تعریف کے لئے دیری دیری تھک گئیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام اہل
 خانہ کو خوشیوں سے نوازے، اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

وارث آصف خان وہاں پھر اس سے، السلام علیکم! اپریل کا شمار اپنی تمام تر روانیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ ملا۔ سرورق بے
 حد پسند آیا، ڈرڈا نجسٹ میں سرورق کے ٹائل پر بے حد توجہ دی جاتی ہے، کہانیاں بھی مزید اتریں، رد واک کا تو جواب نہیں ہر قسط میں ایک
 نیا دلولہ نیا جوش دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے اندر ایسا سر ہے کہ جو قاری کو جکڑ سالیتا ہے۔ احسان سحر کافی عرصے بعد واپس آئے موسٹ
 و حکم، اب بنا کسی تعطل کے کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ سائل دعا بخاری اس ماہ غیر حاضر تھیں، ان کے بغیر ڈا نجسٹ پھیکا پھیکا سا لگا۔ ان
 کی تمام چٹ پٹی اور نصیحت آمیز باتوں سے اس دفعہ ہم محروم رہ گئے لیکن امید ہے کہ یہ محرومیت صرف اسی ماہ تک ہے، خالد شاہان
 صاحب بے حد اچھا اور زبردست لکھتے ہیں۔ ان کے قلم میں خدا نے وہ سحر سا ڈالا ہے کہ ان کی ہر تحریر پڑھے بنا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ جلد
 سے جلد دوبارہ نئی کہانی کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔ آج کل بارشوں کا میزن ہے۔ اس بار ان رحمت نے کہیں تو فصلوں میں ہریالی ہی بھری،
 فصل جیسے علاقوں میں پانی کی گھنٹی ہوئی مقدار کو کم کیا تو کہیں سیلاب کی صورت میں موت بن کر ابھری۔ کئی لوگ چھتیس گرنے سے جاں
 بحق ہو گئے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) قارئین یہ دنیا
 بے وفا ہے۔ یہاں کسی کو بھی محبت کا صلہ نہیں ملتا۔ اگر کسی کو جان سے بڑھ کر چاہا جائے اس کے لئے ہر حد سے بھی بے شک گزرا جائے
 لیکن اس کا اجر نہیں ملتا۔ محبت کے بدلے محبت نہیں ملتی نفرت ملتی ہے۔ اذیت ملتی ہے۔ اس دنیا میں شاید کبھی محبت کا
 کوئی صلہ نہیں دیتا، ہر کوئی مفاد پرست ہے مفاد ہو تو آپ ان کے لئے جان سے بڑھ کر عزیز ہوں گے، وہ آپ پر جان بھجوا کر رہیں
 گے۔ لیکن جب مفاد کھل جائے گا وہ آپ کو آٹے سے بال کی طرح نکال کر پھینک دیں گے اور پھر ساری اندکی آپ رو تے رہیں گے۔
 کاش کہ دل پر اختیار ہو جائے تو یہ، کبھی مقدور نہ بنے۔ کاش کہ لوگ اس بے وفائوں کو دل لگانے کے بجائے خدا کی ذات سے دل
 لگائیں۔ انسان بے وفا ہے لیکن خدا ہے وفا نہیں ہے وہ تو اپنے بندوں سے حد نہ بڑھ کر پیار کرتا ہے لیکن ہم بجائے اس کے کہ اصل
 محبت کی طرف لٹکیں ہم دیکھ دو کی طرف منہ کرتے ہیں۔ بہر حال ڈرڈا نجسٹ سے تعلق تھا۔ ہے اور رہے گا۔ اب اشاء اللہ ہر ماہ
 حاضری دیا کروں گا اور بہت جلد اک کہانی بھی ارسال کروں گا۔ اگلے ماہ تک اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

ہذا ہذا وارث صاحب ایک مرتبہ پھر ڈا نجسٹ میں موسٹ و حکم، امید ہے کہ اب حسب وعدہ اپنا وعدہ پورا کریں گے، یعنی ڈرڈا نجسٹ
 میں ہر ماہ اپنی کاوشیں پیش کرتے رہیں گے، صلیکس۔

حسین حیدر شاہین لالیاں سے، السلام علیکم! کم ادارے کی ترقی کے لئے نیک خواہشات اور نیک نیتوں کے ساتھ
 دوسری مرتبہ میں پھر حاضر ہوں۔ اپنا خط ڈرڈا نجسٹ میں دیکھ کر دل بانٹ بانٹ ہو گیا۔ امید ہے کہ ڈرڈا نجسٹ ایک دن ان ہی
 اچھائیوں کی وجہ سے آسمان کی بلندیوں کو چھوئے گا۔ اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ ایر میں میں میری سالگرہ پر آپ نے مجھے بہت اچھا تحفہ
 دیا۔ اس کے لئے تھک گئیں۔ قرآن کی باتیں بہت ہی اچھی تھیں۔ اور اب آتے ہیں کہانیوں کی لومین کی طرف۔ تو سب سے پہلے تھیں
 خان کی جیت نے تو دل ہی جیت لیا۔ آپ نے بہت ہی اچھا لکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو اور طاقت بخشے۔ آمین۔ جاوئی چھ، شیخانی
 محلوں، رد واک، پراسرار حویلی نے تو جیسے ڈرڈا نجسٹ میں جان ڈال دی ہو، بہت ہی اچھی اور منفرد تحریریں تھیں۔ نقص اجل سے تو واقعی
 نقص آرا دیا۔ خونی حویلی کو کاشف عبید نے بہت خوب لکھا۔ میں حسب وعدہ اپنی تحریر اور امور انتقام منج رہا ہوں، نیچے 100 فیصد یقین ہے کہ
 یہ تحریر ضرور اپنی جگہ بنا لے گی۔ میں شب و روز ڈرڈا نجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

ہذا ہذا حسین صاحب اللہ کرے کہ امور انتقام اپنی جگہ بنا لے، اچھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور جود کر ہوئی، آپ کو شش پر کوشش
 کرتے رہیں تو یقیناً کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

ایم نادر شاہ شجاع آباد سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ! امید کرتا ہوں کہ ڈرڈا نجسٹ کے تمام قارئین، اصناف اور راسخز خیر و عافیت
 سے ہوں گے۔ اس امید کے ساتھ نیا لکھ رہا ہوں کہ شائع کر کے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ ڈرڈا نجسٹ میں تمام کہانیاں اچھی ہوتی
 ہیں، میں نے بھی نئی کہانیاں بھیجی تھیں۔ ان کا کیا ہوا۔ مجھے سہار جو ب دیکھے گا۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں۔ اس لئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نہیں لکھ سکا۔ آئی ایم سوری کی میری طرف سے تمام ڈر سے انسیت رکھنے والوں کو پیارا بھرا سلام۔

بھٹہ صاحب۔ کوئی اچھی سی کہانی ارسال کریں، جو کہانیاں موجود ہیں، وہ بہت زیادہ اصلاح طلب ہیں اور آج کل وقت کی بہت کمی ہے، اگر وقت ملا تو اصلاح کر کے شائع کر دی جائیں گی۔

طاہر عباس شجاع آباد سے، میری طرف سے تمام قارئین اور راسخون کو پیارا و محبت بھرا سلام قبول ہو۔۔۔ آج ڈر ڈائجسٹ کو دیکھا تو وہ دن یاد آ گئے کہ جب مجھے لکھنے کا شوق تھا۔ لیکن آپ نے میری کوئی اسٹوری شائع نہیں کی تو میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، ڈر پڑھ کر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے، خاص طور پر ردلو کا، اور عشق مانگن یہ کہانیاں تو میری بیسٹ کہانیاں ہیں، مارچ کے شمارے میں سب سے پہلے اپنے پرانے دوست کاشف عبید کی کہانی پڑھی، میری طرف سے کاشف کو بہت بہت مبارک ہو، 2013ء سے ہم نے ڈر ڈائجسٹ کو پڑھنا شروع کیا ہے اور دو تین اسٹوریاں لکھی ہیں اور بھیجی بھی ہیں لیکن مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ نے میری کہانی شائع نہیں کی۔

بھٹہ صاحب۔ جو کہانیاں زیادہ اصلاح طلب ہوتی ہیں وہ انہو کا شکار ہو جاتی ہیں، دلی برداشت ہونا ٹھیک نہیں، لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے اور گاتے گاتے گویا بن جاتا ہے، امید ہے آپ ان باتوں پر غور فرمائیں گے اور نئی کہانی کسی سے اصلاح کر کے ارسال کریں گے۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام افراد خوش و خرم ہوں گے، اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے

آمین۔ سب سے پہلے کہانی شائع کرنے کے لئے شکریہ، امید ہے کہ جس طرح آپ نے یہ کہانی شامل اشاعت کی اسی طرح، مظلوم روحیں۔۔۔ بھی شامل اشاعت ہوگی اور ڈر اپنے چاہنے والوں کو بھی مایوس نہیں کرتا۔ اپریل کے شمارہ کا تو۔۔۔ ابدی زندگی خرم محمود نے

بہت اچھا لکھا، جادوئی پتھر طاہرہ آصف نے حقیقت میں ڈرایا، رقص اجل، خونی حویلی، عجیب مخلوق، جیت، شیطانی مخلول، پراسرار حویلی،

نیمبی کاٹھ، خواہش نام تمام، جنات سے دوستی یہ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، ویسے ساجدہ ایڈیٹر طاہرہ دونوں ہی قابل

ہیں، تو اس قزح میں دعا عالم بخاری، مس فوزیہ کنول، فوزیہ محمود، کان قاطب، فریدہ خاتم، سریم شاہ بخاری، شگفتہ ارم وراثی، ساحل دعا

بخاری، مجھے ان سب کی شاعری بہت اچھی لگی اور باقی سب نے بہت اچھا لکھا۔ اسحاق انجم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دل

لی تکلیف سے نجات دے اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

بھٹہ محسن صاحب۔ آپ کی کہانی کافی اصلاح کے بعد شائع ہوئی اور اب آپ کوئی اور کہانی ارسال کریں، کہانی ایک لائن چھوڑ کر لکھتے

کا۔ امید ہے خوش دلی سے کوئی اور کہانی ضرور بھیجیں گے۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب، آداب و تسلیمات، خیریت مسنون، ایک مرتبہ پھر محبتوں، چاہتوں اور خوشبو

بھری محفل میں حاضر ہیں اور کیوں نہ ہوں شامل، جہاں غلوں بھرے بلا کے گہرے رشتے ہوں، ہاں دل چلتا ہے اور قلم خود بخود غلوں و غفلتوں کا

گلدستہ بناتا چلا جاتا ہے۔ اپریل کا جلد 20ء صبح کی ٹھنڈی دودھ کے آنچل میں خوب صورت سید کے ٹائٹل سے ملا۔ کیا

غضب کا چہرہ تھا۔ جھکی ہوئی ٹٹلیں، ہاتھوں پہ چھتی ہندی اور گلے میں سونے کی زنجیر، معصوم چہرہ، ہاتھ پر جمواتی زلف۔۔۔ میرا دل تو ایک

لے کو دھڑکتا بھول گیا۔ اخطوطہ سارے اچھے تھے۔ لیڈر فرسٹ کے تحت پہلے سات خطوط پیاری بہنوں کے شامل تھے، کوئی شک

نہیں کہ خواہش ڈر پر چھائی ہوئی ہیں اور یہ خوش آئند بات ہے۔ کہانیوں میں طاہرہ آصف کی جادوئی پتھر نے توچہ سبز دل کر دائی،

طاہرہ کو پہلے ہی میں نے ایک اچھا اضافہ قرار دیا تھا۔ منت کر رہی ہیں اور محنت و احسان سے جو انسان کو عام سے خاص بناتا ہے۔

بلقیس خان نے جیت کا تڑکا لگایا، کبھی کبھی انسان ہار کر بھی جیت جاتا ہے اور یہ جیت، حقیقت میں حقیقی جیت نہیں ہوتی۔۔۔ اچھا لکھا،

شیطانی مخلول، میں نے لکھی، امید ہے پسند آئے گی۔ قارئین۔ پلیز تنقید برائے اصلاح ضرور کیا کریں، غلطیوں کی نشاندہی لازمی

ہے۔۔۔ شگفتہ ارم وراثی، جنات سے دوستی کے ساتھ حاضر ہوئی۔ آپ بہت حساس ہو، آپ کی دہن اور مہنی بھی پسند آئی تھی اور بہنا کو

شادی مبارک۔ اللہ پاک خوش رکھے۔ آمین۔ ضرغام محمود کی ابدی زندگی، زبردست، سی۔ ضرغام بھائی۔ آپ میں پھپھو

راسخون منظر عام پر آ رہا ہے اور آنے والے وقتوں میں آپ کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو۔ آمین اور آپ اپنے قلم سے خوب صورت تحریریں

تخلیق کرتے رہیں۔ ڈر کے خوب صورت اور قابل راسخون، ایس ایاز احمد، عجیب مخلوق کے ساتھ سرفہرست رہے، واقعی ان کا نام ہی کافی

ہے۔ مستقبل کے زبردست لکھاری، محنتی اور اچھوتے انداز سے اچھوتی تخلیق کرنے والے اس لکھاری کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔

خواہش نام تمام عثمان نیکی کی خوب صورت تحریر، خواہشات کے تلے رہنے والے انسان، انسانیت کے زمرے سے باہر نکل جاتے ہیں اور

حیوانیت کا منبع نے کرائی قدر و منزلت کھو بیٹھتا ہے۔ غالب نے بھی کہا تھا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم ٹکے بہت ٹکے میرے ارمان مگر پھر بھی کم ٹکے، خواہشات کے پلے تلے دبے والے لوگ خود اپنی ذات کھو بیٹھتے ہیں اور گناہی کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ عثمان غنی نے اچھا Describable کیا۔ good کا شرف عبید کاوش کی ”حویلی حویلی“ اپنی نوعیت کی بہترین تحریر۔ کاشف سے میں نے کہا تھا کہ رنجیدہ نہ ہو، آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی، اور دیکھ لیں، آپ کی کہانی چھپ گئی۔ مبارک ہو جناب۔! مزید محنت اور کوشش کریں۔! میں ڈرڈائجسٹ کی مزید ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

ابنک مدثر صاحب بہت بہت شکریہ کہ آپ نے کہانیوں کا انبار لگا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ کہانی جلوہ گر ہو رہی ہے اور امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص دل سے تجزیہ ضرور ارسال کریں گے۔ Thanks۔

رانا حبیب الرحمن (قیدی) سینٹرل جیل لاہور سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ کے ادارہ اور معنصین ورائٹرز اور اس کے قارئین کو سلام محبت، ماہ اپریل کا سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورتی سے مزین تھا۔ قرآن کی باتیں دل کو منور کر گئیں۔ اس وقت میں دکھ بھری زندگی یعنی زندان میں قید تھائی کاٹ رہا ہوں، سینٹرل جیل لاہور میں سزائے موت کا قیدی ہوں جو کہ ایک ناکردہ جرم میں ہوئی ہے۔ ویسے مجھے جیل میں 9 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ میں نے 2012ء میں کچھ کہانیاں اور تحریریں ارسال کی تھیں لیکن اس کے بعد میرا رابطہ مکمل طور پر ڈر سے کٹ گیا تھا۔ اور اب پھر سے حوصلہ ہمت کو کچا کر کے خط ارسال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری حوصلہ افزائی کر کے شکریہ کا موقع دیا جائے گا۔ ایک قیدی کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ قیدی ہی جان سکتا ہے، جیسے کہ بنجرے میں پرندے اور جانوروں کو بند کر دیا جاتا ہے، خیر اچھے بیٹھے اپنی غلطیوں پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہتا ہوں اور اسی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں، امید ہے میری کاوشیں شامل اشاعت کر کے ضرور خوشی کا موقع فراہم کریں گے۔

مفتی محمد حبیب صاحب بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے۔ ”ظفر آہی اسے نہ جانو! جسے پیش میں خوف خدا نہ ہو اور پیش میں یاد خدا نہ ہو۔“ خیر انسان کے لئے جب دنیا میں سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ایک دروازہ جو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ ہمیشہ کھلا ہوا رہتا ہے اور خدا توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ پتہ نہیں کہ خدا کی رحمت جوش میں آ جائے، ہم آپ کی خوشیوں کے لئے دعا گو ہیں۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہادر شاہ ظفر سے، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا تمام ملکہ، اسٹاف، قارئین اور ورائٹرز حضرات بخیریت ہوں گے، اپریل 2015ء کا شمار 27 مارچ کو موصول ہوا، نائل کافی پر کشش اور مغرب تھا، پچھلے ماہ خط نہ بھیج سکا، وجہ یہ ہے کہ میرے بی بی اس کے امتحان سر پر ہیں اور سر کھجانے کو فرصت نہیں۔ مارچ میں میری استوری خواب پریشان شائع کرنے کا شکریہ، ان دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میری کہانی کی تحریف کی خصوصاً شاہد رفیق صاحب، میرنی ایک اور کہانی بھی بد آپ کے پاس محفوظ ہے، اسے بھی شامل اشاعت کریں، امید ہے کہ بایں نہیں کریں گے، آپ نے مجھے ایک لائن چھوڑ کر لکھنے کو کہا تو کیا میں ایک لائن چھوڑ کر سنے کے دونوں طرف لکھ سکتا ہوں۔ اپریل میں شامل کہانیوں میں خواہش، تمام بڑھی ویلڈن، اس کے بعد ٹیپیں محاذ پر بھی لا جواب کہانی تھی، انیس امتیاز احمد کی عجیب قلوب، بنفیس خان صاحب کی جیت بھی عمدہ اسٹوری تھیں۔

مفتی ابو ہریرہ صاحب، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے فیروں سے کامیاب و کامران کرے، کوئی دوسری کہانی ارسال کریں لیکن ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھیں گا، چاہے دونوں طرف لکھ دیں۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! ماہ اپریل کا ڈرڈائجسٹ 22 کوں آیا۔ نائل اچھا تاثر دے رہا تھا اور آغاز قرآن کی باتوں سے کیا۔ فہرست میں اپنی کہانی خواہش، تمام دیکھ کر دلی ہمناسبت ملی، سب دوستوں کے خطوط پڑھے، بہت اچھے خط تھے، کہانیوں میں مدثر بخاری آپ ریگولر لکھ رہے ہیں، بہت اچھے، ایس امتیاز احمد کی عجیب قلوب، بہت انوکھی واپھونی کہانی تھی۔ جاوئی پکڑ طاہرہ آصف کا لکھنے کا انداز سب سے منفرد اور جدا ہے۔ آپ اسی طرح لکھتی رہیے گا۔ جیت بنفیس خان کی بالکل ڈر کے موضوع کے مطابق تھی، اگرچہ چھوٹی تھی مگر معیاری تھی، تبھی ڈر کے صفحات پر جھونکائی، شگفتہ ارمہد رانی کی جنات سے دوستی عمدہ ترین کہانی تھی۔ ویلڈن شگفتہ جی، قسط وار تحریروں میں رد و کا بیست جاری ہے۔ رقص اجل شہزادہ چاند زیب آپ کی کہانی ڈر ابھی بار نہیں تھی، یہ کہانی ہمارے زیادہ ایکشن کہانی تھی، پلیز آپ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ مگر اتنی بڑی کہانی میں 10 فیصد بھی ڈر نہیں ہوتا کیا وجہ ہے جی آپ کا ماسٹڈ ایکشن سے ہٹا ہی نہیں، پلیز ماسٹڈ نہ کیجئے گا تو سب قارئین کے سبب تک بہترین تھے نئی کہانی بند نہ بنا تھا، بھیج رہا ہوں، امید ہے یہ کہانی جلد ڈر کے صفحات پر جھونکائی گی۔

بڑا بڑا مہمان صاحب ڈرڈ انجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ٹھیکس تمام راسخوں کو تنقید کے معاملے پر توجہ دینی چاہئے تاکہ آئندہ کہانی کی اصلاح ہو جائے۔ آپ کی کہانی آئندہ ماہ ذر کے صفحات پر جگہ کائے گی، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

نعیم اللہ بڑا بڑا سے تمام ذر کی ٹیم کو اور ذر پڑھنے اور لکھنے والوں کی خدمت میں سلام شوق میں آج ہی جماعت و ہم کے استقامت سے فارغ ہوا ہوں اور اپنی پہلی فرصت میں آپ کو خط بعد کہانی ارسال کر رہا ہوں، ہمیں ذر سے اتنی محبت اور لگن ہے کہ اس کے لئے وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ اب ہمیں بھی موقع دیں اور میری کہانی بھی جلد شائع کر دیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ خط ضرور لکھا کریں لیکن ہم خط تو ہر ماہ ارسال کرتے ہیں اور اپنے ذر سے محبت و لگن کا ثبوت دیتے ہیں لیکن آپ ان خطوط کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ یعنی ایک ماہ شائع کر دیتے ہیں اور اگلے ماہ غائب۔ چلیں کوئی بات نہیں اب آپ سے اتنا حساس ہے کہ میری کہانی ضرور شائع کر دیں اور مجھے شکریہ کا موقع دیں چونکہ آج 18 مارچ 2015ء ہے اور ابھی تک ڈرڈ انجسٹ نہیں ملا اس لئے تہرہ کرنے سے قاصر ہوں، آخر میں تمام ذر کے اسٹاف، رائٹرز اور ذر پڑھنے والوں کو دعا سلام، اور ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔

بڑا بڑا نعیم اللہ صاحب اب آپ کہانی بھیجیں تو ایک لاکھ چھوڑ کر کہانی لکھیں گا، کیونکہ جو رائٹر نے ہوتے ہوئے ہیں ان کی کہانی اصلاح طلب زیادہ ہوتی ہے اور ہر تحریر کے لئے کاغذ مزید بڑا لیا کریں۔ اگر خط لیٹ موصول ہوتا ہے تو اشاعت سے رہ جاتا ہے۔

سارز نوید کراچی سے، السلام علیکم! اپریل کا ڈرڈ انجسٹ تھوڑا لیٹ ملا مگر پڑھ کر خوشی ہوئی، تمام کہانیاں ایک خوب صورت گلاب کے ٹکڑے کی مانند اپنی خوشبو بکھیرتے نظر آئیں جن کی خوشبو سے سارا گھر جگ اٹھا، بھائی نے کہا پہلے میں پڑھوں گا اور ہم نے کہا تم قرآن فال ڈال لیا تو قرآن میں نام ہی نکلا سب سے پہلے قسط دار کہانیوں میں ردو کار ہی، پھر عشق و لگن، پہلی بار کسی ڈرڈ انجسٹ میں خطوط کی مکمل میں حصہ لے رہا ہوں، ساتھ ہی دعا کر رہا ہوں شاید کہ ہماری بھی جو صلہ افزائی ہو جائے اور ساتھ ہی اپنی پہلی کہانی، اس امید کے ساتھ بھیج رہا ہوں، شاید کہ ڈرڈ انجسٹ کے قیمتی صفحات میں اپنی جگہ بنا لے۔

بڑا بڑا سارز صاحب ڈرڈ انجسٹ میں سورت و حکم، خوش ہو جائیے جو صلہ افزائی ہو گئی، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شوکت علی بلوچ (قیدی) سینٹرل جیل کراچی سے، پیارے ڈرڈ انجسٹ کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کو السلام علیکم! بعد سلام مالک کائنات سے دعا ہے کہ میرے پیارے ڈرڈ انجسٹ کی پوری ٹیم و فیملی کو سدا خوش و سلامت رکھے اور ترقی و کامرانی عطا کرے۔ آمین۔ سب سے پہلے میں شکر گزار ہوں کہ مجھے تاجیہ کو عزت بخشی اور میری جو صلہ افزائی کی۔ میں جانتا نہیں سکتا کہ مجھے کتنی زیادہ خوشی محسوس ہوئی کہ میری انٹ میں کسی بھی رسالے یا ڈرڈ انجسٹ کے لئے لکھا گیا میرا پہلا محبت و پیار پھر خط شائع کیا گیا، بہت شکریہ۔

اپریل کے ڈرڈ انجسٹ کا ٹائٹل بہت ہی پیارا لگا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا پھر خطوط کا مطالعہ کیا، جس میں اپنا خط پا کر دل بارش و بہار ہوا، پھر کہانیوں اور قلمی قزح کے پیارے اشعار و غزلوں میں کھو کر گم ہوا۔ جیسا کہ میرے پیارے ڈرڈ انجسٹ کے تمام رائٹرز صاحبان بہت ہی اچھا لکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں اور ذر و قلم عطا کرے تاکہ یہ دار و ان پونہمی چلتا رہے۔ آمین۔

بڑا بڑا شوکت صاحب خط لکھنے اور کہانیوں کی لکھنے سے تعریف پہلے بہت شکریہ، امید ہے آئندہ بھی خط ارسال کر کے شکریہ کا موقع دینگے۔

کاشف عہد کاوش بڑا بڑا ساری غلام سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈ انجسٹ کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین بخیر و عافیت ہوں، اپریل کا نیا شمارہ اغرائزی کے طور پر 25 مارچ کو ملا، شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور جب میں نے فہرست کا صفحہ کھولا تو میری خوشی کو چار ٹہنیں ہلکے چالیس چاند لگ گئے، کیونکہ ایک طویل انتظار کے بعد میری کہانی ”خونی حویلی“ شائع ہوئی تھی۔ میں ادارہ ڈرڈ انجسٹ اور ایڈیٹر صاحب کا جس قدر شکریہ ادا کر رہا ہوں، اور پھر رسالے کے کردار بھی لکھا اور پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے جو کہ بہت اچھا جواب تھے۔ شاعری میں بھی سب نے بہت خوب لکھا۔ تین دن میں تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں، اب کسی ایک کہانی کی تعریف کیا کروں، یہاں تو تمام کی تمام اپنی مثال آپ ہیں، خالد شاہان کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ ہوا، دیگر کئی رائٹر بھی نظر نہیں آئے۔ خیر میں اپنی نئی کہانی بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ مئی کے شمارے میں شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے اور دیکھیں 17 مئی کو میری سالگرہ ہے۔

بڑا بڑا کاشف صاحب ارسال کردہ کہانی لیٹ موصول ہوئی، اس لئے اشاعت سے رہ گئی۔ خیر سالگرہ آپ کو بہت مبارک ہو، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور تمام جائز خوشیوں سے نوازے۔ اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا ہم لئے گا نہیں۔

بڑا بڑا

زہریلی حسینہ

ضرغام محمود - کراچی

اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کے ہاتھوں سے جھٹکارا پانے کے لئے
حویلو لڑکی مچلتی رہی اور پھر مجبور ہو کر لڑکی نے اپنے
دانت نوار کے ہاتھ پر گارڈ بیٹے اور پھر چشم زدن میں وہ
شخص مچلتے ہوئے زندہ درگور ہو گیا۔

یقین نہ آنے والی عجیب و غریب لرزہ بر اندام دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی حقیقی روداد

رکھ دیا۔ میری نظریں سڑک پر تھی اور میرا ذہن مسلسل
سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک ماہ پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں
کوئی غیر قانونی کام بھی کروں گا لیکن آج۔۔۔ آج میں ایک
لڑکی کو اس کے گھر سے بھگا کر لے جا رہا ہوں وہ بھی اپنے
ملک سے سینکڑوں میل دور اس تاریک براعظم افریقہ کے
ایک ملک کانگو میں، میں ایک مقامی لڑکی کی محبت میں گرفتار
ہو کر اسے اس کے گھر سے بھگا کر لے جا رہا ہوں۔

مجھے یاد ہے وہ ماہ قبل میرے دوست اشفاق نے جو
پاسٹری میں کافی مہارت رکھتا تھا میرا ہاتھ دیکھتے ہو کہا۔
تمہاری زندگی میں ایک گھمبیر بحران آنے والا ہے۔

”میری زندگی آل ریڈی اتنی بحران زدہ ہے کہ اب
اس زندگی میں مزید کسی بحران کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“
میں نے بات مذاق میں ٹالی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہاری زندگی میں کچھ ایسی
مشکلات آنے والی ہیں جہاں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا
ہے۔ اگر اس دوران تم پاکستان سے باہر گئے تو تمہاری
وائس ناممکن ہے۔“ اشفاق نے مجھ سے کہا۔

”میرے بھائی۔۔۔ پاکستان سے باہر تو دور کی بات
ہے میرے پاس ۱۱ ہور جانے کا بھی کرایہ نہیں ہے۔“ میں

میری گاڑی افریقہ کے ملک کانگو کے
دار الحکومت برازویل کے ہائی وے پر دوڑی جا رہی تھی میں
برازویل سے ڈانکا شہر جا رہا تھا جو کانگو کا ایک دور افتادہ شہر
ہے میری گاڑی میں میرے ساتھ سوہانا بیٹھی تھی۔ میں نے
گاڑی چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے سوہانہ کی جانب دیکھا
وہ گم صم بیٹھی تھی کھڑکی سے آنے والے ہوا کے دلفریب
جھونکے سوہانا کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے اس
کی دلفریب اس کے گالوں کو چوم رہی تھیں اس کا چہرہ کھلتے
گلاب کی طرح تر و تازہ تھا اس کی بڑی بڑی خراں آنکھوں
میں ایک خوف سا صاف نظر آ رہا تھا وہ بار بار اپنے بالوں کو
سنوارتی مگر شریں نہیں پھر اس کے رخساروں پر آ کر کھیلنے لگتیں
وہ خوفزدہ نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

”تم خوفزدہ مت ہو، ہمارے پیچھے کوئی نہیں آ رہا۔“
میں نے سوہانہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ
میں۔۔۔ میں۔ آزاد ہو گئی ہوں۔“ سوہانہ نے بے یقینی سے
جواب دیا۔

”یقین کر لو میری جان۔۔۔ تم آزاد ہو اور بالکل
محفوظ ہو اور میرے ساتھ ہو۔“ میں نے سوہانہ کا ہاتھ
دباتے ہوئے کہا تو سوہانہ نے اپنا سر میرے شانے پر



نے ہنستے ہو جواب دیا۔ اس دن بات آئی گئی ہوگئی۔

دو دن بعد ہی مجھے ایک غیر ملکی چینل سے نوکری کی آفر ہوئی تو میں نے کسی پس و پیش کے بغیر آفر قبول کر لی۔ میں ایک ڈاکومنٹری فلم ڈائریکٹر ہوں اور پاکستان میں میں نے کافی ڈاکومنٹریز بنائی ہیں خاص طور پر بھرپور قحط سالی پر بنائی گئی میری ڈاکومنٹری فلم "موت کا جال" نے کافی پزیرائی حاصل کی اسی لئے ایک غیر ملکی چینل نے مجھے نوکری کی آفر دی جو میں نے قبول کر لی۔ چینل پر نوکری جوائن کرنے کے بعد مجھے پہلا اسائنمنٹ افریقہ کے بامبوؤں کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری بنانے کا دیا گیا۔

افریقہ کے ملک کانگو کے دار الحکومت براز ویلی میں اترتے وقت میرے ذہن میں اشفاق کی باتیں گونج رہی تھیں مگر میں نے سر جھٹک کر ان پریشان کن خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا۔ میں ایک پڑھا لکھا آزاد خیال شخص ہوں اور ہاتھ کی لکیروں وغیرہ جیسی باتوں پر میں یقین نہیں رکھتا۔ براز ویلی آنے سے پہلے میں نے یہاں کی مقامی زبان نوٹو میں جانکاری حاصل کی کیونکہ مجھے یہاں کی مقامی زندگی کو فہم مند کرنا تھا لہذا ضروری تھا کہ مجھے یہاں کی مقامی زبان آئے تاکہ میں لوگوں کی بات سمجھ سکوں لہذا میں نے یہاں آنے سے پہلے نوٹو زبان سیکھی اور یہاں رہتے ہوئے میں نے نوٹو زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی ویسے بھی نوٹو زبان کافی میٹھی زبان ہے۔

میں نے یہاں رہتے ہوئے ایک ماہ میں چینل کی حسب منشاء ڈاکومنٹری بنائی جو چینل والوں کو بہت پسند آئی۔ کام ختم کر کے میں براز ویلی گھوم رہا تھا تو میری ملاقات ڈاکٹر ونود سے ہوئی ڈاکٹر ونود ایک انڈین تھا اور پچھلے پانچ سال سے براز ویلی میں رہائش پذیر تھا۔ کسی دوسرے ملک میں اپنے ہم زبان کامل جانا یقیناً خوشی کی بات ہوتی ہے لہذا میں اور ڈاکٹر ونود دوست بن گئے۔ ڈاکٹر ونود نے اپنے گھر مجھے کھانے کی دعوت دی تو میں انکار نہ کر سکا جب میں ڈاکٹر ونود کے گھر سے دعوت کھا کر نکلا تو میری ملاقات سوہانہ سے ہوگئی۔ میں ڈاکٹر ونود سے رخصت لیکر اپنی کار کی

جانب بڑھ رہا تھا تو مجھے ایک آواز آئی، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ڈاکٹر ونود کے گھر کی اوپری کھڑکی میں سوہانہ کھڑی تھی اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں ایک خوف تھا۔

میں یک ٹک اس کو دیکھتا رہا، سوہانہ کے ریشمی بال اس کے چہرے پر کھیل رہے تھے میں نے اپنے پروفیشن کی وجہ سے سینکڑوں خسین عورتیں دیکھی تھیں مگر سوہانہ میں کچھ الگ بات تھی، میں اس کی رعنائیاں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، اس کا معصومانہ انداز میرا دل کھینچ رہا تھا میں کھینچ کر باندھے اس کو دیکھتا رہا، سوہانہ نے جو مجھے اپنے جانب دیکھتا ہوا پایا تو ہاتھ کا اشارہ کیا، جو میری سمجھ میں نہیں آیا میں نے اشارے سے اس سے پوچھا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو باہر آ کر بات کرو۔

سوہانہ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ٹھہرنے کا کہا اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر اندر چلی گئی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس کو اس نے گول سا بنا کر میری جانب پھینکا میں نے اس کاغذ کو اٹھا کر سیدھا کیا اس میں سوہانہ نے لکھا تھا۔

"میرا نام سوہانہ ہے ڈاکٹر ونود نے مجھے قید کر رکھا ہے وہ روزانہ میرے اوپر تشدد کرتا ہے اور میرے اوپر تجربات کرتا ہے اور مجھے مختلف انجکشن لگاتا اور زبردستی مجھے دوائیاں کھلاتا ہے جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے پلیز۔۔۔ پلیز میری مدد کرو۔"

سوہانہ کا خط پڑھنے کے بعد میں نے سوہانہ کو ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور کہا۔ "میں کل آؤں گا اور اسے یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔"

پھر میں اپنے ہوٹل آ گیا میرے دماغ میں کچھ ہی پک رہی تھی ایک طرف سوہانہ کا حسن مجھے کھینچ رہا تھا تو دوسری طرف دماغ سمجھا رہا تھا کہ میں ایک دوسرے ملک میں ہوں اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی اور میں قانون کی گرفت میں آ گیا تو ساری عمر جیل میں کاٹی پڑ جائے گی۔ مگر دل سوہانہ کی جانب جھک رہا تھا۔ آخر اس دل و دماغ کی جنگ میں جیت دل کی ہوئی اور اگلے دن میں نے چند ضروری کام

میں نے اور شام ڈھلتے ہی ڈاکٹر ونود کے گھر کے سامنے پہنچ گیا وہاں پہنچ کر میں نے ہارن دیا تو اوپر کھڑکی کھل گئی اور کھڑکی میں سوہانہ کا حسین چہرہ نظر آنے لگا۔ سوہانہ کود کچھ کر میں نے اپنی گاڑی میں سے ایک مضبوط رسی نکالی اور اسے کھڑکی میں کھڑی سوہانہ کی جانب پھینکا، دو تین کوششوں کے بعد میں رسی کھڑکی میں کھڑی سوہانہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

”اس رسی کو کسی مضبوط چیز سے باندھ کر اس کے سہارے نیچے اتر آؤ۔“ میں نے سوہانہ سے کہا تو سوہانہ نے کھڑکی کی مضبوط چوکھٹ سے رسی کا ایک سر باندھا اور دوسرے سر اپنے پھینک دیار کی کا دو سر اسرا زمین سے آ لگا۔

”شاہاش اب اس رسی کے سہارے نیچے آ جاؤ۔“
 ”مم۔۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے مگر میں گر گئی تو۔۔۔“
 ”آزادی کے لئے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔۔۔ جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ کوئی آ جائے۔“ میں نے کہا تو سوہانہ رسی کے سہارے نیچے اترنے لگی، رسی بری طرح مل رہی تھی اس کے ہاتھ بار بار پھسل رہے تھے وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی میں رسی کے ٹھیک نیچے کھڑا تھا تاکہ اگر اس کے ہاتھ سے رسی چھوٹ جائے تو میں اسے زمین پر گرنے سے پہلے کچھ کر سکوں۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی، جیسے ہی اس کے پیر زمین پر گئے کھڑکی میں ڈاکٹر ونود کا چہرہ نمودار ہوا۔

”سوہانہ میری بیٹی میری بیٹی تم کہاں جا رہی ہو؟“
 ڈاکٹر ونود دُور سے چیخا میں نے سوہانہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی کار کی جانب بھاگا۔

”رک جاؤ سعدی۔ تم غلط کر رہے ہو۔ تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔“ ڈاکٹر ونود نے چیخ کر مجھے مخاطب کیا مگر میں نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی کار تک پہنچے ہی، میں نے سوہانہ کو کار میں بیٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھا دی، ڈاکٹر ونود مسلسل چیخ رہا تھا۔
 ”مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ میں آزاد ہو گئی ہوں۔“
 سوہانہ نے بے یقینی سے پھر کہا۔

”تم آزاد ہو اس بات کا یقین کر لو۔ مگر ڈاکٹر ونود نے

تمہیں قید کیوں کر رکھا تھا؟ اور وہ تمہیں بیٹی کیوں کہہ رہا تھا۔“ میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

”وہ اپنے آپ کو میرا باپ کہتا ہے مگر باپ ایسے ہوتے ہیں وہ روزانہ مجھے زبردستی نہ جانے کون کون سی دوائیاں کھاتا تھا اور انجکشن لگاتا تھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی کچھ دنوں پہلے تک تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھتا تھا کچھ ہی دن ہوئے اس نے میری زنجیریں کھولی ہیں مگر وہ مجھے اس کمرے سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔“ سوہانہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

”بہت ظالم آدمی ہے ڈاکٹر ونود۔“ میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری ماں۔۔۔۔۔“ تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

”مجھے یاد نہیں۔۔۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو اسی کمرے میں بند پایا، ڈاکٹر ونود کے علاوہ ایک بوڑھی عورت میرے پاس آتی تھی جو میرے کپڑے وغیرہ تبدیل کرتی تھی اور مجھے لکھنا پڑھنا سیکھاتی تھی اس کے علاوہ مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔ نہ جانے میں کب سے اس کی قید میں ہوں۔“ سوہانہ نے جواب دیا۔

”وہ تمہیں کون سی دوائیاں کھاتا تھا۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ وہ کہتا تھا کہ میں بہت خطرناک ہوں۔“

”ہاں ابھی ابھی وہ یہی کہہ رہا تھا مگر۔۔۔ مگر تم تو خطرناک نہیں ہو۔۔۔۔۔“ میں بغور اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”پلیز مجھ سے وہاں کی باتیں نہیں کر دو میں پہلی بار

دنیا کو دیکھ رہی ہو مجھے دنیا دیکھ لینے دو۔“ سوہانہ کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی وہ بہت اشتیاق سے سامین بورڈز پر جلتی بجھتی روشنیاں دیکھ رہی تھی، میں خاموش ہو گیا اور بغور اس کو دیکھنے لگا۔ میں نے کار کی رفتار دیکھی کہ لی تاکہ اپنے ساتھ بیٹھی حسن مجسم کو غور سے دیکھ سکوں، کار میں مدہم روشنی تھی اس روشنی میں سوہانہ کا پرکشش چہرہ چمک رہا تھا اس کے نقوش بڑے ہی حسین اور جاذب نظر تھے اس کے چہرے پر عجیب سی کشش تھی نظریں اس کے چہرے سے

ہنسی ہی نہیں تھیں، سانسوں کے زیرِ دہم سے اس کی جوانی چھلکتی تھی، دل چاہ رہا تھا کہ اس کے معصوم چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا جائے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ تھی وہ کہیں سے خطرناک نظر نہیں آ رہی تھی اگر ڈاکٹر دودا اس کی چڑھتی جوانی کو خطرناک کہہ رہا تھا تو صحیح کہہ رہا تھا ورنہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے خطرناک کہا جائے

ساری رات کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈانگو شہر پہنچ گئے، میں نے پہلے سے ہی رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ شہر کے مضافات میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ مکان ڈانگو شہر کے مضافات میں ایسی جگہ پر واقع تھا کہ اس مکان کے اطراف میں آبادی بہت کم تھی اور مکان کے عقب میں بہت بڑا گھٹا جنگل تھا یہ پینے کے لحاظ سے ایک آئینہ دل مکان تھا میرا ارادہ تھا کہ چند دن یہاں چھپ کر گزارے جائیں اور اس دوران میں سوہانہ کے کاغذات وغیرہ بنوا لوں تاکہ اسے اپنے ملک لے جاسکوں۔

مکان کے پاس پہنچ کر میں نے کارروائی اور اس کو ساتھ لے کر مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

”تم فریش ہو کر تھوڑا آرام کر لو۔“ میں نے اس سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اس کے کمرے کا بتایا۔ ابھی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ بیرونی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور میں اچھل پڑا، میں نے گھوم کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے پر ایک نیگرو کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالتور تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ تھی جس طرح وہ دروازے کو لات مار کر اندر داخل ہوا تھا اسی طرح اس نے لات مار کر دروازے کو بند کیا۔

”کک۔۔۔ کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”خاموشی سے جیسے خالی کر دو۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

نیگرو نے ریوالتور والا ہاتھ لہرایا تو سوہانہ کہم کر دیوار سے چپک گئی تھی نیگرو دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور اس نے سوہانہ کو پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا اور ریوالتور کی نال اس کی کنکٹی سے لگا دی اور اپنا دوسرا ہاتھ پیچھے سے اس کے گلے

میں ڈال کر اس کو اپنے آپ سے چپکا لیا۔

”چھوڑو اسے۔“ میں چیخا۔

”تمہیں ایسا برا لگ رہا ہے جیسے یہ تمہاری بیوی ہو۔“

نیگرو خباثت سے مسکرایا۔

”ہاں یہ میری بیوی ہے۔“ میں دوبارہ چیخا اسی وقت

سوہانہ نے نیگرو کے اس ہاتھ پر جس سے اس نے اس کو گلے سے پکڑ رکھا تھا اس ہاتھ پر اس نے زور سے کاٹ لیا۔

نیگرو کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اس نے سوہانہ کو

زور سے دھکا دیا ساتھ ہی اس کے منہ سے انتہائی غلیظ

کالیاں نکلنے لگیں، سوہانہ بھاگ کر مجھ سے اپٹ گئی

۔ نیگرو نے اپنی کھلائی دیکھی جہاں پر سوہانہ کے دانٹوں کے

نشان صاف نظر آ رہے تھے اچانک نیگرو کی رنگت بدلنے لگی

اس کے دیدے اوپر چڑھنے لگے اور وہ فرش پر گر کر جان کنی

لی حالت میں پڑ پڑ لگا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا

وہ میری جانب دیکھ کر نہایت اذیت سے بولا۔

”یہ۔۔۔ یہ لڑکی زہریلی ہے۔۔۔ تو اس مائن سے شادی کر

کے اب تک زندہ کیسے ہے۔۔۔؟“

نیگرو کے دیدے پھیل گئے اس کا جسم تپا پڑ گیا اور

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیسے مر گیا۔۔۔؟“ سوہانہ دہشت زدہ

انداز میں بولی، سوہانہ سے زیادہ دہشت میں میں تھا ایک تو

نیگرو مر گیا دوسرے سوہانہ کی حقیقت مجھ پر کھل چکی

تھی۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر دودا سوہانہ کو کیوں

خطرناک کہہ رہا تھا وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ ”میں بہت بڑا

خطرہ مول لے رہا ہوں۔“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیسے مر گیا؟“ سوہانہ پھر بولی میں نیگرو

کے قریب گیا میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا وہ مر چکا تھا اس

کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا میں نے مڑ کر سوہانہ کے

جانب دیکھا وہ ابھی تک خوفزدہ تھی اس کے سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا کہ نیگرو کیسے مر گیا۔

”سوہانہ اپنے زہر سے لاعلم ہے۔“ میں نے سوچا

اور سوہانہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر

اسے تسلی دی۔

”سوپانہ تم نہیں جانتی کہ ڈاکٹر ونود نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے اس نے تم پر ایک زہریلا تجربہ کیا ہے جس سے تم نصف عورت اور نصف ناگن بن گئی ہو۔“ میں نے سوپانہ کو اعتماد میں لینا بہتر سمجھا تا کہ وہ بھی متاثر ہے۔

”ناگن۔۔۔ سانپ۔۔۔ میں لیکن وہ تو زہریلے ہوتے ہیں۔“ سوپانہ نے حیرت سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم بھی زہریلی ہو۔۔۔ دیکھو تم نے اس نیگرو کی کلائی پر اپنے دانتوں سے کاٹا تو یہ مر گیا۔“

”میں زہریلی مگر۔۔۔ کیسے۔۔۔؟“

”یہ معلوم نہیں مگر ڈاکٹر ونود جو دوائیاں تمہیں دیتا تھا اور جو انجکشن تمہیں لگاتا تھا اس کی وجہ سے تمہارے اندر زہر بھر گیا۔“ میں نے سوپانہ کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے میں عام لڑکی نہیں ہوں۔“

”تم میرے لئے بہت خاص لڑکی ہو۔“ میں نے ماحول کا تناؤ کم کرنا چاہا۔ ”تم فکر نہ کرو میں تمہارا علاج کرواؤں گا اور تم بالکل سچ ہو جاؤ گی۔“ میں نے اس کو گلے سے لگایا تو اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ پلیز مجھے بچا دو۔“

”تمہیں ڈرنے کے ضرورت نہیں ہے تم اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو جاؤ میں لاش کو ٹھکانے لگاتا ہوں۔۔۔ پھر کچھ کھانے کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔“ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے بھی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ ڈاکٹر ونود مجھے کھانے میں صرف دودھ دیتا تھا اس لئے مجھ کو دودھ ہی دے دو۔“ وہ معصومیت سے بولی

”دودھ تو شاید فریج میں ہو۔“ میں نے کچن کی جانب گھومتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر میں، میں دودھ سے بھرا ایک بڑا سا گلاس لیکر اس کی جانب آیا۔

”لو یہ پی لو۔۔۔ پھر تھوڑی دیر آرام کر لو۔“ میں نے دودھ سے بھرا گلاس اس کی جانب بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی لیا۔ دودھ پی کر جب اس نے گلاس میرے ہاتھ میں واپس تھمایا تو میں نے دیکھا گلاس میں سچ جانے والا

تھوڑا سا دودھ سفید کے بجائے نیلے رنگ کا ہے۔“ اس کا مطلب ہے زہر سوپانہ کے دانتوں سے خارج ہوتا ہے۔“

میں مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا سوپانہ دودھ پی کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے نیگرو کی لاش کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور مکان کے پیچھے حصے میں لیکر گیا میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ مکان کے پیچھے ایک خشک کنواں ہے میں نے نیگرو کی لاش اس کنویں میں ڈال دی اور اس کا ریواور بھی اس کنویں میں پھینک دیا۔ ساری رات کی ڈرائیو لگ اور لاش ٹھکانے لگانے کی مشقت کے بعد میرا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا لہذا میں بھی اپنے کمرے میں آ کر بے سدھ سو گیا۔

شام تک میں سوٹا رہا شام کو اٹھ کر میں تہا ڈھو کر فریش ہوا اور اپنے کمرے سے نکل کر سوپانہ کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ سوپانہ اپنے بیڈ پر پرسکون ٹینڈ سو رہی تھی موتے میں وہ اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی خطرناک ہے اس کے اندر اتنا زہر بھرا ہے جو کسی بھی جاندار کی جان لے سکتا ہے حالانکہ میرے سامنے اس نے ایک آدمی کو اپنے زہر سے موت کی گھاٹ اتارا مگر میں دل کا کیا کروں جو ماننے کو تیار ہی نہیں تھا میں کچھ دیر سوپانہ کے حسین چہرے کو دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آ گیا، اسی وقت میری دروازے پر دستک ہوئی میں نے جب دروازہ کھولا تو دیکھا دروازے کے باہر ڈاکٹر ونود کھڑا ہے۔

”اگر تم سوپانہ کو لینے آئے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔“ میں نے ڈاکٹر ونود کو دیکھتے ہی درشت لہجے میں کہا مگر ڈاکٹر ونود نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

”میں جلد ہی سوپانہ سے شادی کرنے والا ہوں۔“ کچھ دیر بعد میں پھر گویا ہوا۔

”تم سوپانہ کی حقیقت نہیں جانتے اس لئے اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔“ ڈاکٹر ونود نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

”میں سوپانہ کی حقیقت سے واقف ہوں میرے سامنے اس نے ایک آدمی کو کاٹا تو وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔“ میں نے ڈاکٹر ونود کی غلط فہمی رفع کی میری بات سن کر ڈاکٹر

ونود خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔

”تم نے سوہانہ کونز ہر ملی بنا کر بہت بری حرکت کی ہے اور تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، میں تمہارا یہ تجربہ دنیا کے سامنے بے نقاب کر دوں گا۔“ میں سوہانہ کا علاج بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے کر دواؤنگا۔“ میں نے انتہائی زہر بھر لیجے میں ڈاکٹر ونود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے سوہانہ کونز ہر ملی نہیں بنایا بلکہ میں تو اسے اس زہر سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔“ میری بات سن کر بے اختیار ڈاکٹر ونود چیخ پڑا۔

”کیوں۔ تم کیوں سوہانہ پر اتنے مہربان ہو۔“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”کیونکہ سوہانہ میری بیٹی ہے اور ہر باپ کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزارے۔“

”اگر۔ اگر تم نے سوہانہ کونز ہر ملی نہیں بنایا تو وہ زہر ملی کیسے بنی؟“ میں ڈاکٹر ونود پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے اگر ایک کپ چائے مل جائے تو میں پوری تفصیل بتاتا ہوں۔“ ڈاکٹر ونود نے کہا تو میں چائے بنانے کے لئے کچن میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد میں دو کپ چائے لیکر واپس لاؤنگ میں آیا۔ ڈاکٹر ونود اپنی کرسی پر بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا آہٹ سن کر اس نے میری جانب دیکھا اور زخمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور چائے کی پسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

”یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے جب میں جوان تھا۔“ ڈاکٹر ونود نے ہنسا شروع کیا۔ ”میں نے امریکن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مجھے سانپ اور سانپ کے زہر کے بارے میں جاننے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا اس شوق کی خاطر میں نے دنیا بھر کی سیر کی۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ کانگو کے جنگلوں میں ایک وحشی قبیلہ رہتا ہے جس کے پاس انتہائی نایاب قسم کے سانپ ہیں یہ باتیں سن کے مجھ سے رہانہ گیا اور میں فوراً یہاں پہنچا اور اس وحشی قبیلے کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو مجھے پتا چلا کہ وہ قبیلہ ڈونگا کہلاتا ہے اور وہاں مرد کے بجائے عورت

سردار ہوتی ہے جسے سب مبارانی کہتے ہیں۔

میں نے ڈونگا قبیلے تک جانے کا فیصلہ کیا اور ایک دن میں اس قبیلے تک جا پہنچا۔ ڈونگا قبیلہ وحشی ضرور تھا مگر آدم خور نہیں تھا اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر اس قبیلے کی حدود میں پہنچ جاتا تو قبیلے کے محافظ اسے صحیح راستہ بتا کر رخصت کر دیتے لیکن اگر مسافر کوئی غلط کام کرے یا قبیلے کا قانون توڑے تو قبیلے کے لوگ غضبناک ہو جاتے ہیں اور ایسے مجرم کو سانپ سے ڈسوا کر مار دیا جاتا ہے۔

جب میں اس ڈونگا قبیلے کی حدود میں پہنچا تو قبیلے کے محافظوں نے پہلے تو مجھے بھی بھٹکا ہوا مسافر سمجھا مگر میں نے انہیں بتایا کہ میں جان بوجھ کر اس قبیلے میں آیا ہوں اور میرا مقصد ان کے نایاب سانپ دیکھنا ہے۔

یہ سن کر محافظوں نے مجھے مبارانی کے رو برو پیش کیا، مبارانی کو دیکھ کر میں واقعی ڈر گیا، مبارانی پھٹ سے لمبی اور درزشی جسم کی حامل عورت تھی اس کا سر موٹا تھا ہوا تھا وہ بہت زیادہ سیاہ رنگت کی حامل تھی اور سب سے خوفناک چیز اس کے دانت تھے جو نیلے رنگ کے تھے اس نے اپنے چہرے پر مختلف رنگ لگائے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں اور اس کے دونوں ہاتھوں پر خطرناک سانپ لپٹے ہوئے تھے۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ مبارانی کے گلے سے جو سانپ لپٹا ہوا تھا وہ دنیا کا خطرناک ترین سانپ کہہ اتار دیتا تھا جسے قبیلے کے لوگ ناگ دیوتا کہتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔

مبارانی خود اتنی زہر ملی تھی کہ اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ اسی طرح مر جائے گا جیسے اسے کسی سانپ نے کاٹا ہو، مبارانی کی سانسوں سے اتنی تیز بو آرہی تھی کہ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے چکر آنے لگا، ڈونگا قبیلے میں رہتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ جس لڑکی کو مبارانی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اسے بچپن سے ہی چند خاص جڑی بوٹیوں کے ساتھ زہر کھلایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکی زہر ملی ہو جاتی ہے۔

مبارانی نے جب میرے آنے کا مقصد سنا تو اس

نے مجھے اپنے سانپوں کا نظارہ کرایا، واقعی وہاں دنیا کے تائب ترین سانپ تھے۔ خاص طور پر کویراناگ کو دیکھنا میرے لئے حیرت انگیز تجربہ رہا، میں نے وہاں رہتے ہوئے ایک بھرم کو سزا کے طور پر کویراناگ سے ڈسے جانے کا منظر بھی دیکھا وہ بہت دردناک منظر تھا، جس شخص کو کویراناگ نے ڈسا تھا اس کا سارا بدن دھیرے دھیرے پانی بن کر بہہ گیا تھا اور بہت ہی تکلیف سے اس شخص کا دم نکلا تھا، ایسی موت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔“

ڈاکٹر ونود اپنی بات جاری رکھنا چاہتا تھا مگر میں نے بیچ میں دخل اندازی کی۔

”مجھے سانپوں یا ان کے زہر کے بارے میں کچھ نہیں سننا مجھے سوہانہ کے بارے میں بتاؤ۔“ میں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سوہانہ کو بچھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر ونود نے جواب دیا پھر چائے کا کپ منہ کو لگایا اور کپ میں موجود ساری چائے اپنے حلق میں اندیل لی اور پھر اپنی داستان شروع کی۔

”میں چار دن وہاں رہا رات گزارنے کے لئے مجھے ایک جھونپڑی دی گئی، میں دن میں سانپوں کی کھوج کرتا اور رات کو اپنی جھونپڑی میں آرام کرتا میری جھونپڑی کی صفائی کا کام ایک قبائلی لڑکی کرتی تھی وہ گوگی اور بہری تھی۔

ایک رات میں نے کافی شراب پی لی شراب میں اپنے ساتھ ہی لیکر گیا تھا شراب واقعی بہت بری چیز ہے تمہارا مذہب بہت اچھا ہے جس میں شراب حرام ہے۔ تو اس رات میں نے کافی مقدار میں شراب پی لی تھی نشے میں میں بالکل بھول گیا کہ میں کہاں ہوں بس اسی نشے کی حالت میں میں نے اس قبائلی لڑکی کے ساتھ رات گزار لی۔

جب صبح میرا نشہ اترتا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنی بھیا تک غلطی کر دی ہے اور اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے وہ لڑکی بھی نظر نہیں آ رہی تھی میں بہت ڈر گیا مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اس لڑکی نے مبارانی کو میری غلطی کا بتا دیا تو میرا انجام کیا ہوگا، ڈونگا قبیلے کی روایت کے مطابق ہر جرم کی ایک ہی سزا تھی اور وہ سزا تھی کویراناگ سے سونا۔

میں بہت ڈر گیا اور اسی ڈر کی وجہ سے صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے میں ڈونگا قبیلے کی سرحد سے دور آ گیا۔ ڈونگا قبیلے سے زندہ بچ آنے کے بعد میں نے کان پکڑے کے آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرونگا مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔

ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ میں اس واقعے کو بھول چلا تھا۔ مگر پندرہ سال بعد ایک سرکاری وفد کے ساتھ میرا ٹکوانا ہوا تو یہاں کے ایک وزیر سے میری دوستی ہو گئی اس نے مجھے بتایا کہ میری شکل سے ملتی جلتی ایک لڑکی اس نے ڈونگا قبیلے میں دیکھی ہے، اس وزیر کے پاس اس لڑکی کی تصویر بھی تھی۔

جب میں نے تصویر دیکھی تو میں حیران رہ گیا اس لڑکی کی شکل بہت حد تک مجھ سے ملتی تھی اور اس لڑکی کے نقوش اندین تھے اس وزیر نے مجھے بتایا کہ ڈونگا قبیلے والے اس لڑکی کو ناگ دیوتا کا اوتار سمجھتے ہیں کیونکہ وہ لڑکی ایک کنواری کے بدن سے پیدا ہوئی ہے، وزیر کے پاس اس لڑکی کی ماں کی تصویر بھی تھی، جب وزیر نے مجھے اس لڑکی کی ماں کی تصویر دکھائی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لڑکی میری بیٹی ہے کیونکہ اس لڑکی کی ماں وہی گوگی خاتون تھی جس کے ساتھ میں نے رات بسر کی تھی۔

”اور وہ لڑکی سوہانہ ہے۔“ میں نے ڈاکٹر ونود سے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ لڑکی سوہانہ ہے۔۔۔“ ڈاکٹر ونود نے جواب دیا۔

”مگر اب تک یہ نہیں پتا چلا کہ سوہانہ زہریلی کیسے بنی۔“ میں نے پھر پوچھا تو میری بات سن کر ڈاکٹر ونود مسکراتے لگا اور پھر بولا۔

”سوہانہ ڈونگا قبیلے کی ہونے والی مبارانی ہے۔“ ڈاکٹر ونود اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگا۔

”جب مجھے پتا لگ گیا کہ سوہانہ میری بیٹی ہے تو میرا خون جوش مارنے لگا میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی میرا خون اس جنگلی ماحول میں پروان چڑھے اور پھر میری بیٹی کو

زہر بلا بھی بنا دیا گیا تھا ہونچھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں اپنی بیٹی کو اس زہر پر لے ماحول سے نکال لاؤں گا اور اسے تہذیب یافتہ دنیا میں لاکر ایک عام لڑکی بناؤں گا۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود سانس لینے کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا۔

”اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے کانگو کے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطہ کیا اور بھاری رقم پر انہیں اس کام پر راضی کیا پھر میں نے ایک مسلح دستہ تیار کیا اور ڈونگا قبیلے کی جانب پیش قدمی کی، اب یہ میری خوش قسمتی یا ڈونگا قبیلے کی بد قسمتی کہ جب میں اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ ڈونگا قبیلے پہنچا تو اس دن ڈونگا قبیلے کے سارے مرد کسی قصبے کے لئے دوسرے قبیلے گئے ہوئے تھے لہذا مجھے خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا میں نے ایک جال کے ذریعے مبارانی اور سوہانہ کو قابو کیا اور سوہانہ کو اپنے ساتھ لے کر برازہ لی چلا آیا۔

جب میں سوہانہ کو برازہ لی لیکر آیا تھا تو وہ چودہ سال کی تھی میں پانچ برس تک اس کا علاج کرتا رہا مجھے ڈونگا قبیلے کے لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کی حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے لیکن اکیلی سوہانہ میرے لئے درد منی ہوئی تھی وہ اتنی خونخوار تھی کہ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر جھپٹ پڑتی تھی اور وہ اتنی زہریلی تھیں کہ اس کے پاس جانے سے مجھے پکڑ آنے لگتے تھے اس کی سانسیں تک زہریلی تھیں اس کی سانسیں اتنی زہریلی تھیں کہ کوئی کیڑا مکوڑا بھی اس کے پاس آکر زندہ نہیں رہ پاتا تھا۔

شروع شروع میں میں نے سوہانہ کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا حالانکہ سوہانہ کو زنجیروں سے بندھا دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ میں نے سوہانہ کا علاج شروع کیا میرے علاج سے سوہانہ کا زہر بلا پن کم ہونے لگا مگر اس کے ساتھ وہ اپنی یادداشت بھی بھولنے لگی اس کی پچھلی زندگی کے نقوش اس کے ذہن سے مدھم ہونے لگے یہ بات میرے حق میں جاتی تھی لہذا میں نے اس کا علاج جاری رکھا گزشتہ پانچ سالوں سے میں اس کا علاج کر رہا ہوں جس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی مگر سوہانہ

ابھی بھی مکمل طور پر زہر سے خالی نہیں ہوئی اس کے دانتوں اور ناخن سے ابھی بھی زہر کا اخراج ہوتا ہے وہ کسی کو کاٹ لے یا ناخن سے گہری خراش ڈال دے تو کوئی بھی شخص مر سکتا ہے جیسا کہ تم نے دیکھا کہ سوہانہ کے کانٹے سے ایک شخص مر گیا۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود خاموش ہو گیا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے ڈاکٹر ونود کی بات پوری سننے کے بعد پوچھا۔

”تم نے سوہانہ کو یہاں لاکر بہت بڑی غلطی کی ہے کیونکہ اسی شہر کے جنگل میں ڈونگا قبیلہ رہتا ہے میں سوہانہ کو اسی جنگل سے لے کر گیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سوہانہ کو دوبارہ برازہ لی لے کر جاؤں اور اس کا علاج مکمل کروں تاکہ وہ زہر سے پاک ایک عام لڑکی بن جائے۔۔۔ پھر بے شک تم اس سے شادی کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ میری بیٹی کو تم جیسا بہادر اور پیار کرنے والا شوہر ملے۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود پھر خاموش ہو گیا۔

اسی وقت فضا میں ڈھول بجنے کی آوازیں گونجنے لگیں، ڈھول بجنے کی آوازیں سن کر ڈاکٹر ونود اچھل پڑا۔

”انہیں معلوم ہو گیا انہیں معلوم ہو گیا وہ۔۔۔ وہ سوہانہ کو بلارہے ہے۔“ ڈاکٹر ونود نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کون بلارہے ہیں تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ڈونگا۔ ڈونگا قبیلے کے لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ سوہانہ یہاں ہے۔۔۔ یہ ڈھول کی آواز ان ہی لوگوں کی ہے وہ سوہانہ کو بلارہے ہیں۔“ ڈاکٹر ونود بولا۔

”کیا بکو اس ہے انہیں کیسے معلوم کہ سوہانہ یہاں پر ہے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”ان جنگلی لوگوں کی سوتکھنے کی جس جانوروں کی طرح ہوتی ہے انہوں نے سوہانہ کی بوتکھ لی ہے۔“ ڈاکٹر ونود نے مجھے جواب دیا۔

اسی وقت ڈھول کی آواز تیز ہو گئی اور ساتھ ہی ایک دھماکے سے سوہانہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سوہانہ باہر آئی مگر۔۔۔ مگر اس کی حالت عجیب تھی اس کی آنکھیں اوپر کو تھیں جیسی ہوئی تھیں اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ

بری طرح جھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال جھونکا ہو رہا تھا وہ اس طرح جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو۔

”سوہانہ۔۔۔ سوہانہ کیا ہوا؟“ میں سوہانہ کی جانب بڑھا مگر اس سے پہلے کے میں سوہانہ کر پکڑتا سوہانہ نے مجھ پر حملہ کر دیا وہ اپنے ناخنوں سے میرا منہ نوچ لینا چاہتی تھی مگر میں نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو اس کے حملے سے بچایا۔ ”سعدی۔ اس کے ناخنوں سے بچنا۔“ ڈاکٹر ونود نے مجھے خبردار کیا۔

سوہانہ دیوانہ وار رقص کرتی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، میں اور ڈاکٹر ونود بھی سوہانہ کے پیچھے گھر سے باہر نکل آئے سوہانہ گھر سے نکلنے ہی جنگل کی جانب دوڑ پڑی۔

”سوہانہ رک جاؤ۔ سوہانہ میری بات سنو۔“ میں زور سے چیخا مگر سوہانہ میری آواز سے دور جا چکی تھی لہذا میں نے سوہانہ کے پیچھے دوڑ لگا دی میرے ساتھ ہی ڈاکٹر ونود نے بھی دوڑ لگائی ہم دونوں سوہانہ کے پیچھے بھاگ رہے تھے میں سوہانہ کو مسلسل آواز دے رہا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے سوہانہ کے کان بند ہو وہ میری آواز ہی نہ سن رہی ہو حیرت انگیز طور پر سوہانہ کی بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی وہ تیزی کے ساتھ وڑتی ہوئی جنگل میں داخل ہو گئی، میں اور ڈاکٹر ونود بھی اس کے پیچھے جنگل میں داخل ہو گئے اب ڈھول بجنے کی آواز بند ہو چکی تھی شام بھی ڈھلتی جا رہی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم اچانک سوہانہ کے پیچھے بھاگتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے تھے لہذا ہمارے پاس نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ کوئی ایسا سامان تھا جس سے ہم روشنی کر سکیں۔

”سعدی۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ اگر اندھیرا پھیل گیا تو ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر ونود نے کہا۔

”نہیں میں سوہانہ کے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ آپ واپس جائیے اور مدد لے کر آئیے۔“ میں نے ڈاکٹر ونود کو جواب دیا اور سوہانہ کو آوازیں دینے لگا۔ اسی وقت درختوں سے بہت سے آدمی زمین پر کودے ان لوگوں کے ہاتھ میں

بھالے تھے جن کا رخ ہماری جانب تھا وہ ننگے دھڑنگ لوگ نہایت وحشیانہ انداز میں بھالے لہراتے ہوئے ہمارے جانب بڑھے چلے آ رہے تھے ان کے چہروں پر رنگ لگا ہوا تھا اور وہ انتہائی وحشیانہ انداز میں بھالے سنبھالے ہمارے جانب ایک دائرے کی صورت میں بڑھے چلے آ رہے تھے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم ہاتھ اٹھا کر سرینڈر کر دیں، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور زور سے چیخا۔ ”مجھے سوہانہ کے پاس لے کر چلو۔“

ان جنگلیوں نے مجھے اور ڈاکٹر ونود کو اپنے بھالوں کے حصار میں لے لیا اور ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا ہمارے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہذا ہم دونوں ان جنگلیوں کے بتائے راستے پر چلنے لگے کتنی ہی دیر ہم چلتے رہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا، کافی دیر چلنے کے بعد ہمیں ایک جگہ روشنی نظر آئی ایک بڑے سے میدان میں سینکڑوں جنگلی مرد اور عورتیں جمع تھیں ڈھول بجنے جا رہے تھے عورتیں ناچ رہی تھیں سب خوشی کا اظہار کر رہے تھے، چاروں طرف بڑی بڑی مشعلیں جل رہی تھیں، جن کی وجہ سے میدان میں اچھی خاصی روشنی تھی، اس روشنی میں میں نے دیکھا سوہانہ ایک بڑے سے تخت پر سر اٹھائے بڑے شان و وقار سے بیٹھی ہے اس کے ساتھ مبارانی بھی بیٹھی تھی، مبارانی کے گلے میں ایک کالے رنگ کا بڑا سا سانپ لپٹا ہوا تھا جو پھن پھیلانے ہر آنے جانے والے کو گھور رہا تھا اس کے لال لال آنکھیں مجھے اپنے جسم میں گھسی محسوس ہو رہی تھیں۔

بڑا ہی خوفناک منظر تھا ایک لمحے کو میں دہشت زدہ ہو گیا مگر اگلے ہی لمحے مجھ پر سوہانہ کی محبت حاوی ہو گئی اور ماحول کا ڈر و خوف مجھ پر سے جاتا رہا میں زور سے چیخا۔

”سوہانہ میں آ گیا ہوں۔ میں تمہارا سعدی ہوں۔“ مگر میری آواز ڈھول کی اونچی آواز میں دب گئی مجھے اور ڈاکٹر ونود کو ایک درخت سے باندھ دیا گیا، میں مسلسل سوہانہ کو آوازیں دے رہا تھا۔

آخر کار میری آواز سوہانہ تک پہنچ گئی اس نے میری جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ بلند کیا سوہانہ کے ہاتھ بلند کرتے

ہی ناجیتی ہوئی مور میں رک گئیں اور وہ ہول بچنا بھی بند ہو گیا چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ”سوہانہ تخت سے اٹھی اور میری جانب بڑھی اس کے اٹھنے اور چلنے میں ایک شاہی وقار تھا وہ مغرورانہ انداز میں گردن اٹھائے میری جانب آئی اس کے انداز میں ایک غرور تھا مگر اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ میرے پاس آ کر مجھ کی کہنے لگی وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

”سوہانہ میں تمہارا سعدی ہو تم۔ تم نے مجھ سے پیار کا وعدہ کیا تھا۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔“ میں نے سوہانہ کو یاد دلانے کی کوشش کی

سوہانہ خوابیدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی تھوڑی دیر وہ مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”تم۔ تم۔ سعدی۔۔۔ تم نے مجھے قید سے رہائی دلائی ہے۔ تم۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم۔ تم بہت اچھے ہو۔۔۔“ سوہانہ اتنا کہہ کر مبارانی کی جانب مڑی اور مبارانی سے کہنے لگی۔

”رانی اس کو کھول دو۔“

”یہ ہمیں نقصان تو نہیں پہنچائے گا۔“

”یہ میرا دیوانہ ہے خود مر جائے گا مگر مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔“ سوہانہ نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

”اسے کھول کر ایک جھونپڑی میں بند کر دو۔“ مبارانی نے حکم دیا تو میری رسیاں کھول دی گئی اور مجھے ایک جھونپڑی میں بند کر دیا گیا گھاس پھوس کی اس جھونپڑی سے میدان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا مجھے جھونپڑی میں بند کرنے کے بعد مبارانی نے اپنے گلے سے کوبرا ناگ کو نکالا اور زمین پر چھوڑ دیا ناگ رینگتا ہوا ڈاکٹر ونود کی جانب بڑھنے لگا۔

ڈاکٹر ونود مسلسل چیخ رہا تھا ڈاکٹر ونود کی چیخیں سن کر میں برداشت نہ کر سکا اور جھونپڑی کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر ونود کی مدد کے باہر جانا چاہا مگر اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی کسی نے پیچھے سے زور سے کوئی چیز میرے سر پر ماری میری آنکھوں کے سامنے تارے تارے بج گئے اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

مے جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہا جب مجھے ہوش آیا

تو میں نے دیکھا سوہانہ مجھے جھونپڑی سے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے میں نے پوری طرح آنکھیں کھولیں اور ارد گرد دیکھا میں گھاس پھوس کے ایک آرام وہ بستر پر لیٹا تھا، سوہانہ مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سوہانہ بولی۔ ”مجھے افسوس ہے سعدی انہوں نے تمہیں زخمی کر دیا۔“

میں نے بستر سے اٹھنا چاہا تو میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر دوڑ گئی مگر میں برداشت کر کے اٹھ گیا اور بستر پر بیٹھ گیا میں نے اپنے سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرا میرے سر کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا گولہ نکل آیا تھا جس میں شدید درد ہو رہا تھا مگر میں برداشت کئے بیٹھا رہا مجھے اٹھا دیکھ کر سوہانہ بولی۔ ”میں بھی کتنی بد نصیب ہوں تمہارے پیار کا جواب پیار سے بھی نہیں دے سکتی۔“ سوہانہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر رونے لگی، اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور مبارانی اندر داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر مبارانی ہم دونوں کو گھورتی رہی پھر بولی۔

”سعدی۔ سوہانہ نادان ہے وہ کچھ نہیں سمجھ رہی مگر تم سمجھا رہے ہو تم جانتے ہو کہ سوہانہ ڈونگا قبیلے کی ہونے والی مبارانی ہے یہ ہر ملی ہے اور کسی سے شادی کے لائق نہیں، لہذا تم عقل سے کام لو اور سوہانہ کو چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔“ مبارانی کی بات سن کر میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”سوہانہ جیسی بھی ہے میری ہے میں اسے سینے سے لگا کر رکھوں گا اس کا علاج کر اؤنکا میں ہر حالت میں سوہانہ کو یہاں سے لے کر جاؤنکا۔“ میں نے اٹل لہجے میں مبارانی کو جواب دیا اور سوہانہ کا ہاتھ پکڑ کر مبارانی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہیں ہم سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی ڈاکٹر ونود کا انجام یاد رکھو۔“ مبارانی نے غرا کر مجھے دھمکی دی۔

”رانی۔۔۔ سعدی کو دھمکی مت دو۔۔۔“ سوہانہ مجھ سے الگ ہو کر مبارانی کے سامنے ڈٹ گئی۔ مبارانی دانت کچکچا کر سوہانہ کی جانب بڑھی جیسے سوہانہ کو ڈس لے گی مگر پھر رک گئی وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا زہر سوہانہ پر اثر نہیں کرے گا بھلا سانپ سانپ کو کاٹ کر کیا کرے گا۔

میں نے سوہانہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور تیز قدموں کے ساتھ قبیلے سے باہر جانے والے راستے پر چل دیا میں جلد از جلد ڈونگا قبیلے سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ سارا قبیلہ جمع ہو گیا تھا سب ہمیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے میں نے سوہانہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا میرے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔

اسی وقت مجھے اپنے پاس سرسراہٹ کی آواز آئی، میں نے چونک کر نیچے دیکھا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی کو براناگ نے میری پنڈلی پر اپنے دانت مارے اور مجھے ڈس لیا، میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں گر پڑا، میری چیخ سن کر اور مجھے گرتا دیکھ کر سوہانہ دک گئی اور جلدی سے میرے پاس بیٹھ گئی، اس نے بھی کو براناگ کو دیکھ لیا وہ زور سے چیخی۔

”مبارانی۔“

”ہم سے دشمنی بہت مہنگی پڑتی ہے۔“ مبارانی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم میں انکار سے بھر دیئے گئے ہو میرے پورے جسم میں آگ سی لگ رہی تھی میرا چہرہ سفید پڑ رہا تھا میرا دل ڈوبنے لگا تھا میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

سوہانہ نے نیچے بیٹھ کر میری پینٹ کا پانچہ پھاڑا میری پنڈلی پر کو براناگ کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے میں نے ایک زخمی سکراہٹ کے ساتھ سوہانہ کو دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگا۔

سوہانہ میرا ہاتھ اساتھ نہیں تک تھا۔“

”نہیں۔۔۔“ سوہانہ زور سے چیخی اور اس نے اپنے ہونٹ کو براناگ کے کانٹے ہوئے زخم پر رکھنا چاہے تاکہ وہ زہر چوس سکے مگر مبارانی نے آگے بڑھ کر سوہانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگی۔ ”سوہانہ تم زہریلی ہو مگر ناگ دیوتا سے زیادہ نہیں تم جانتی ہو کہ ناگ دیوتا کا زہر تم پر کتنی جلدی اثر کرے گا اگر تم نے ناگ دیوتا کا زہر چوسنے کی کوشش کی تو تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔“

”مجھے پروا نہیں۔ میں اپنی جان دے کر بھی سعدی کی جان بچاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر سوہانہ نے اپنے ہونٹ میرے زخم پر رکھ دیئے اور زہر چوسنے لگی۔ میرا سر گھوم رہا

تھا، میں سوہانہ کو روکنا چاہتا تھا مگر مجھ پر مد ہوش طاری ہو رہی تھی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

میں کب تک بے ہوش رہا مجھے یاد نہیں جب مجھے ہوش آیا تو کچھ دیر، میں خالی الذہن لیٹا رہا پھر مجھے ایک ایک کر کے سارے واقعات یاد آنے لگے، سوہانہ کی یاد آتے ہی میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، میں نے اپنے ارد گرد دیکھا، میں ایک جھونپڑی میں تھا جھونپڑی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، میں نے اپنے چہرے کی جانب دیکھا جہاں کو براناگ نے کانٹا تھا اب وہاں کوئی لپ لکا ہوا تھا، میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا کھڑے ہونے پر مجھے کمزوری کا احساس ہوا میرا سر چکر رہا تھا مگر میں نے ہمت کر کے اپنے قدم جھونپڑی سے باہر نکالے، مجھے باہر آتا دیکھ کر مبارانی اور چند دوسرے لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ مبارانی سے مجھے مخاطب کیا۔

”سوہانہ کہاں ہے؟“ میں نے مبارانی کا سوال نظر انداز کے پوچھا۔

”اس نے اپنی زندگی کے بدلے تمہاری زندگی خرید لی ہے۔“ مبارانی کے لہجے میں یاسیت بھری ہوئی تھی۔

”میں نے پوچھا سوہانہ کہاں ہے؟“ میں نے ایک بار پھر تیز لہجے میں پوچھا تو مبارانی نے ایک شخص کو اشارہ کیا وہ شخص مجھے سہارا دے کر ایک جھونپڑی میں لے کر گیا، مبارانی اور تمام لوگ بھی میرے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہوئے، جھونپڑی میں داخل ہو کر میں نے دیکھا سوہانہ گھاس کے ایک بستر پر لیٹی ہے اس کا حسین چہرہ سفید پڑا ہوا ہے وہ نہایت نقاہت کی حالت میں کراہ رہی ہے، اس کی نیلی آنکھیں بند تھیں۔

”سوہانہ۔“ میں نے نہایت بے تابی سے اسے پکارا تو اس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے سچ سلامت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سکراہٹ آگئی۔

”سوہانہ۔ یہ تم نے کیا کیا۔ مم۔ مجھے مر جانے دیا ہوتا۔۔۔“ میں سوہانہ کے پاس بیٹھ گیا، میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”مہبت قربانی مانگتی ہے۔“ سوہانہ دھیرے سے مسکرائی۔

”میں۔۔۔ میں تمہارا یہ احسان کیسے اتار دوں گا۔“ میں نے رونے والے انداز میں کہا

”سعدی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے تم میرا ایک کام کرو گے۔“ سوہانہ نے اٹک اٹک کر جملہ مکمل کیا۔

”بولو سوہانہ۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں؟“ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”سعدی۔ مجھے اپنے مذہب میں داخل کر لو مجھے اپنی بیوی بنا لو۔ بس میں چند لمحوں کی مہمان ہوں۔“

”نہیں سوہانہ۔ ایسا مت کہو۔“ میں رو دیا۔

”جلدی کرو سعدی۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔“ سوہانہ

نے بے قراری سے کہا تو میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ ڈالے اور سوہانہ کو اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھایا اور اسے کلمہ پڑھایا، سوہانہ نے اٹلتے ہوئے کلمہ پڑھا۔

زہر سوہانہ کے رگ رگ میں پھیل چکا تھا جو اسے دھیرے دھیرے موت کے قریب لے جا رہا تھا، سوہانہ کو کلمہ پڑھانے کے بعد میں نے سوہانہ کو اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ ”میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر تمام لوگوں کی موجودگی میں تمہیں یعنی سوہانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں۔“

میری بات سن کر سوہانہ کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ آئی، اس کے ہونٹ نیم والہ انداز میں کھلے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی یا میرا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر موت کے فرشتے

نے اسے مہلت نہیں دی اور اس کی گردن ایک جانب ڈھٹک گئی، اس کی بدلتی آنکھوں میں میرے لئے شکر کے جذبات تھے وہ بے جان ہو کر میری ہانپوں میں جھول گئی

میرے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے اور میں زار زار رونے لگا میں روتا رہا کچھ دیر بعد مبارانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”یہ مر چکی ہے سعدی۔“ مبارانی نے مجھے سوہانہ سے الگ کرنا چاہا۔

”دور ہو جاؤ تم سب۔“ میں نے مبارانی کا ہاتھ زور

سے جھٹکا۔ ”تم لوگوں نے من لیا ہے نا کہ سوہانہ مسلمان ہو گئی تھی اور وہ میری بیوی بن چکی تھی لہذا اب تم لوگوں کا سوہانہ پر کوئی حق نہیں ہے، میں اپنے مذہب کے حساب سے اس کی آخری رسومات ادا کروں گا۔“

میں نے اتنا کہہ کر سوہانہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور جھوپڑی سے باہر آ گیا، میں سوہانہ کو لے کر میدان کے وسعت میں آیا۔ تمام قبیلے والے سوہانہ کی موت پر آنسو بہا رہے تھے، عورتیں باقاعدہ بین کر رہی تھیں۔ میں نے سوہانہ کا لاشہ میدان کے ایک کونے میں رکھا اور وضو کر کے اکیلے ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی اور قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر قبر کھودی اور آنسوؤں کے ساتھ سوہانہ کو دفنایا اور اس کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔

”وہ تم سے بہت محبت کرتی تھی۔ کاش وہ عام لڑکی ہوتی تو میں خود اس کی شادی تمہارے ساتھ کر دیتی۔ مگر افسوس۔۔۔ اس نے اپنی زندگی دے کر تمہاری زندگی بچائی۔“ جب میں ڈونگا قبیلے سے رخصت ہو رہا تھا تو مبارانی نے آخری الفاظ کہے۔

میں بو جھل دل کے ساتھ شہر آ گیا اور چند دن کے بعد میں اپنے ملک واپس پہنچ گیا، ایئر پورٹ پر اشفاق مجھے ریسیو کرنے آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھ رہا ہوں ورنہ میرے علم کے مطابق تمہارا زندہ آنا ممکن نہیں تھا، شکر ہے میرا حساب غلط نکلا۔۔۔“ اشفاق نے خوشی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا حساب غلط نہیں تھا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”کیا مطلب۔“

”یہ تو جسم ہے جو واپس آ گیا مگر میری روح ڈونگا قبیلے میں بنی ایک قبر کے سرہانے بیٹھی ہے۔“ میں نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اشفاق کو حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔





دلہن کی روح

احسان سحر - میانوالی

اجانک ایک کریبہ اور خوفناک چیخ بلند ہوئی تو کھری نیند میں سویا ہوا نوجوان اٹھ بیٹھا اور اس کی نظر حب ساسے دیوار پر پڑی تو وہ دہشت سے دو چار ہو کر اپنے حواس کھو بیٹھا اور پھر

رات کے سنائے میں خوف و ہراس پھیلاتی حقیقت سے قریب تر دماغ کو مہموت کرتی کہانی

کی رہائش کا بندوبست تھا، ہمارے لئے دو میڈروم تھے، ایک نسبتاً بڑا میڈروم تھا، جس میں تین ڈبل بیڈ لگے ہوئے تھے، اس کے ساتھ کا میڈروم چھوٹا تھا، وہاں دو سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے، ان کمروں کے باہر چھوٹی سی جگہ تھی، یہاں سے پانچ پانچ میٹر عیاں اوپر جاتی تھیں۔ اوپر حال میں شاندار میوزک سسٹم اور سنگل اریج منٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہال کے سامنے بڑے بڑے سلائیڈ ٹنگ ڈورز

ہم چند دوست جب ایف ایس سی کے فائنل انگیزام سے فارغ ہوئے تو سیر کے لئے مری جانے کا پروگرام بنایا، ابتداء میں گھر والوں نے باز رکھنے کی کوشش کی مگر بعد میں ہماری ضد کے آگے جھک گئے، ان کی بے پناہ نصیحتوں اور ہدایتوں کے ساتھ ساتھ ہم سب دوست مری کے لئے روانہ ہوئے، جب مری پہنچے تو ابو کے ایک دوست کے آفس کے اوپر بنے آفیشل ریسٹ ہاؤس میں ہم سب

Dar Digest 29 May 2015

تھے یعنی ایک طرف ہال میں دیواریں نہ تھیں بڑے بڑے
 شیشے لگے تھے، اور شیشوں کے دوسری طرف چھت تھی،
 بہت بڑی سی، شام کو ہم وہ سلائیڈنگ ڈورز بنا کر چھت پر
 بیٹھ گئے۔ بہت اچھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اونچی آواز
 میں ڈیگ سننے کا مزہ آ گیا، حسن کچن سے چائے بنا لایا، ہم
 پانچوں نے کچھ دیر تو عمر کا انتظار کیا لیکن پھر نوید اسے بلانے
 کے لئے چلا گیا اور آ کر کہا کہ وہ نہار ہا ہے ہم سب چائے
 پینے لگے، میوزیک سننے باتیں کرنے میں خیال ہی نہ رہا
 کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ جب سوا گھنٹہ گزر گیا تو اچانک
 نوید بولا۔ ”یار عمر نہیں آیا۔“

میں اٹھ کر نیچے گیا۔ اسے آواز دی تو غسل خانے
 سے مغالطات کا سیلاب اٹھنے لگا، مجھے پہلے تو کچھ سمجھ نہ
 آئی، پھر احساس ہوا کہ وہ چلا رہا ہے، کسی نے شرارت سے
 ہاتھ روم کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میں نے فوری طور پر
 دروازے کا تاب گھمایا، دروازہ کھل گیا، باہر آتے ہی وہ چیخا۔
 ”ایک گھنٹے سے جیج رہا ہوں، حد ہو گئی۔“

”سوری یار ہم باہر تھے، چھت پر ڈیگ بھی بلند
 آواز میں بیچ رہا تھا، ہم نے سوچا شاید اتنے خوب صورت
 ہاتھ مپ سے نکلنے کا تیرا دل نہیں کر رہا۔“ وہ سنی ان سنی
 کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کنڈی کس نے لگائی تھی
 باہر کی؟“

اب سب چپ مرچپ چاپ نوید کو کھینچ رہا تھا، نوید
 قسمیں کھانے لگا کہ وہ اسے بلانے ضرور گیا تھا پر کنڈی لگا
 کر نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے دونوں کو سمجھا بچھا کر ٹھنڈا کیا،
 عمر کا سوڈ بڑی دیر بعد بحال ہوا۔ سفر کی تھکان تھی سب نے
 کھانا کھا کر آرام کو ہی ترجیح دی۔ ویسے بھی مری کے
 دوستوں سے اگلے روز ملاقات ہونا تھی اور پھر پروگرام طے
 کرنا تھے، میں رات کے کپڑے تبدیل کر کے غسل خانے
 میں گیا تو دروازہ غالباً بند تھا اندر سے، میں بے خیالی میں
 آ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری کہ عمر کہنے لگا۔
 ”آ کر لیٹ بھی جا، لیٹ کر ٹی وی دیکھ لے۔“

میں اٹھا اور ہاتھ روم کا دروازہ کھولا، وہ ہنوز بند تھا۔
 میں نے ہینڈل کو گھماتے ہوئے دستک دی، اندر سے کوئی

جواب نہ آیا۔ وہ بارہ دستک دی تب بھی خاموشی، حسن اور عمر
 اکٹھے ہوئے۔ ”کیا ہوا...؟“
 ”کچھ نہیں، دروازہ کافی دیر سے بند ہے، میں نے
 زور سے ہینڈل گھماتے ہوئے کہا۔“ اور اندر کوئی ہے تو بول
 نہیں رہا۔

”یار چلو اب ختم کرو بحث کو غسل خانے کو بھی چٹ
 گئے دونوں۔“ نوید بڑبڑایا۔

میں بھی آ کر لیٹ گیا۔ آدھے پونے گھنٹے میں
 شاید سب ہی سو گئے ہوں گے مگر مجھے عجیب سی بے چینی
 تھی، جیسے نئی جگہ کا نیا پن اور تھکاوٹ کی وجہ جان کر کروٹیں
 بدلتا رہا، اچانک مجھے ایسا لگا جیسے ہاتھ روم سے کوئی نکلا ہو۔
 میں نے سر اونچا کر کے ادھر دیکھا۔ نوید، عمر اور حسن سب
 گہری نیند میں تھے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا، میں اسے
 اپنا وہم قرار دے کر سونے کی کوشش کرنے لگا، میں سونا چاہتا
 تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے
 پیاس کا احساس ہوا، پھر ایسا لگنے لگا کہ پیاس کی شدت سے
 حلق خشک ہونے لگا ہے۔

مجھے لیٹے لیٹے خیال آیا کہ پانی کی بوتل میرے
 بیک کے پاس ہی پڑی تھی۔ میں اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر بوتل
 اٹھانے لگا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ نوید کے پاؤں کے پاس
 کوئی گھنٹوں میں سروے کر بیٹھا تھا، سیاہ، تاریک، مجسم ٹکینو
 باڈی کی آؤٹ لائن قدرے واضح تھی، میں آنکھیں پھاڑ
 پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت، مجھے ہاتھ
 پاؤں سرو محسوس ہونے لگے، اگلے ہی لمحے میں وہ ٹکینو
 غائب ہو گیا۔

میں اب بھی آنکھیں پھاڑے نوید کی پانکٹی کی
 سمت دیکھ رہا تھا۔ پر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔
 میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر نامعلوم کب
 آنکھ لگ گئی۔

میں دن چڑھے تک سوتا رہا، زور سے بولنے پر
 میری آنکھ کھل گئی، میں نے اٹھ کر مندی مندی آنکھوں
 سے دیکھا، سارے کمرے میں ہم لوگوں کا سامان پھیلا ہوا
 تھا۔ سب کے بیک اوندھے پڑے تھے۔ میں ماتھے سے

بال ہٹاتا جمائیاں لیتا اٹھا اور بولا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“
 عمر بولا۔ ”یہی بات تو ہم سب کر رہے ہیں کہ یہ
 کس کی شرارت ہے؟“ سارا سامان کس ہو گیا۔

نوید بولا۔ ”یار ادھر کہیں جن بھوت تو نہیں؟“
 یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔ مجھے باتھ روم جاتے ہوئے رات
 کی یاد آئی، میں ایک لمحے رکا کہ وہ رات کو نوید کی پانکٹی کے
 پاس... پھر سوچا، خاموشی ہی رہوں ہو سکتا ہے وہ میرا ہم
 ہو اور یہ سب ڈر گئے تو سارا مزہ کر کر اہو جائے گا، حسن جو
 کافی دیر سے اٹھا ہوا تھا، آہستہ سے بولا۔

”یار جو ہوا سو ہوا، اگر یہ کسی کی شرارت ہے تو بہت
 ہی واہیات شرارت ہے۔ اب گھومنے پھرنے کا وقت
 چیزیں درست کرنے میں لگ جائے گا، ہم سیر و تفریح کے
 لئے آئے ہیں نا کہ ٹینشن دینے اور لینے، جس کسی نے بھی
 کیا ہے پلیز دوبارہ نہ کرے۔“

وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ ”احسان تو باتھ روم
 سے ہو کر آ پھر سب مل کر چیزیں درست کریں گے۔“ پہلے
 میں چونکدار کو بلا کر ناشتے کا کہتا ہوں۔ فصیح بھائی کو اب بے کا
 نام دیا ہے اچھا نہیں لگتا کہ ہم لوگ لیٹ ہوں، ابھی سب
 کے تیار ہونے میں وقت لگے گا۔“

حسن ڈیڑھ دو سال ہم سے بڑا تھا۔ معاملہ فہم بھی
 تھا۔ اکثر چھوٹی موٹی بکڑی صورت حال کو وہ ایسے ہی سنبھال
 لیتا تھا۔ جتنی دیر میں ناشتہ بنا ہم سب سب کچھ سنبھال کر
 تیار بھی ہو گئے، باقی پورا دن فصیح بھائی کے ساتھ گھومنے
 پھرنے میں گزرا، رات کا کھانا ایک اچھے سے ریسٹورنٹ
 میں کھایا اور رات گئے واپس لوٹے، سب کا موز بے حد
 خوشگوار تھا، ہوا بہت اچھی چل رہی تھی۔ ہم سب اوپر چھت
 پر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ سلائڈنگ ڈورز ہٹائے اور
 ڈیگ آن کر لیا۔

دوسرے روز فصیح بھائی نے اپنے چند دوستوں کے
 ساتھ ہمارا لُنج رکھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ڈیڑھ گھنٹہ گزر
 گیا۔ دن بھر کی تھکن سب پر غالب آنے لگی۔ ایک ایک
 کر کے سب نیچے اترنے لگے۔ میں اور عمر آخر میں اترے،
 سسٹم بند کیا اور سارے دروازے بند کر کے ہم بھی کمرے

میں آ گئے۔ کمرے کی لائیں بند تھیں، ہم خاموشی سے بستر
 پر لیٹ گئے، مجھے سوتے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ نیند
 اچٹ گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی چہل قدمی کر رہا ہو، مجھ پر
 پورے دن کی تھکاوٹ تھی، آنکھیں کھولنے کی بھی ہمت
 نہیں ہو رہی تھی، اتنے میں پھر کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی،
 بالکل میرے پاس اور تھنوں میں ہلکی ہلکی خوشبو بھی آئی،
 پھولوں کی یا کاسٹنکس کی، مگر میں سوتا رہا۔

پھر اچانک نیند میں خیال آیا کہ پھر کوئی لڑکا سامان
 کے ساتھ شرارت تو نہیں کر رہا، ورنہ صبح پھر ہمیں چیزیں
 اکٹھی کرنا پڑیں گی۔ جھنجھلاہٹ میں، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
 تبھی سامنے جو صورت نظر آئی، اسے دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ
 گیا، ایک بے حد خوب صورت لڑکی ولہن کے لباس میں
 سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی، میں نے آنکھیں ملیں پھر دیکھا تو
 وہ ہلکا سا مسکرائی اور اپنے شرارے کو ٹھیک کرنے لگی پورا کمرہ
 اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

میں نے بوکھلا کر حسن عمر کو آواز دینی چاہی پر حلق
 خشک ہو رہا تھا ہاتھ اور پاؤں بے جان، میں ساکت بیٹھا
 تھا، ارد گرد ایک معنی خیزی خاموشی تھی، جیسے سب کچھ ختم کیا
 ہو، پھر اچانک وہ طلسم نوٹ گیا، اب سامنے کاؤچ خالی پڑا
 تھا اور ارد گرد سے حسن عمر اور نوید کے خراٹوں کی آوازیں
 آرہی تھیں۔

”حسن، حسن بات سن یار۔“ میں نے حسن کو
 زور زور سے پکارا۔ اسے نیند بہت پیاری تھی اٹھاتے
 ہوئے بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اٹھتے ہوئے وہ چیخنے نہ
 لگے۔ ”حسن۔۔۔۔۔“ میں وحیرے سے بولا۔ ”تجھے دن کا کئی
 نہیں ہوتا باتیں کرنے کو۔۔۔ ایک نہیں سنوں گا
 تیری۔“ حسن سرخ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ پھر
 دوسری طرف کروٹ لے لی۔

”عمر۔۔۔۔۔ نوید۔۔۔۔۔“ میں نے شانہ ہلایا۔ ”نوید یار
 بات تو سن۔“ وہ دونوں بالکل سیدھے بے سددہ لیٹے
 تھے۔

ان کا اس طرح لیٹنا عجیب سا لگا۔ میں اٹھا فرید اور
 رحمان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ تبھی اچانک باہر

سے کتوں کے غرانے کی آوازیں آنے لگیں، جیسے آٹھ دس کتے اپنے بچوں سے دروازے کھرج رہے ہوں، میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا، دروازہ اندر سے لاک تھا۔ یہ دیکھ کر تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ فرید اور ریحان بھی سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کو بھی عمر اور نوید کی طرح بے سدھ لیٹا دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اب کتوں کے بچوں کی آوازیں باہر کھڑکیوں کے شیشوں پر سے آرہی تھیں، میں تھوک نگلتا کھڑکیوں تک آیا۔ ہلکا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو نہ کتا اور نہ کسی کتے کا نشان، اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم تیسری منزل پر ہیں اور۔۔۔ اور یہ کہ یہاں تو ہمارے علاوہ کوئی نہیں، پھر یہ کتے۔۔۔؟

میں نے جلدی سے موبائل نکال کر چوکیدار کو فون کیا، بتل جا رہی تھی، تا معلوم وہ کیوں اٹھا نہیں رہا تھا۔ میں نے فون کا نمبر دوبارہ ملاتے ہوئے کاؤچ کی طرف دیکھا، کاؤچ اسی طرح خالی پڑا تھا، عجیب صورتحال سے واسطہ پڑا تھا۔ اب ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی، سب بڑے سو رہے تھے، میں پھر بستر پر آکر لیٹ گیا اور بازو کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نظریں کاؤچ کی طرف اٹھ جاتیں۔ مسلسل ملاحول ولاقوۃ پڑھ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک ہلکی سی آواز آئی جیسے دروازہ کھلا ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا اور ایسا لگا جیسے کوئی ہاتھ روم میں گیا ہو۔ میں دم سادھے ہاتھ روم سے نکلتی روشنی کی لکیر کو تک رہا تھا۔ جو ہلکا سا دروازہ کھلا رہ جانے سے باہر آرہی تھی۔ بھی کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی، میں نے چونک کر نظریں پھرائیں، کوئی اب ہاتھ روم کے دروازے پر کھڑا تھا، سرخ ہینکے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔

”احسن، احسن۔۔۔ عمر۔۔۔ نوید۔۔۔“ میں نے پکارنا شروع کیا مگر میرا پکارنا بے سود تھا، وہ سب سکون سے ایسے سوئے ہوئے تھے جیسے بے ہوش پڑے ہوں، ہاتھ روم کا دروازہ خالی تھا۔ اور دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اپنے بید کے ساتھ لیپ روشن کئے آلتی پالتی مارکر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے اتنی بار تو ہم نہیں ہو سکتا اور اس چوکیدار کی بھی خبر لوں گا جو فون

نہیں اٹھا رہا تھا۔ یقیناً یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ صبح ناشتے پر ان سب سے بات کروں گا، خود سے باتیں کرتے ہوئے میں آیت الکرسی اور چارفل پڑھ کر سو گیا۔

اچانک میری آنکھ ایک ہولادینے والی چیخ سے کھل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمر درو کی وجہ سے بید سے نیچے پڑا چیخ رہا تھا۔ نوید اور حسن ویسے ہی بے خبر سو رہے تھے۔ عمر کی چیخوں کے درمیان ایک اونچا نسوانی قہقہہ گونجا۔ میں نے بے ساختہ کاؤچ کی طرف نظر ڈالی، اب وہ وہیں اپنے ہاتھوں میں اپنا سر تھاٹھے اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی اور اس کی گردن سے بھل بھل کر مٹا خون پورے فرش کو رنگین کر رہا تھا۔

میں نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ میں نے عمر کو اٹھا کر بید پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی آیت الکرسی پڑھو، وہ سامنے دیکھ رہے ہو کاؤچ پر۔۔۔؟“

”کاؤچ پر۔۔۔“ عمر نے حیرت سے کہا۔ ”کاؤچ تو خالی پڑا ہے۔ پر یہ منے کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔۔۔؟“ میں نے سوچ پر ہاتھ مار کر روشنی کر دی، عمر کا رنگ کسی مردے کی طرح سفید پڑ گیا۔ ”حسن۔۔۔ حسن جلدی اٹھ جا۔“

خلاف توقع وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہیں کے قہقہوں اور عمر کی چیخوں کے درمیان اس کی گھٹکیا کی ہوئی آواز آئی۔ ”یہ کیا ہے؟“

اتنے میں کاؤچ کے ساتھ ٹیبل پر پڑی پانی کی بوتل لہراتی نوید کے سر پر ہوا میں الٹی معلق ہو گئی، سارا پانی اس کے سر پر گرا تھا اور وہ بے خبر پڑا تھا پھر ہنستی ہوئی وہیں کے قہقہے بند ہو گئے اور اس نے ایک زوردار چیخ ماری پھر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھاٹھے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت اور خوف اور لبو سے سرخ ہوتا ہوا فرش، پتہ نہیں میں بے ہوش کیوں نہیں ہوا تھا۔ حسن سامنے بیٹھا مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے گلاس میں پانی ڈال کر خود بھی پیا اور مجھے بھی دیا۔ ”یہ بور یا بستر اٹھاؤ۔ اور یہ فرید اور ریحان کو بھی اٹھاؤ۔ اتنے

قیامت کا شور مچا ہے اور وہ پڑے سو رہے ہیں۔ ”وہ بولا۔

ان دونوں کو اٹھا کر سارا حال بتایا تو ان کے چہرے بھی فٹ پڑ گئے۔ ریحان تھوڑی دیر بعد گھبرا کر بولا۔ ”جج بتاؤ، تم لوگ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے۔۔۔؟“ میں، حسن اور عمر ایک دوسرے کا منہ تکتے گئے۔ حسن کہنے لگا۔ ”وہ دیکھو تو یہ صاحب سوتے رہے اور باقی منہ بھی دھلا گئیں۔“

نوید گیلے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سب نے ڈرتے ڈرتے بینڈ کی طرف دیکھا، تکیہ اور چادر ابھی تک گیلے تھے، میں نے ریحان سے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں تم لوگوں کے ہاتھ روم میں، اس ہاتھ روم میں کوئی بھول کر بھی نہ جائے۔“ میں نے اپنے ہاتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر میرے حواس اوسنے، جو کیدار اب بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

”ذرا نیچے جا کر اس کو تو جھاز پلاؤں“ میں نے نیچے جانے والا واحد دروازہ کھولا وہ لاک تھا، لفٹ کا دروازہ اس کے ساتھ تھا، پر اپنا دروازہ کھلتا تو لفٹ تنگ جاتا، دور سے کتوں کی آوازیں پھر آنے لگیں۔ ریحان۔۔۔۔۔ ”حسن ذرا ادھر آنا دروازہ نہیں کھل رہا۔۔۔۔۔“ میں نے سب کو آواز دی۔ وہ سب اٹھ کر میری طرف چلے آئے، سب نے باری باری دروازے کے ساتھ زور آزمائی کی، پر اس کو نہ کھلنا تھا وہ نہ کھلا، یہ سب جان کر ہم اوپر کی منزل پر ہیں اور نیچے جانے والا واحد دروازہ لاک ہے، ہم سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ کمر کیوں پر پھر کتوں کے پنجوں کی آوازیں آنے لگیں

”یہاں کتنا کہاں سے آ گیا۔۔۔؟“ عمر نے کہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

”یار احسان تم اپنے ابو کو فون کرو، ان سے اٹکل کا نمبر لو، جن کی یہ بلڈنگ اور آفس ہے۔“

”ان کا نمبر تو میرے پاس ہے، پر انہیں کل شام ابو نے ہی جانا تھا اور میں ابو کو فون نہیں کر رہا، وقت دیکھو پونے تین بج رہے ہیں رات کے، وہ ڈانٹیں گے، ذرا حوصلہ کرو، کرتے ہیں کچھ۔“

”چلو نصیح بھائی کو فون کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور موبائل سے نصیح کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کو کال سے

لگا لیا، ان کا نمبر ملایا اور انہیں بڑی مشکل سے قائل کیا ورنہ پہلے وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں، ان سے ریکوریسٹ کی کہ ”وہ یہاں پہنچ کر اوپر آئیں۔“

عمر کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ عمر کے بعد ریحان تھا جو بہت زیادہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اسے دو قدم چلنا دو بھر تھا، صبح بھائی سے بات کر کے تسلی ہوئی، دروازہ اسی طرح لاک تھا، ہم نے فیصلہ کیا کہ اس کمرے میں نہیں بیٹھیں گے، سب اوپر چھت پر چلتے ہیں۔ شاید کسی پڑوس والے کی مدد مل جائے۔

ہم سب اکٹھے ہال میں آئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہال کی بتیاں روشن تھیں، حالاں کہ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں ساری بتیاں بند کر کے باہر نکلا تھا۔ سلائیڈنگ ڈورز کھولے، ہر طرف عجیب وحشت ناک سناٹا تھا، ارد گرد اتنی اونچی کوئی بلڈنگ نہ تھی، اور جو تھیں وہ بہت نیچے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں، میں چھت کے کنارے تک آیا، جھکی سلائیڈنگ ڈور ایک ہولناک آواز کے ساتھ بند ہو گیا، میں ایک جست میں دروازے تک پہنچا اور پوری قوت لگا کر دروازہ کھولا مگر وہ بہت آرام سے کھل گیا، مجھے ٹھنڈے پسینے کی لکیریں اپنی ایزبوں تک محسوس ہوئیں، پھر ایسا لگنے لگا کہ چھت پر کسی نے وحشی کتوں کو کھول دیا ہو، ہر طرف سے خوفناک غراہنوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جس میں کبھی کبھی چوڑیوں کی کھنک اور ہلکی نسوانی ہنسی بھی شامل ہو جاتی۔

سب ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے آیت الکرسی پڑھ رہے تھے، حلق خشک تھے اور خوف سے زبان بار بار اٹھ رہی تھی، حسن نے کہا۔ ”پوچھو تو کسی نصیح بھائی کہاں تک پہنچے ہیں۔۔۔؟“ نصیح بھائی نے موبائل پر بتایا تھا۔ ”بس آ رہا ہوں، کچھ دیر میں ہم لوگ پہنچ رہے ہیں، میرے دوست بھی ساتھ ہیں، تم لوگ فکر مت کرو۔“ عمر اور ریحان کو تھوڑی دیر بعد غش آ جاتا تھا، ہم سب دعائیں بھی پڑھ رہے تھے، اور ان دونوں کو سنبھال بھی رہے تھے۔

خدا خدا کر کے 20 منٹ بعد نصیح بھائی کی کال آئی کہ وہ نیچے پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے سوئے ہوئے

چوکیدار کو اٹھایا۔ اسے چابی لانے کو کہا پھر بقول ان کے چابی لگانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ دروازہ تو آدھا کھلا ہوا تھا ہم کیا کہہ سکتے تھے سوائے ایک دوسرے کا منہ ٹکٹنے کے، چوکیدار کو مختصر سارے حالات بتاتے، وہ بظاہر حیرت کا اظہار کرنے لگا، اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ بظاہر کچھ نہ کچھ جانتا ضرور ہے۔

فصح بھائی کے زور دینے پر بولا۔ ”لڑکے سیر و تفریح کو آئے ہیں، آپس میں مستی کرتے ہوں گے۔“
ریحان نے چوکیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں مہمان نہ ہوتے تو تجھے مزہ چکھاتا، خیر مزہ تو تم اب بھی چکھ لو گے جب تمہارے مالکوں کو بتائیں گے کہ تم رات بھر سوتے رہتے ہو۔“ چوکیدار چپ کر کے کھڑا ہوا۔

یہ طے ہوا کہ پانچ تو بچنے کو ہے، جیسے تیسے دو ڈھائی گھنٹے گزار کے ابو کے اٹھنے کا انتظار کیا جائے اور ان سے آگے کا پوچھیں گے، فصح بھائی نے بہت کہا کہ ان کے فلیٹ پر چلیں، پر ان کے گھر پہلے بھی مہمان رہے تھے، ہمیں منہ اٹھا کر ان کی طرف جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ چوکیدار نے آفس کھول دیا تھا۔ فصح بھائی کے ساتھ جا کر حسن باہر سے جوس ڈھونڈ لایا تھا۔ سب نے پیا تو ذرا حواس بحال ہوئے۔

ہم واپس اسلام آباد آئے تو ابو نے بتایا کہ ”میری رضا سے بات ہوئی تھی“ اس نے بتایا تھا کہ ”سات آٹھ برس قبل وہاں کسی دلہن کا قتل ہوا تھا۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ ”کیا واقعی؟“

”ہاں۔“ اس نے بتایا تھا کہ ”اس کے دوست بحرین سے آئے تھے، وہ اسی حصے میں مہمان ٹھہرے تھے، ان میں سے ایک لڑکے کی شادی ہوئی تھی، وہ اپنی دلہن کو لے کر ادھر ہی آ گیا۔“ ما معلوم کیا قصہ ہوا، زیادہ تفصیلات معلوم نہیں پر یہ پتہ ہے کہ پہلی رات ہی دلہن کا قتل ہو گیا تھا۔ ان لڑکوں پر پولیس کیس بھی بنا تھا۔ پھر بعد ازاں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دراصل، اصل بات دہادی گئی تھی، رضا کا کہنا ہے کہ ”ہو سکتا ہے آپ کے بیٹے اور دوستوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی سلسلے کی کڑی ہو۔“

میں دم بخود ابو کی بات سن رہا تھا۔ اس نو عمر لڑکی کے ماتھے پر جڑا چکا اور گردن سے ابلتا ہوا خون۔ اف نہ جانے بے چاری کے ساتھ کیا ہوتی ہوگی اس کی روح اب تک بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میں اور ابو افسوس کرتے رہے، ابو یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ”کب، کس کے ساتھ کیا پیش آ جائے؟ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

قصہ ختم ہونے سے پہلے امی کی بھی سن لیں۔ میں نے ان کی پریشانی کے خیال سے ان سے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے لوٹے تیسرا روز تھا۔ میں ان کے کمرے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آ لیڈنا، مجھے آئے آج تیسرا روز تھا وہ کچھ سلائی کر رہی تھیں، مجھ سے کہنے لگیں۔

”مری میں سب ٹھیک تو رہا تھا.....؟“

”جی..... امی.....“ میں نے آنکھیں چرااتے ہوئے کہا۔

کہنے لگیں۔ ”وہ جس روز صبح پونے آٹھ بجے تم نے فون کیا تھا اپنے ابو کو، میں اس رات بہت پریشان تھی، میں نے بہت عجیب سا خواب دیکھا تھا کہ جیسے رات کا وقت ہے اور ایک ویران سی عمارت ہے، بہت اونچی، بہت سنیان، دھندلے، بڑے بڑے شیشوں والی..... اور..... اور جیسے وہ جگہ اس عمارت کی چھت ہے، اس کے سامنے والے حصے میں ذرا نیچے کسی کے بیٹھے ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سوائے کتوں کے غرانے کے..... اور پھر جس خوف سے میری آنکھ کھلی۔ وہ یہ کہ مجھے لگا جیسے خدا انخواستہ تم اس بلڈنگ میں ہو۔ اوہ خدایا..... ذراؤنا خواب تھا۔ میں انھی تو خوف سے خلق خشک ہو رہا تھا۔ بمشکل تین مرتبہ لاحول والا قوۃ پڑھی۔ ذرا حواس قائم ہوئے تو تم پر دعا پڑ کر دور سے پھونکی.....“

”واقعی امی..... ماں ماں ہوتی ہے۔ بچے کی ہر پریشانی کا اسے قبل از وقت اندازہ ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کی ماؤں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین.....“ میں نے کہا۔





موت کا تحفہ

مدرسہ بخاری - شہر سلطان

کیا یہ حقیقت ہے کہ کسی کو کسی کی موت کی خبر قبل از وقت ہو جاتی ہے اور پھر وہ ببانگ دہل اعلان کر دیتا ہے کہ مرنے والا فلاں وقت مرجائے گا، کھانی میں حقیقت پنہاں ہے اور ایسا ممکن ہے؟

خوفناک کہانیوں کے مستلاحی لوگوں کے لئے دل دہلائی عجیب و غریب سٹاٹر کہانی

پناہ محبت کی وجہ سے آپریشنز کے شعبے میں پروموت ہوئی۔ لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی۔ اسے مزید ترقی کرنی تھی۔ اپنی بے پناہ محنت، قابلیت اور اعلیٰ کیوٹی کیشن کی اوصاف پر وہ جلد ہی مین برانچ کی منیجر مقرر ہو گئی۔

وہ دن اس کی کامیابی کا سنہرا دن تھا۔ سارے اسٹاف نے اسے گفٹ دیے اور پھول پیش کئے اور ساتھ ہی ڈیئر ساری مبارکباد بھی۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ماہم ڈیپوک یا کمزور دل کی مالک تھی اور نہ ہی اس کی فیلڈ کا کسی بھی لحاظ سے خوفناک قسم کی چیزوں سے تعلق تھا۔ وہ ایک بینک میں برانچ منیجر کے عہدے پر فائز تھی۔ بینکنگ اینڈ فنانس میں ایم بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے اپنی فیلڈ کو ترجیح دی اور میرٹ کی بنیاد پر آر بی او بھرتی ہوئی۔ بہت جلد اس نے بینکنگ کو اچھی طرح سمجھنا شروع کر دیا، بے

Dar Digest 35 May 2015

وہ دن کچھ اس لئے بھی یادگار بن گیا کہ وہ اس کی پیدائش کا دن بھی تھا۔ اس طرح خوشیوں کے ذیل مزے میسر آ گئے۔

وہ بہت خوش تھی اس دن، اسی خوشی میں اس نے گھر پر تمام اشاف اور چند ایک سہیلیوں کو بھی مدعو کیا..... وہ شاندار پروقار مگر سادہ سی تقریب تھی۔

رات آٹھ بجے تک کاٹا گیا تھا۔ شاہی بریانی اور منمن کے ساتھ کھیر کا پر لطف انتظام بھی کیا تھا..... رات دس بجے تک گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔ وہ ملازمہ صنف کے ساتھ گفٹ اٹھوا کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا کمراد دوسری منزل پر تھا۔ سادہ کمر مگر صاف ستھرا۔ سنگل بیڈ، کونے میں رکھی سنگھار میز سب سے نمایاں تھی۔ اس کی سنگھار میز پر دنیا کے مہنگے پر فوم موجود تھے۔ یہ اس کا واحد شوق تھا جس پر کپڑا مارتا اسے پسند نہ تھا۔

ماہم نے سارے گفٹ پیکٹ بیڈ پر رکھے۔ کچھ پیکٹ ملازم نے اٹھا رکھے تھے۔ ”یہاں رکھو۔ اور ایک کپ چائے بنا لاؤ.....“

ماہم نے ملازمہ سے کہا..... اور خود واش روم میں تھس گئی۔ کپڑے بدلنے کے بعد وہ بیڈ پر آ بیٹھی، اتنی دیر تک ملازمہ چائے بنا کر لے آئی.....!

”ٹھیک ہے۔“ چوکیدار سے کہو کہ گیٹ بند کر دے اور پھر سو جاؤ.....“ ماہم نے ہدایت دی۔

”بی بی جی.....“ ملازمہ نے کہا اور واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ماہم نے ایک ایک کر کے تمام گفٹس کھول لئے۔ اس کے قریبی دوستوں نے اسے بہترین پر فوم گفٹ کئے تھے۔ کچھ دوست پسند کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ سارے گفٹ کھول لئے گئے مگر صرف ایک گفٹ باقی رہ گیا تھا۔ نجانے کیوں اس گفٹ کو کھولتے ہوئے اس کا دل خوف سے بہت تیز دھڑکنے لگا تھا.....

جونہی اس نے گفٹ کھولا..... سنگھار میز پر رکھے

سارے پر فوم ایک ساتھ ہی فرش پر آ گرے تھے۔ اس نے اپنے کمرے سے قالین کچھ دن پہلے ہی نکال باہر کی تھی، اگر قالین ہوتی تو کچھ بچت ہو جاتی، مگر شیشے کے بنے پر فوم بوتل سنگ مرمر کے فرش پر گرے ہی ٹوٹ گئے تھے۔

وہ فوراً بیڈ سے اٹھی اور کرجی کر چلی ہوئے بوتلوں کو ایک ٹک دیکھنے لگی۔ مخلول فرش پر پھیل گیا تھا۔ یہ سب اچانک ہوا تھا۔ اسی لمحے لائٹ بھی چلی گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد یو پی ایس چلنے کا انتظار کیا مگر لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے یو پی ایس بھی چارج نہ ہوا تھا پھر وہ گھپ اندھیرے میں بیٹھی اس اچانک افتاد کے بارے میں سوچ رہی تھی..... آج وہ پہلی دفعہ خوف محسوس کر رہی تھی، ایک انجانے خوف، جو روٹنے کھڑے کر دیتا ہے، دماغ پر چھائے سارے اندوہناک خدشے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر کی مانند لمحہ سہرایت کرنے لگے۔

اس نے موبائل کی ٹارچ آن کی تو آنکھوں کو چیزیں بھائی دینے لگیں۔ وہ بیڈ پر ہی دبکی بیٹھی تھی۔ نیچے فرش پر شیشے کے تیز دھار ٹکڑے پڑے تھے، اگر وہ نیچے اترتی تو پاؤں زخمی ہو جانے کے چانسز تھے۔ اس نے پورے کمرے کا جائزہ لیا، ہر چیز جوں کی توں تھی، مگر وہ آخری گفٹ پیک بیڈ سے غائب تھا، وہ خوف سے اچھل پڑی۔ اس نے ٹارچ سے بیڈ کی ہر جگہ پر روشنی کی، مگر وہ گفٹ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ ”یہ کیسے ممکن تھا کہ گفٹ پیک خود بخود گم ہو گیا ہو؟ کم تو ہو سکتا ہے مگر سامنے رکھی ہوئی چیز غائب کیسے ہو سکتی تھی.....؟“

یہ کیسے ممکن تھا..... کہ گفٹ اوپن کرتے ہوئے اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا تھا اسے ایسا لگا تھا، جیسے وہ کسی اینیم بم کو اٹھائے بیٹھی ہو، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ اور جونہی اس نے کھولنے کی کوشش کی ادھر ایک جھٹکا لگا تھا اور اس کے سارے من پسند پر فوم فرش پر اتنی زور سے گرے تھے کہ کرجی کر چلی ہو گئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ پسینے سے بھگ گئی ہو۔ حالانکہ سردیوں کا ٹھنڈا موسم تھا..... مگر اس چھوٹے سے واقعے نے اسے

خوف کے اندھے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کچھ لمبے تک وہ خاموش اور خالی الذہن کے ساتھ تنہا ہی اندھیرے کمرے میں بیٹھی رہی۔ مگر پھر بیڈ کی دوسری طرف اتر کر باہر نکل آئی۔۔۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ نارنج کی روشنی میں تیریں کر اس ہوتی گراؤنڈ فلور پر آگئی۔۔۔ اس کا رخ صفیہ کے کمرے کی طرف تھا۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح نکھری نکھری سی تھی۔ وہ صبح اپنے مقررہ وقت پر اٹھ گئی تھی۔ اس نے خالی سنگھار میز کو دیکھا جہاں اس کے مہنگے پرفیوم رکھے ہوئے تھے۔ مگر پچھلی رات سارے ہی فنا ہو گئے تھے۔ اسے افسوس تھا کیونکہ وہ پرفیوم بہت سوں کی یاد دلاتے تھے۔ اپنوں کی یاد تو بنا گفٹ کے بھی آ جاتی تھی مگر یہ اس کا شوق تھا۔ اور جب شوق کے راستے میں کوئی آئے تو تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے پرفیوم اس لمحے والدہ، والدہ اور بہن نے مختلف مواقع پر گفٹ کئے تھے۔ یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ ایک حادثے میں اس کے قینوں رشتے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے تھے۔ گو کہ اس حادثے میں وہ خود بھی شامل تھی، مگر خدا نے اسے زندگی دی تھی۔ آج بھی وہ اس خوفناک حادثے کو بھول نہ پائی تھی۔ لیکن اس حادثے نے اسے بہادر بنا دیا تھا۔ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ خودکشی کرنا چاہتے ہیں، ایسے حادثے کے بعد، مگر اس نے اپنے ابو کے سارے خواب پورے کرنے تھے۔ تبھی اس کا اسرار شب لگا۔ یوں وہ سرکاری تحویل میں آگئی۔ یونیورسٹی کے فوراً بعد ہی جاب آفر ہو گئی۔ یوں بینک نے اس کو نہ صرف پرنٹیشن وی بلکہ زندگی کو اچھے طریقے سے آگے بڑھانے کا حوصلہ بھی دیا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا نہ آیا تھا جو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا وعدہ کرتا۔۔۔۔۔ حالاں کہ برائے میں ایک شخص اس کے بہت قریب تھا مگر وہ با کردار لڑکی کچھ وقت چاہتی تھی کوئی ایسا جو صرف اسے ہی چاہتا۔۔۔ مگر فی الحال اس نے اس معاملے کو زیادہ سوچا ہی نہ تھا۔

اس نے رات کو صفیہ کو جگا کے روم کی صفائی

کرانی تھی۔ وہ فریش ہو کر ڈریس اپ ہونے لگی۔ اچھی طرح تیار ہو جانے کے بعد وہ کھانے کی ٹیبل پر آ بیٹھی تھی۔ صفیہ نے ناشتہ لگا دیا تھا۔

اس نے سلائس پر جیم لگائی تھی کہ یکا یک جیم اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور فرش پر جاگری۔ شیشے سے بنا جیم گلاس فرش پر بکھر گیا۔

”اوہو۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آج۔۔۔!“ وہ

بڑبڑائی۔

اس نے صفیہ کو آواز لگائی۔۔۔ جلد ہی فرش صاف ہو گیا۔

اس نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور پورچ میں آگئی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

صبح اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ رات ایک گفٹ بغیر کھلے کہیں کھو گیا تھا۔۔۔ ایک بھس سا تھا اس کے دماغ میں۔۔۔ کیا ہو سکتا تھا۔۔۔! ایک بات یہ کہ اس کا دل کیوں دھڑکا تھا۔ خوفناک انداز میں کیوں اس کو پسینہ آ گیا تھا اور جسم کا پٹنے لگا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں ڈرا بیو کرتی ہوئی سڑک کے سپاٹ سینے پر جا رہی تھی کہ اس کا ہاتھ بہکا اور گاڑی کا کنٹرول ایک لمحے کو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اسپید بکنی نہ کرتی اور کیڑ بڈلنے کے ساتھ ہینڈل کو سیدھی نہ رکھتی تو خوفناک حادثہ پیش آ جاتا۔۔۔ خوفناک حادثے سے وہ بال بال بچی تھی! مگر چند میٹر کے فاصلے پر جا کر اس کا ٹائر پنچر ہو گیا تھا۔۔۔! اس نے گاڑی سائیڈ پر کھڑی کی۔ ٹیکسی لی اور براؤنچ پہنچ گئی۔

پھر شام میں وہ ٹیکسی سے ہی واپس آئی تھی۔ اس کا چوکیدار گاڑی ٹھیک کروا کے گھر لے آیا تھا۔

اس کا مصروفیات سے بھرپور دن تھا کہ دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ سیدھی اپنے روم میں گئی۔ فریش ہو کر کھانا کھایا اور ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ صفیہ نے سارے دن کا احوال سنایا جو کچھ عجیب سا تھا۔۔۔

”بی بی۔۔۔ آج دو بجے کے قریب ایک آدمی آیا۔ آپ کا نام لیا اور ایک پکٹ دے گیا، وہ جی کافی

نے اپنے آپ کو جو نیاں کاٹ کے چیک کیا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ.....! لیکن وہ ابھی زندہ تھی..... صفیہ بھی جاگ گئی تھی۔

”کیا ہوائی بی جی؟“

”کچھ نہیں..... بس خواب میں ڈر گئی.....“ وہ

بولی۔

صفیہ پانی لے آئی..... اس نے پانی پیا..... کچھ حوصلے بحال ہوئے..... صفیہ اس کے ساتھ بیٹھی رہی..... اور وہ کچھ سوچتے ہوئے بیڈ پر سے اتر گئی اور صفیہ اس کو دیکھتی رہ گئی.....

”اس پیکٹ کو تلاش کرو..... وہی سب مسئلوں

کی جڑ ہے.....“ وہ بڑبڑائی..... مگر تلاش کے باوجود وہ گم شدہ پیکٹ نہ ملا۔

اکلی صبح معمول کے مطابق تھی مگر پچھلے تمام واقعات نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا..... وہ آفس میں بیٹھی ایک اکاؤنٹ اوپن کر رہی تھی کہ اس کے پرسل نمبر کی گھنٹی بج اٹھی..... نمبر نیا تھا..... عموماً وہ ان نمبرز کو اگنور کرتی تھی..... مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹینڈ کرنا پڑا..... کیونکہ اس نمبر سے یہ پانچویں کال تھی۔

”ہیلو.....!“ وہ بولی۔

”شکریہ..... کال اٹینڈ کرنے کا..... کہنا صرف

اتنا ہے کہ زندگی بہت چھوٹی ہے..... اور آپ کی تو ختم ہونے کو ہے.....!“

”کون ہیں آپ..... اور کیوں مجھے تنگ

کر رہے ہیں..... ضرور آپ کا تعلق اس کفن سے ہے، جو آپ نے مجھے بھیجا تھا۔“ مگر رابطہ کٹ گیا۔

اس نے سر پکڑ لیا۔ پچھلے چند دنوں سے اس کے

ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آرہے تھے۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کون تھا جو اسے وہنی طور پر پریشان کر رہا تھا اور کیا چاہتا تھا.....!

وہ اپنی گاڑی میں واپس جا رہی تھی کہ اچانک

اسے بریک دبانے پڑے کیونکہ وہاں ایک لہسا اور ٹکڑا انسان اور کوٹ پہنے سڑک کے درمیان میں کھڑا ہوا

موٹا اور ڈراؤنا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور آواز بھاری.....!“ صفیہ نے آنکھیں حیرت سے کھاتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے وہ پیکٹ؟“

”جی ابھی لائی.....!“ وہ کمرے سے باہر چلی

گئی..... تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا پیکٹ تھا.....!

”یہ لیں جی.....!“ صفیہ نے گفٹ پیک کی

طرح پیڈ گفٹ اسے تھما دیا۔ ”نام پوچھا تھا اس کا؟“

”جی..... پوچھا تھا مگر اس نے صرف اتنا کہا کہ

”یہ پیکٹ ماہم بی بی کو دے دینا!“

”ٹھیک ہے..... جاؤ تم..... ضرورت پڑے گی

تو بلا لوں گی تمہیں.....!“ صفیہ باہر چلی گئی.....

اس نے دروازہ بند کیا اور اس بھاری سے

پیکٹ کو کھولنے لگی..... اسے کھولتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

”کون ہو سکتا ہے جو یہ پیکٹ دے گیا.....؟“

وہ بڑبڑاتی تھی۔

جلد ہی پیکٹ کھل گیا..... مگر وہ پیکٹ میں موجود

چیز کو دیکھ کر اچھل پڑی..... وہ سفید رنگ کا دو گز کا کپڑا تھا، وہ کپڑا جو مرنے والے کو پہنایا جاتا ہے۔ کفن نما

لباس، بالکل کفن کے سے انداز میں سلا ہوا، تیار کفن.....!“

وہ گھبرا گئی..... کسی نے اسے کفن بھیجا تھا۔ وہ

گھبرائی ہوئی صفیہ کے کمرے میں جا پہنچی

”آج رات میرے پاس سو جاؤ..... مجھے

اکیلے نہیں آرہی۔“

صفیہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ تو کچھ خوف کم

ہوا.....! اسی رات اس نے خواب میں اپنا سرا چہرہ

دیکھا۔ اس نے دیکھا وہ مرچکی ہے اور اس کا جنازہ

قبرستان کی طرف جا رہا ہے۔ رات کا عالم اور قبرستان کی

تاریکی، قبر تیار ہو چکی تھی، وہ اندھیری قبر تھی جہاں صرف

مردہ ہی دفن ہو سکتا تھا۔ وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی..... اس

تھا۔ وہ عجیب سا انسان۔ غیر محسوس انداز سے کسی بات کی مانند بلا خوف و خطر سر جھکائے کھڑا تھا۔

”عجیب پاگل آدمی ہے مرنا ہے تو کسی اور طریقے سے مرے، میری گاڑی کے نیچے لازمی آنا ہے۔“ وہ غصے سے سرخ ہوتی ہوئی گاڑی سے باہر نکل آئی، یہ سڑک عام طور پر مصروف رہتی تھی مگر آج گاڑیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ بڑی تیزی سے اس کی جان لپی۔

”اوسسز۔۔۔۔۔ مرنا ہے کیا۔۔۔۔۔؟ کیا مسئلہ ہے تمہارا۔۔۔۔۔! کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا۔۔۔۔۔!“

وہ منہ دوسری طرف کئے خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ قد میں بہت لمبا اور موٹا سا تھا۔ اس کے سر پر بلیک سیٹ تھا۔ ماہم کو ایسے لگا وہ بہرہ تھا جو اس کی آواز کون نہ رہا تھا۔۔۔۔۔!

”مجھے مت دیکھو۔۔۔۔۔ اور نہ ہی سوچو۔۔۔۔۔ یہ پیکٹ پکڑو اور گھر جا کر کھانا۔۔۔۔۔!“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”وہ سرخ پیکٹ تھا۔۔۔۔۔ جو اس نے ماہم کی جانب بڑھا دیا تھا۔

”میں نہیں لے رہی یہ پیکٹ۔۔۔۔۔! تم وہی شخص ہو جو میرے گھر پر کفن دے گئے تھے، اور آج فون بھی کیا تھا۔۔۔۔۔“

مگر وہ اجنبی شخص اس کی آنکھوں سے ایسے غائب ہوا جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔۔۔۔۔ مگر وہ سرخ پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے لیا ہی نہیں تھا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ یہ میرے ہاتھ میں کیسے موجود ہے۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔۔۔!“ وہ بڑبڑائی۔

”یہ شخص کون ہے۔۔۔۔۔ جو ہر بار مجھے کوئی نہ کوئی گفت دے جاتا ہے۔“

وہ گھبرائی تو سرخ پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ ”اور اس کی چیخ جیسے نکل گئی۔ سرخ پیکٹ میں اس کا اسٹیچو موجود تھا ہو بہو اس کی شکل کا اسٹیچو جس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور گردن کے نزدیک سرخ سرخ خون تھا۔ اس نے

دیکھتے ہی پیکٹ دور پھینک دیا۔ یہ بھونڈا مذاق تھا۔ مگر وہ شخص کیوں اسے ہراساں کر رہا تھا۔ کیا چاہتا تھا وہ۔۔۔۔۔؟ کیوں اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔۔۔۔۔؟

اس رات عجیب معاملہ ہوا، وہ روم میں تھی کہ لائٹ چلی گئی تھی مگر یو پی ایس نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا، وہ کتابوں کے ریک کے پاس کھڑی تھی کہ اچانک ایک کتاب ریک سے نکل کر فرش پر گر گئی۔۔۔۔۔ اس نے کتاب اٹھائی مگر ٹائٹل دیکھ کر اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ کتاب کے ٹائٹل پر موت کا منظر تھا، اس نے کتاب اٹھا کر ریک میں رکھی۔۔۔۔۔ نجانے کیوں موت اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔

وہ الماری کی طرف بڑھی۔ ایک لمحے کو اسے اپنے ابو اور امی یاد آ گئے۔ آج وہ اس کے ساتھ ہوتے تو وہ خوش رہتی۔ غم نہ ہوتے، کوئی خوف نہ رہتا مگر اب زندگی کتنی مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے الماری کھولی اور تصویروں کا ایلم نکال لیا۔ اور تصویریں دیکھنے لگی۔ مختلف جگہوں پر مختلف یادوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ساری تصویریں دیکھ ڈالیں مگر ایک بات حیرت انگیز تھی۔ اس کی اپنی تصویریں کئی پھٹی سی ہو گئی تھیں۔ ہر تصویر میں اس کی تصویر پر سرخ کر اس بنا ہوا تھا۔ یہ کر اس پہلے تو نہ تھا اچانک کہاں سے آ گئے تھے۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

موسم کے چوراہے بدلے کہ پادل آئے اور چند ہی منٹوں میں بارش شروع ہو چکی تھی، برانچ کلوز کرنے کا وقت ہو گیا تھا، آج جمعرات تھی اور کسٹمرز کا بہت کم ہجوم رہا تھا، لہذا ڈیوٹ اور کریڈٹ بہت جلد Equale ہو گئے، تمام اسٹاف ایک ہی وقت قری ہوتا تھا، شام ہو چلی تھی اور بارش زوروں پر تھی اور آج وہ گاڑی بھی نہیں لائی تھی۔۔۔۔۔ یقیناً اسے ٹیکسی لینی تھی، برانچ کلوز ہوئی تو وہ پارکنگ شیڈ میں ٹھہر گئی تھی۔

باسط اپنی گاڑی نکال کر اس کے پاس سے گزرا مگر پھر ریورس کیسٹر لگا کے اس کے پاس گاڑی لے آیا۔۔۔۔۔ باسٹ آپریشن منہر تھا اور اسی نے ماہم کو پریوز کیا

تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ باسط ایک سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اچھے کردار اور خاندان کا چشم و چراغ کافی میچور تھا اور ماہم کے ساتھ سیریں بھی۔ ”اس موسم میں ٹیکسی ملنا محال ہے۔ آپ کو برائے لگے تو میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو۔۔۔۔۔!“ اس نے مسکراتے ہوئے آفر کی۔

ماہم کو اعتراض تو نہ تھا مگر ایک تھجک تھی۔۔۔۔۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ واقعی موسم کافی خراب تھا اور ٹیکسی کا ملنا محال تھا۔ ”سوچنے مت میڈم۔۔۔۔۔ اور بیٹھ جائیے۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔!“ وہ بولی۔
باسط گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور بھاگ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول لیا۔ ماہم ڈرائیور سائیڈ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جبکہ باسط ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

”میں خود بیٹھ جاتی، آپ نے تکلف کیا کیٹ کھولنے کا!“ ماہم نے کہا۔

”آپ میری پاس بھی ہیں، آپ کی عزت میرا فرض ہے۔“ وہ بولا۔

”ایک بات یاد رکھنا، میں صرف آفس میں پاس ہوں، آفس سے باہر عام دوستوں کی طرح ٹریٹ کیا کرو۔“ وہ بولی۔

”ڈرہ نوازی ہے آپ کی۔۔۔۔۔ ورنہ ہم اس قابل کہاں کہ ہمارے ساتھ سفر کریں آپ۔۔۔۔۔ اور دوست ہونے کا بھی۔۔۔۔۔!“

”آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ ٹرسٹ ہے مجھے آپ پر۔۔۔۔۔!“ وہ بولی۔

باسط کو محسوس ہوا! ماہم کچھ پریشان سی تھی۔ اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ نے ماہم کو وارن کیا تھا کیونکہ وہ کچھ اچھا ورک نہیں کر رہی تھی، اور اس کی بہت سی غلطیاں سامنے آرہی تھیں۔

”ماہم! آپ آج کل ابھی ابھی سی ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔۔۔۔۔!“ وہ بولا۔

سوچ میں ڈوبی ماہم چونکی۔

”آں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ بس طبیعت کچھ خراب ہے، آپ نے کیا کہا۔۔۔۔۔“ وہ بے خیالی سے بولی۔

”خیریت۔۔۔۔۔! طبیعت کو کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

”باسط۔۔۔۔۔ آپ میرے گھر چل سکتے ہیں کچھ دیر کے لئے۔۔۔۔۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ضرور۔۔۔۔۔ میں ضرور سننا چاہوں گا کیا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ بولا۔

گھر آ کر باسط نے ساری بات غور سے سنی۔ اور پھر دونوں نے مل کر وہ گمشدہ گفٹ ڈھونڈا جو تلاش کے باوجود کہیں نہ ملا۔۔۔۔۔ ہر جگہ تلاش کیا مگر سرخ پیک کہیں نہ ملا۔۔۔۔۔

”یہ کسی کی شرارت ہے۔ فکر نہ کریں ہم فریض کریں گے۔ جو کوئی بھی ہے سامنے آ جائے گا۔۔۔۔۔ کوئی ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے، آپ تنہا سفر نہ کریں اور احتیاط کریں۔۔۔۔۔!“ وہ بولا۔

”میں خوفزدہ نہیں ہوں مگر اس رات جب میں نے گفٹ پیک جو نہی کھولا تھا، کھلنے سے پہلے ایک دھماکہ ہوا اور سنگھار میز پر رکھے سارے پرقیوم ایک دم سے فرش پر جا گرے تھے۔ لائٹ جا چکی تھی۔ میں نے موبائل مارچ سے روشنی کی۔ سارے گفٹ موجود تھے مگر آخری والا گفٹ غائب تھا جواب تک معہ بنا ہوا ہے۔

اس کے بعد کفن کا تحفہ اور پھر کار کے سامنے آنے والے لمبے بھدے شخص کا پیکٹ جس میں کٹی ہوئی گردن تھی، جو میری شکل کی تھی۔۔۔۔۔ پیکٹ دیتے ہوئے وہ شخص میرے مخالف سائیڈ پر تھا اور پھر اس کا پیکٹ جھپکتے غائب ہوا۔ یہ سارا معاملہ کسی حقیقی مطلب کی طرف جا رہا ہے۔ اور انہی وجوہات کی بنا پر میں ابھی ابھی رہتی ہوں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

انسان آخر کب تک تنہا سارے مسائل برداشت کرتا ہے، دکھ بانٹنے کے لئے انسان کو انسان کی ضرورت ہوتی ہے اور باسط اسے اپنا سالک تھا، ابھی تو وہ اس سے سب کچھ بیان کر چکی تھی، حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود باسط کو اپنی زندگی میں لانا چاہتی تھی۔ وہ خود کو تنہا محسوس

کرتی تھی۔ اور زندگی کے اس موڑ پر کسی ہمسفر کا ہونا لازمی تھا، مگر فی الحال تو وہ صرف اسی گفٹ کے معاملے میں پھنسی ہوئی تھی اور باسط ہی اس لائق تھا کہ سارے مسئلے حل کر سکے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ باسط اس مسئلے کو اچھی طرح ہینڈل کر لے گا۔

باسط رات گئے تک اس کے گھر رہا۔ اس کے ہوتے ہوئے اسے کوئی خوف یا ڈر محسوس نہ ہوا، یہ اس کی اندر کی کیفیت تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ صفیہ کے روم میں گئی۔ رات کافی ہو گئی تھی اور اسے سونے کی ہونٹ تھی۔ مگر اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی میں مزید تنہائی ختم کی جائے اور باسط کو اپنا ہمسفر بنالیا جائے اس معاملے میں صفیہ کی خدمات لینا لازمی تھا۔ وہ صفیہ کے روم میں داخل ہوئی تو صفیہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھو۔“ وہ خود ہیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”صفیہ! میری بات غور سے سنو، اپنے منہ سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے مگر جس کے ماں باپ نہ ہوں وہ کر ہی کیا سکتے ہیں، میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اور اس طرح اس نے صفیہ کو سب کچھ سمجھا دیا، صفیہ بھی خوش تھی کہ رونق ہو جائے گی۔ اور ماہم کی زندگی میں بہار آ جائے گی۔

اگلی صبح وہ مطمئن اور خوش تھی کیونکہ بہت جلد اس کی تنہائی ختم ہونے والی تھی، اور ڈر بھی انجام کو پہنچنے والا تھا، ناشتہ کرنے کے بعد وہ آفس پہنچ گئی۔ نجانے کیوں اس کا دل مطمئن تھا۔ نہ ڈر، نہ خوف..... عجیب سرشاری تھی۔ اس کے انگ انگ میں۔

ادھر گھر میں صفیہ کو صفائی کے دوران ایک سرخ پیکٹ ملا۔ وہ عجیب سا گفٹ پیک تھا جسے ہاتھ لگاتے ہی اس کا دل خوف سے دھڑکا، اس کو علم تھا کہ یہی وہ گفٹ پیک تھا جسے ماہم نے بہت ڈھونڈا تھا مگر نہیں ملا تھا۔ مگر آج اچانک سامنے آ گیا تھا۔ اس نے حفاظت سے اپنے کمرے میں رکھ لیا کہ ماہم جب واپس آئے گی تو

اسے سر پرانز دے گی۔

شام ہو چلی تھی۔ ماہم آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ آج وہ خود کار ڈرائیو کر رہی تھی..... ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے مہندی حسن کی غزل بول کر دی۔

نجانے اسے کیا سوچا کہ ایک سیلیٹر پر پاؤں بڑھتا گیا۔ سڑک ویران تھی اور اس نے اسی وجہ سے اسپید بڑھا دی تھی۔ گاڑی ہوا ہو گئی، گویا ہوا سے ہاتھیں کرنے لگی تھی۔

اچانک ہی ایک ٹرک سامنے آیا تھا اور اسے بریک لگانے چاہئے تھے۔ مگر بد قسمتی کہ بریک فیل ہو گئے تھے۔ اور اس کی کار زانے دار انداز سے ٹرک سے جا ٹکرائی..... تبھی اسے وہی لمبا موٹا آدمی نظر آیا..... اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی..... اور پھر اسے آخری احساس یہی محسوس ہوا کہ جیسے اندھیرا سا آنکھوں کے آگے چھا گیا ہو۔

ماہم روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئی تھی، باسط اور اس کے تمام اسٹاف کو افسوس تھا، ماہم باسط کی پہلی محبت تھی، اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، آخری رسومات کے بعد وہ صفیہ سے ملا۔

”صاحب، بی بی آپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور جی ان کی موت والے دن یہ گفٹ پیک ملا تھا۔ آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔ شاید یہی وہ گفٹ ہے جسے ان کو تلاش تھی.....“

صفیہ گفٹ لے آئی..... باسط نے اسے کھولا..... اندر صرف ایک پرچی رکھی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا..... ”ماہم علی بنت سجاد علی تاریخ وفات 22 دسمبر 2004، وجہ موت کار حادثہ.....!“

باسط اچھل پڑا کیونکہ جس دن ماہم کی وفات ہوئی، 22 دسمبر کی تاریخ تھی، اور وہ بھی کار حادثے میں..... سوالیہ نشان تھا کہ کون تھا وہ، جس نے ماہم کو ”موت کا تحفہ“ دیا تھا۔



وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

سپہ سالار خوشحال پور کی طرز زندگی دیکھ کر بہت خوش ہوا، وہاں کی خوشحالی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے راجہ کو کہلا بھیجا کہ میں تمہاری سپہ سالاری سے الگ ہو گیا ہوں، مجھے اب سپہ سالاری سے کوئی غرض نہیں اور میں اب آئندہ پوری زندگی خوشحال پور میں ہی رہوں گا۔ سپہ سالار خوشحال پور میں اپنی فوجی طاقت بڑھانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ ہو گئی، راجہ سپہ سالار سے بہت متاثر ہوا، اور ایک وقت آیا کہ راجہ سپہ سالار سے ملا تو سپہ سالار نے اپنی زندگی کی پوری کہانی سنائی اور بولا کہ میرا اصل نام شوکت خان ہے اور پھر ایک وقت آیا کہ راجہ نے اپنی بڑی لڑکی رجنی کی شادی شوکت سے کر دی۔ رجنی مسلمان ہو گئی تھی۔ سپہ سالار نے گلشن کو بتا دیا تھا کہ میں وہی چور ہوں جو کہ چوری کی نیت سے ہارش والے دن تمہارے چبھے کے نیچے کھڑا پنکا بن کر شیر کو متاثر کیا اور پھر گلشن کہہ مار نے بھی اصل حقیقت بتا دی۔ پھر گلشن کے مشورے سے سپہ سالار چور نے شیر کو آزاد کر دیا اور پھر ایک دن گلشن کے کہنے پر پنکا سے ملا تو پنکا نے بھی ساری حقیقت عیاں کر دی اور پنکا مٹی پر گر کر غائب ہو گیا اور اس طرح چور پنکا اور شیر کی کہانی ختم ہو گئی، شوکت خان عرف سپہ سالار خوشحال پور کی مزید ترقی میں لگ گیا، اس کے تمام دشمن منہ کی کھا کر غائب ہو گئے۔ مکمل کہانی پڑھ کر حکیم وقار خاموش ہو گئے اور پھر رولوکا سے پوچھا۔ ”حکیم صاحب کہانی کیسی لگی۔“ رولوکا بولا۔ ”مصنف کی سوچ کا جواب نہیں۔ جب آپ نے کہانی کا نام ”چور پنکا اور شیر بتایا تو میرے ذہن میں آیا کہ کوئی مزاحیہ کہانی ہے، مگر جوں جوں آپ آگے بڑھتے رہے میں اچنبھے میں پڑتا گیا۔ مصنف نے جو مزاحیہ نام سے حقیقت بیان کی ہے اس کا جواب نہیں اور ہمیشہ ایک اچھا مصنف ہر تحریر میں سبق کا پہلو ضرور رکھتا ہے۔ مجھے یہ کہانی دلی طور پر بہت اچھی لگی ہے۔ اور پھر رولوکا اور حکیم وقار دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔“

(اب آگے پڑھیں)

”ہیں، دو دن کی تو بات ہے میں خود یہ کام کروں گا۔“
پھر رولوکا کی ضد کے آگے حکیم وقار خاموش ہو گئے اور اس طرح اگلے دن صبح ہوتے ہی رولوکا، مطب کے تین ملازموں کے ہمراہ جزی بوٹیوں کی تلاش کے لئے گئے جنگل میں آ گیا۔
جنگل میں پہنچ کر رولوکا ملازموں کے ساتھ مل کر جزی بوٹی تلاش کرنے لگا اور دوپہر ہونے پر چاروں نے مل کر کھانا کھایا پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ تلاش کے کام میں جت گئے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے تلاش کا کام سب نے ختم کر دیا اور سفری خیمہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لگا دیا۔

حکیم وقار چار پانچ ماہ بعد قیمتی جزی بوٹیوں کی تلاش میں اپنے تین چار ملازموں کے ہمراہ گئے جنگل یا پھر پہاڑی علاقے میں جایا کرتے تھے۔ جب انہوں نے اپنا پروگرام رولوکا کو سنایا تو رولوکا بولا۔ ”حکیم صاحب اس مرتبہ آپ نہیں جائیں گے بلکہ میں خود جا کر جزی بوٹیاں لاؤں گا۔“ یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ ”حکیم صاحب یہ کام آپ کا نہیں، آپ تو ویسے بھی آئے دن خوف ناک اور جان لیوا مسائل میں الجھے رہتے ہیں، آج کل آپ چند دن سے فارغ ہیں کوئی خطر ناک مسئلہ آپ کے سامنے نہیں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو تکلیف دوں، آپ مطب میں



رات کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد تینوں ملازم نیند کی وادی میں اتر گئے۔

جب تینوں گہری نیند سو گئے تو ردلوکا اٹھا اور درخت کے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ دیا تاکہ رات کے وقت کوئی نادیدہ ہستی یا کوئی بلا انہیں تک نہ کرے اور پھر ردلوکا اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

آدھی رات کے قریب اچانک ردلوکا کے کان میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی عورت سسک رہی ہو، آواز میں درد نمایاں تھا۔

آواز کے سنتے ہی فوراً ردلوکا کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک عورت اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ہے اور یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

اس عورت کو دیکھ کر ردلوکا اچنبھے میں پڑ گیا اور پھر بولا۔

”خاتون آپ کون ہیں اور اس اندھیری رات میں یہاں کیوں رکی ہیں؟ آپ رومی نہیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں، شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔“

یہ سن کر وہ عورت بولی۔ محترم بزرگوار میں ایک بدنصیب بھنگی ہوئی روح ہوں، تھک ہار کر میں نے اس درخت کو اپنا مسکن بنالیا ہے اور آج آپ نے اس درخت کے گرد حصار کھینچ کر مجھے قید کر دیا ہے جس کی وجہ سے میں بہت لذیت میں ہوں اور میں حصار سے باہر جانہیں سکتی۔“

یہ سن کر ردلوکا بولا۔ ”آپ گھبرائیں نہیں، میں نے حفاظت کے طور پر حصار کھینچا ہے آپ کی تکلیف کو مد نظر رکھ کر میں حصار ہٹا دوں گا تاکہ آپ کی تکلیف ختم ہو اور آپ یہاں سے باہر جاسکیں۔ آپ نے ابھی ابھی یہ کہا کہ میں ایک بدنصیب بھنگی ہوئی روح ہوں۔“

”اگر آپ یہ بتانا پسند کریں کہ آپ کی روح بھنگی کیوں، اور ہو سکتا ہے کہ اصل حقیقت جاننے کے بعد میں آپ کے لئے کچھ کر سکوں تاکہ آئندہ کے لئے آپ کو سکون مل جائے، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ مجھ

سے جو کچھ بھی ہو سکا آپ کے سکون کے لئے ضرور کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کروں گا آپ اپنے حالات بیان کریں۔“

ردلوکا کی باتیں سن کر اس کو کافی ڈھارس ہوئی اور پھر وہ یوں گویا ہوئی۔

”اس دن بارش ہو رہی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آ رہی تھیں اور بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ یہ موسم بڑا پر لطف ہوتا ہے اور ایسے موسم میں نہ جانے کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔“

ایک انسانی بدن سامنے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر رہا تھا۔ فضا میں لڑھکتیاں کھاتا ہوا گہرائیوں کی جانب آ رہا تھا، میں نے چاہا میں لپک کر اس بدن کو پکڑ لوں۔ وہ میرا ہی جسم تو تھا زندگی سے بھرپور، جوانی کی رعنائیوں سے سجا ہوا۔

بھوری چٹائیں پانی میں نہا کر نکھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے تمام گڑھے بھر کر جل تھل ہو رہے تھے، اور شرارت الارض زمین کے سوارخوں سے باہر نکل آئے تھے۔ تاحد نگاہ پانی کے دھوئیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں جی کے ساتھ ساتھ فضا میں چل رہی تھی کہ دفعتاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔

”فری! وہ دیکھو وہ کیا ہے؟“ میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا تو ایک بلند و بالا سیاہ پہاڑ کے دامن میں سوکھی ہوئی پڈیوں کا ایک شجر پڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے پانی جمع ہو چکا تھا اور وہ ادھر ادھر تیر رہا تھا، جی پھر پھر پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اتر گیا وہ اس ڈھانچے سے کچھ فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور پانی میں بہتے ہوئے اس ڈھانچے کو بغور دیکھنے لگا۔ بے حس انسان اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک جا کھڑی ہوئی، لیکن نجانے کیوں میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری ہو گیا۔ میں خود کو مضطرب محسوس کر رہی تھی۔

نادیدہ ہاتھ اس وجود کو نہ پکڑ سکے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں بہتے ہوئے ایک برساتی

نالے میں آگرا۔ یہی نالہ تھا جس میں اب بارش کی بجائے پانی بھر گیا تھا۔ اس وقت بھی شاید بارش ہو چکی تھی اور برساتی نالہ اپنے جو بن پر تھا۔

انسانی بدن اس نالے میں آگرا۔

میں اس سے الگ کھڑی ہوئی تھی اور میری نگاہوں میں تاسف کے آثار تھے۔ تب ہی جمی کی کریمہ چیخ نے مجھے جیسے جگایا۔ میں خیالات سے باہر آ گئی۔

”فری! فری! کیا سوچنے لگیں؟“

”کچھ نہیں جمی! کوئی خاص بات نہیں۔“

”فری! دیکھو یہ انسانی ڈھانچہ کس طرح پانی کی لہروں سے کھیل رہا ہے۔ فری آؤ کیوں نہ ایک تجربہ کریں۔“ جمی نے حسب معمول پھر ایک تجویز پیش کر دی۔

”کیسا تجربہ؟“ میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”تم اس ڈھانچے میں داخل ہو جاؤ، دیکھیں تو سہی اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟“

”اوشہوں میں ایسی غلیظ چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔ اگر مجھے ایسا ہی کوئی بدن حاصل کرنا ہوتا تو تمہاری طرح کسی چمکادڑ کا بدن حاصل کر لیتی اور فضا میں تمہارے ساتھ پرواز کرنے لگتی۔ لیکن مجھے ایسے منحوس بدن پسند نہیں ہیں۔ چھی چھی، کبھی اپنے آپ کو دیکھو تو فوراً اس خول سے نکل بھاگو۔“ میں نے کہا اور جمی پھر ہنسنے لگا۔

”تم تو بس فری انوکھی ہو۔ ارے یہ بدن کیا

حیثیت رکھتے ہیں ہمارے لئے، جب چاہو چھوڑ دو اور اس سے نکل کر کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی کیفیت ملتی ہے۔ فری! مان لو میری بات ذرا تجربہ ہی سہی۔ دیکھیں تو سہی کہ اس جسم میں داخل ہو کر تمہاری کیا کیفیت ہوتی ہے؟“

جمی نے مجھے کچھ اس طرح مجبور کیا کہ میں تیار ہو گئی۔ آگے بڑھ کر میں نے اس پانی پر کھیلنے ہوئے انسانی ڈھانچے کو پکڑ لیا۔ چاروں طرف سے اس کا جائزہ لیا اور پھر اسے پانی سے کھینچ لیا۔ اگر یہ برساتی نالہ پوری

طرح بھر جاتا تو یہ پانی اس انسانی ڈھانچے کو لے کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ بہر صورت میں نے جمی کی ہدایت پر عمل کیا اور اس ڈھانچے میں داخل ہو گئی۔

عجیب سی شخص کا احساس ہوا تھا۔ ڈھانچے میں داخل ہوتے ہی اس کے خلا پر ہونے لگے۔ ہڈیوں کے درمیان کھال پیدا ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں اس حصار میں بند ہو گئی۔ میں نے چیخ چیخ کر جمی کو آوازیں دیں، لیکن جمی کے قہقہے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تب میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”شریر آدمی ہمیشہ ایسی ہی فضول حرکتیں کرتے رہتے ہوتے۔ میں باہر آ رہی ہوں۔“

”ارے نہیں نہیں فری! سنو تو سہی۔ آخر ایسی کیا جلدی ہے جب چاہو اس سے باہر آ سکتی ہو۔ تم قیدی تو نہیں بن گئیں۔ دیکھو کیسی انوکھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس میں۔ واہ! اس پر تو گوشت آتا جا رہا ہے۔ بڑا دلچسپ تجربہ ہے فری۔“

میں نے ڈھانچے کو دیکھا۔ سوکھی ہوئی ہڈیاں گوشت سے بھر گئی تھیں۔ ان کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ گورا گورا سفید اور گلابی، آہ کتنا خوبصورت بدن تھا۔ لیکن لباس سے بے نیاز۔ مجھے شرم آنے لگی۔ انوکھے ہوتے ہیں یہ بدن۔ نہ جانے کیسے کیسے بوجھ لاد لیتے ہیں خود پر۔“

”جمی! کہنے اپنا رخ بدل لو۔ ورنہ میں باہر آ جاؤں گی۔“

”میں سمجھ گیا۔ تمہیں بے لباسی کا احساس ہو رہا ہے۔ انسانی بدن میں بس یہی خرابی ہے۔ وجود میں آتے ہی مصنوعی ضرورتوں کا شکار ہو جاتا ہے مگر ہم اس تجربے کو مکمل کریں گے۔ تم چند لمحوں تو وقف کرو۔ میں ابھی تمہارے لئے لباس مہیا کرتا ہوں۔“

جمی نے اپنے بدن کو تولا اور فضا میں بلند ہو گیا۔ میں برساتی نالے سے ہٹ کر اس چٹان پر آ بیٹھی جہاں تھوڑی دیر قبل جمی بیٹھا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں میرے بے لباس بدن کو بھگور رہی تھیں۔ لمبے لمبے بال ذرا سی

دیر میں بھیگ کر میری گردن اور سینے پر آ پڑے تھے۔
میں ان لمبے بالوں سے اپنے بدن کو چھپانے لگی۔
حالانکہ یہاں کوئی نہیں تھا لیکن بس ایک احساس ایک
فطری احساس مجھے شرم دلانا تھا۔

نصا میں جی نظر آیا اور میں سمٹ گئی۔ اس نے
ایک لباس میرے اوپر ڈال دیا۔ ”اب تم یہاں سے
تھوڑی دور چلے جاؤ۔ میں یہ لباس پہن لوں۔“ میں نے
کہا اور جی نے مجھ سے یہ اخلاقی تعاون کیا، تب میں
نے لباس پہن لیا۔

”اب میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں؟“ جی کی
آواز ابھری اور میری اجازت سے وہ میرے پاس
آ گیا۔ اس نے شرارت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا
اور اپنے نوکیلے دانت نمایاں کر دیئے۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“ میں غصیلے انداز
میں بولی۔

”اوہ، نہیں فری! یقین کرو ایسی بات نہیں ہے۔
تم بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ کیا یہ تجربہ انوکھا
نہیں ہے۔ سوکھی ہوئی ہڈیوں کا پنجر ایک دم
سرسبز و شاداب ہو گیا۔“

”ہونا ہی تھا۔ مٹی کے اس وجود میں روح کے
سوا اور کیا ہوتا ہے۔ ساری شادابی روح کی ہوتی ہے۔ تم
یہ لباس کہاں سے لے آئے؟“

”میری نہ پوچھو۔ میری دنیا ان کھنڈرات تک
محدود نہیں ہے۔ میں تو نہ جانے کہاں کہاں گھومتا
پھرتا ہوں۔ ان پہاڑوں سے کچھ دور سرسبز جنگلوں سے
پرے ایک خوبصورت شہر آباد ہے۔ حسین عمارتوں کا شہر
جہاں بے شمار لوگ رہتے ہیں۔“

”آہ، میں اس شہر کو جانتی ہوں۔ میں نے وہاں
بیس سال گزارے ہیں۔ مجھے وہ شہر یاد ہے۔“

”وہ تمہارا شہر تھا؟“

”ہاں، وہ میرا شہر ہے۔“ مجھے اپنے دل میں
حسرتیں تڑپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کیا کیا یاد آتا
جارہا تھا۔ ذہن کے درتے کھل رہے تھے اور ان سے

یادوں کی ہوا آ رہی تھی۔

”کیا تمہارے دل میں اس شہر کو دوبارہ دیکھنے
کی آرزو نہیں ہے فری؟“

جی نے پوچھا اور پھر جلدی سے بولا۔ ”اب
تو تمہارے سینے میں دل ہوگا؟“

”آرزو۔“ میں نے حسرت بھری آواز میں کہا۔
”کیوں، کیا تمہارے احساسات نہیں

جاگے؟“ کیا تمہارا دل اب بھی مردہ ہے؟“
”اس شہر میں تمہارے اپنے لوگ ہوں گے۔ وہ

سب ہوں گے جن کے درمیان تم رہی ہو؟“

”میرے اپنے۔“ میں حسرت بھی آواز میں
بولی۔ ”تھے! مگر اب ان سے میرا کیا تعلق ہے۔ میرے

اور ان کے رشتوں کے تواسارے دھاگے ٹوٹ چکے
ہیں۔ میں فطرت سے بغاوت کی جرأت کہاں کر سکتی

ہوں۔“

”بغاوت تو کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن تفریحا

تجربہ دیکھو تو سہی، وہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ دیکھو تو سہی
ان میں سے کوئی تمہیں یاد کرتا ہے یا سب بھول چکے

ہیں۔ بس تفریحا۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔
بالآخر ہمیں انہی کھنڈرات میں آ جانا ہوگا۔“

یادوں کی ہوائیں تیز ہو گئیں اور ذہن کے
دریچوں میں گزارا ہوا ماضی انہرے لگا۔ پھر میری آواز

ابھری۔

”دل تو میرا بھی چاہتا ہے! مگر کیا کروں ان

لوگوں کے درمیان جا کر، کوئی بھی نہیں ہے میرا اور کوئی
ہوتا بھی تو اب ان میں میرا فاصلہ کسی طور ممکن نہ تھا۔ دنیا

سے میرا ناٹھ ٹوٹ چکا ہے پھر اس دنیا سے جی لگانے
سے کیا فائدہ؟ تم ہمیشہ ایسی ہی کوئی شرارت کرتے

ہو لیکن یقین کرو، تمہاری یہ شرارت میرے لئے بڑی
اعلیٰ فہم ثابت ہوئی ہے میں تمہیں بتاؤں جی، یہ بدن

یہ انسانی ڈھانچہ جو نہ جانے کتنے عرصے کے بعد تم نے
مجھے دکھایا ہے، میرا اپنا ہی ہے۔ ہاں، میں اسے بھول

چکی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ کہاں پڑا ہوا ہے، لیکن

جانب لوٹ آیا۔

دولت مند آدی تھا۔ دولت کی کمی نہ تھی۔ اس کے برکاروں نے اس کا کاروبار اس کی عدم موجودگی میں بھی بڑی وفاداری سے سنبھال رکھا تھا اور بعد میں بھی یہی ہوا۔

اس کی محبتیں میرے لئے وقف تھیں اور وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے کسی دوسری عورت کی آرزو نہ کی۔ بس میری ذات کا ایک ایک لمحہ اس کی زندگی تھا اور میں بھی اس محبت کرنے والے باپ کو بے پناہ چاہتی تھی۔

سو پھر یوں ہوا، زمانے کی ضرورتوں کا خیال اسے آیا۔ میں بڑی ہو چکی تھی اور میرے بدن کی رعنائیاں میری جوانی کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔

سو اس نے سوچا کہ دستور زمانہ تو بھانا ضروری ہے، مجھے بھی زندگی کے اس محور میں شامل کر دے جو ماہ و سال سے انسانوں کے گرد مسلط ہے۔ سو اس نے تلاش کیا میرے لئے کسی ایسے نوجوان کو، جو دولت مند نہ ہو اور میرے ساتھ اس کی کوٹھی میں زندگی گزارنا پسند کر لے، حالانکہ میرا باپ اس قدر دولت مند تھا کہ اگر وہ چاہتا تو میرے لئے بہت سے اچھے گھرانے مل سکتے تھے۔ ایسے گھرانے جو بخوشی مجھے اپنا لیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شکل و صورت میں، میں سینکڑوں لڑکیوں میں ایک تھی اور لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ دولت بھی رکھتی تھی، جس کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔ لیکن نجاب نے میرے باپ کی سوچ کیسی تھی، وہ صرف ایسا لڑکا چاہتا تھا جو اس کی بیٹی کے ساتھ اسی کے گھر میں رہ سکے، اور اسے اپنی بیٹی سے جدا نہ ہونا پڑے۔ اور یہ نوجوان حامد تھا۔ اس کی ایک فرم کا منیجر، ایک خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان۔ میرے باپ کی نگاہ اس پر پڑی اور جب اسے معلوم ہوا کہ حامد اس دنیا میں تنہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا، اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ حامد کو شیشے میں اتار لے گا۔ یہ شخص اس کے تصورات کے عین مطابق تھا۔

یہ شاید میرا انتظار کر رہا تھا اور تمہاری شرارت نے مجھے ماضی کے کچھ غاروں میں دھکیل دیا۔ جی مجھے اجازت دو کہ میں یہ ناپاک بدن چھوڑ دوں، جس کی کشائیں مجھ پر مسلط ہو گئی ہیں۔ مجھے وہ آزادی پسند ہے جی! جو مجھے فطرت کی جانب سے ملی ہے ہاں، میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میں یہ بدن چھوڑ رہی ہوں۔"

"ارے، ارے سنو تو سنی! دیکھو یہ تو ہمارے دائرہ اختیار میں ہے۔ بھلا ہمیں یہ بدن چھوڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ جن چیزوں سے ہمارا ناطہ کٹ چکا ہے اب ہمیں کوئی بھی ان سے رابطہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ تو بس ایک تجربہ ہے ایک تفریح ہے جس کے بارے میں ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہیں گے۔ آخر کوئی نہ کوئی موضوع تو تلاش کرنا ہی ہوگا۔ پرانی باتیں دہراتے دہراتے کتنا وقت بیت چکا ہے۔"

"ہاں، نجاب نے کتنا، شاید پچیس سال، ہاں پچیس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ چھوٹی سی تھی۔ میں۔ ہاں بڑا خوبصورت تھا میرا گھر۔ حسین ترین اور وہ بوڑھا، جواب نجاب نے کہاں ہے؟ اور اب سے پہلے مجھے یاد نہیں آیا جسے میں نے کہیں تلاش نہیں کیا۔ زمین کے ٹاٹے وہ میرا باپ تھا۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اس کی آنکھوں سے محبت طوفان بن کر امنڈتی تھی اور میں اس طوفان میں ڈوب جایا کرتی تھی بے پناہ چاہتا تھا مجھے، اور میں بھی اسے اتنا چاہتی تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے میری ماں سے پیار تھا۔ اتنا چاہتا تھا وہ، میری ماں نے اس کا ساتھ چھوڑا تو وہ کئی سال تک اسپتال میں داخل رہا۔ نیم دیوانہ ہو گیا تھا وہ اور اگر میں اپنی ماں کے خدو خال اختیار نہ کر لیتی تو شاید اس کی یہ دیوانگی اسے بہت پہلے موت کی وادیوں میں لے جاتی، لیکن ڈاکٹروں نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا، شاید یہ کوئی نفسیاتی علاج تھا اور مجھے دیکھ کر وہ پھر سے جی اٹھا۔ اس نے اپنی تمام محبتیں میرے لئے وقف کر دیں۔ یہ دہری محبت تھی۔ میرے خدو خال اس کی محبہ سے ملتے تھے اور میں اس کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں محبتیں مجھے حاصل ہو گئیں اور وہ زندگی کی

پھریوں ہونے لگا کہ حامد ہمارے گھر آنے لگا۔ وہ فرم کے کاموں سے ہی آتا تھا۔ سہا سہا سا ڈرا ڈرا سا۔ میرے والد اپنے ملازمین کے ساتھ بہت سخت تھے اور ان کے سارے ملازم ان کی سخت مزاجی سے واقف تھے اس لئے ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔

پھر ایک شام میں نے اس خوف زدہ نوجوان کو دیکھا۔ میں اس وقت اپنی کونجی کے لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میرے والد گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ نیلے رنگ کی ایک کار سے اترا۔ شرعی رنگ کے خوبصورت لباس میں ملبوس چہرے بدن کا مالک۔ سیاہ بالوں کے خشک کچھے اس کے دودھ جیسے سفید چہرے پر خوب سج رہے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جوانی کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ وہ میری طرف ہی آ گیا۔

”معاف کیجیے گا، سیٹھ ابرار صاحب گھر پر موجود ہیں؟“

”آپ کو نظر آ رہے ہیں؟“ میں نے سوال کیا اور میرے سوال پر وہ بوکھلا گیا۔

”مم۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو ڈسٹرکٹ کیا۔ اس نے کہا۔

”کتنی بار معافی مانگیں گے آپ؟“ میں نے پوچھا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

پھر بولا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”سیٹھ ابرار بہر طور نہیں ہوں۔“ میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”میں ابرار ہیں؟“ وہ مسکرایا۔

”اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے؟“

”دیکھئے خاتون! مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ سیٹھ صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ اس سے قبل اگر آپ نے مجھے کسی قدر بدحواس محسوس کیا ہے تو وہ صرف سیٹھ صاحب کی وجہ سے۔ میں ان کے علاوہ کسی اور سے مرعوب نہیں ہوتا اور پھر آپ تو ذرا نے کی چیز ہی نہیں ہیں۔“

”بے تکلف ہونا چاہتے ہیں؟“ میں نے اسے گھور کر کہا۔

”ہرج بھی کیا ہے۔ صرف اتنا بتادیں کہ سیٹھ صاحب کتنی دیر میں آئیں گے تاکہ میرے رکنے کا جواز پیدا ہو جائے یوں بھی بہت ضرور کام ہے ان سے۔“

”مگر میں آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتی۔“

”میں مجبور نہیں کروں گا آپ کو۔“

”ڈیڈی ایک گھنٹے میں آ جائیں گے۔ انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔“

”گویا میرا اندازہ درست نکلا۔ آپ کس ابرار ہیں۔ خادم کو حامد کہتے ہیں۔“

”آپ ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار کریں۔ اندر چلے جائیں۔“

”اوہ۔۔۔ وہاں ٹھہرن ہوگی۔ آپ اجازت دیں تو میں اسی بیچ پر بیٹھ جاؤں؟“ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور میں ناک سکڑ کر خاموش ہو گئی۔ وہ مسکراتا ہوا بیچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں پھر چہل قدمی کرنے لگی۔ لیکن ذہن اسی کی طرف تھا۔ تب اس کی آواز ابھری۔

”آپ میرا قرض نہیں ادا کریں گی مس ابرار؟“

”کیا؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہے۔ آپ پر بھی فرض ہو گیا ہے کہ آپ اپنا نام مجھے بتائیں۔ یہ ایک طرح کا اخلاقی قرض ہے۔“ اسی وقت ایک ملازم ہمارے پاس آ گیا۔

”فری بی بی چائے لگا دوں، یا صاحب کا انتظار کریں گی؟“

”انتظار کروں گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”حامد بابو آپ کے لئے چائے لے آؤں؟“

ملازم اسے پوچھتا تھا۔

”ضرور فضل بابا! میں انتظار کروں گا۔“ اس نے جواب دیا اور ملازم چلا گیا۔

میں اسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”یہ فضل تمہیں کیسے جانتا ہے؟“

”میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں کس فری خادم

ہوں آپ کا۔ سینہ صاحب کی فرم کا منجر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ملازم کی وجہ سے اسے میرا نام معلوم ہو گیا تھا۔ کم بخت مجھے جلاتا رہا۔ چائے پیتا رہا۔ اس دوران میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر ڈیڈی آگئے وہ وقت سے پہلے ہی آگئے تھے۔ میں کسی قدر پریشان ہو گئی تھی لیکن ڈیڈی کا سوڈ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے اور چائے منگوا لی تھی۔

کافی دیر تک وہ بیٹھا رہا کچھ دیر کاروباری گفتگو ہوئی اور پھر ڈیڈی سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میرے ذہن پر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن اس کے جانے کے بعد ڈیڈی اس کی تعریفیں کرتے رہے۔ وہ اس سے بہت متاثر تھے۔

دوسرے دن مجھے اس کا فون ملا وہی شرارت بھری باتیں، ویسی ہی گفتگو مجھے اس کی گفتگو دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ پھر وہ اکثر ہمارے ہاں آتا رہا۔ ڈیڈی اسے بہت زیادہ لفت دینے لگے تھے۔ شاید ڈیڈی نے اس سے کوئی بات بھی کر لی تھی اور اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ مجھ سے کھل مل جائے۔ ایک آدھ بار ڈیڈی نے خود بھی مجھ سے اس کے ساتھ جانے کی سفارش کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس سے مانوس ہونے لگی۔ غالباً یہی میرے ڈیڈی کا مقصد تھا۔ انہوں نے اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے خیالات پر پورا اترتا ہے۔ میں چونکہ زندگی کے اس رخ سے واقف نہیں تھی اس لئے یہ پہلا شخص میری دلچسپی کا باعث بن گیا اور جب ڈیڈی نے اس کے بارے میں مجھ سے سوال کیا تو میرے چہرے پر شرم کے تاثرات پھیل گئے۔

”کیسا لگتا ہے وہ تمہیں؟“ ڈیڈی نے پوچھا۔

”عجیب سوال ہے ڈیڈی! شریف آدمی ہے اچھا ہے اور بس۔“ میں نے جواب دیا اور ڈیڈی سنجیدہ ہو گئے۔ پھر پر خیال انداز میں بولے۔

”دراصل فری بیٹے اتم میری دلی خواہشات

سے اچھی طرح واقف ہو۔ ہم ان غم آلود قصوں کی جانب نہیں جائیں گے، جن کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے لیکن اتنا میں تمہیں ضرور بتانا پسند کروں گا کہ تمہارے علاوہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی ایک اہم فریضہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہ فریضہ پورا کرنا ہے۔ البتہ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا نوجوان مجھے مل جائے جو تمہارے معیار پر بھی پورا اترے اور میں اسے اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ شاید اس سلسلے میں میرے لئے باعث دلچسپی ہے۔ وہ تنہا ہے اور کوئی بھی نہیں ہے اس کا۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سے تمہاری زندگی کے بارے میں بات چیت کروں؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ڈیڈی نے خود ہی میری مرضی کا تعین کر لیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولے۔

”تو میں یہ سمجھوں کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”میں نے آپ کی کسی بات پر کبھی اعتراض نہیں کیا ڈیڈی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر حامد میری زندگی میں داخل ہو گیا۔ کھلنڈرا اور شوخ سانو جوان۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ زندگی میں محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ کوئی بھی نہیں ہے اس کا، اور میرے مل جانے سے اسے دلی مسرت ہوئی ہے۔ چنانچہ میں خلوص دل سے اس کی شریک زندگی بن گئی۔ میں نے اپنی تمام تر محبت اس پر بھجوا کر دی۔ اور حامد ہم میں کھل مل گیا۔ ڈیڈی نے اسے ہر سہولت فراہم کر دی تھی۔ اب وہ اس فرم کا منجر نہیں بلکہ ایک طرح سے مالک تھا، البتہ ڈیڈی اصول پرست آدمی تھے۔ اخراجات کے معاملے میں وہ ہمیشہ ہی سنجیدہ رہے تھے اور ایک حد پسند کرتے تھے لیکن یہ حد و حامد کو پسند نہیں تھیں۔

”کیسی تکلیف دہ بات ہے فری! ہم لوگ اتنی بڑی دولت اتنی وسیع جائیداد کے مالک ہیں لیکن شادی کے بعد ایک بار بھی اس کا موقع نہیں ملا کہ ملک سے باہر جاتے، دنیا دیکھنے کی میرے دل میں بڑی آرزو ہے کہ

میرے چند خاص آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد سب کچھ تم دونوں کو سونپ دوں گا۔“

”عجیب بات ہے ڈیڈی! آپ اب اسے پرکھ رہے ہیں جب وہ میری تقدیر کا مالک بن چکا ہے۔ میں کہتی ہوں وہ اچھا انسان ہے، کوئی خرابی نہیں ہے اس میں۔ اسے کسی محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔“

”مگر وہ کیا چاہتا ہے؟“

”اسے کوئی حیثیت دی جائے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔“

”تم بھی اس کے ساتھ جاؤ گی؟“

”جی ڈیڈی!“

”اور میں؟“ ڈیڈی نے ورد بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور میں ایک دم خاموش ہو گئی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے خود مرضی کی ہے۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے ڈیڈی!“

”ارے نہیں بھئی! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے تم دونوں گھوم آؤ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”نہیں ڈیڈی! میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“ میں نے کہا تو ڈیڈی ہنسنے لگے۔ بہر حال ڈیڈی نے اسے کچھ اختیارات دیئے اور وہ خوش ہو گیا چند ہفتوں کے بعد اس نے دوبارہ باہر جانے کی ضد شروع کر دی۔

”میں کب منع کرتی ہوں حامد! لیکن ہم ڈیڈی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

”کیا؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، میں ڈیڈی کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔“

”تو پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں

کیا برا ہے؟“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تم ڈیڈی کو نا پسند کرتے ہو حامد؟“

”یہ بات نہیں ہے فری بس ہمیں وہ آزادی

نہیں مل سکے گی۔ بات یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر آج

بھی خود کو ان کا ملازم سمجھتا ہوں اور ان سے بے تکلف

میں ملک ملک کی سیر کروں۔“

”تو ڈیڈی سے بات کرو۔“

”میں بات کروں؟ میں تمہیں ایک بات

بتا دوں فری لیکن شرط یہ ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گی؟“

”کیا بات ہے؟“

”پہلے اس کا وعدہ کرو کہ تم کبیدہ خاطر نہ ہو گی

اور نہ ہی میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار۔“

”چلو وعدہ!“

”تمہارے ڈیڈی نے تمہارے ساتھ میری

شادی کر کے ایک گھر داماد خریدا ہے اور وہی مثالی

روایت قائم کر رہے ہیں جو گھر دامادوں کے ساتھ کی

جاتی ہے۔ میں آج بھی ان کی فرم کا منیجر ہوں اور مجھے وہ

حیثیت حاصل نہیں ہے جو کہ ہونی چاہئے تھی۔“

”تمہیں کہاں اس کا احساس ہوتا ہے حامد؟“

میں نے سوال کیا۔

”ہر جگہ، مجھے بتاؤ تمہارا شوہر ہونے کے باوجود

کسی چیز پر حق ہے؟ میں تو اپنی پسند کی ایک کار بھی نہیں

خرید سکتا۔“

”تم اپنی پسند کی چار کاریں خرید لو حامد۔ میں

تمہیں رقم دوں گی۔“

”تم دو گی نا۔ یہ فرق ہے مجھ میں اور تم میں!“ وہ

تلخی سے مسکرایا۔

”تم ان باتوں کو محسوس مت کرو حامد! میں

ڈیڈی سے بات کروں گی۔“

”نہیں فری! سیری سکی ہو گی۔ تم ان سے کوئی

بات نہ کرنا۔“ اس نے کہا اور میں خاموش ہو گئی لیکن میں

نے بعد میں ڈیڈی سے اس موضوع پر بات کی اور ڈیڈی

مسکرائے لگے۔

”شوہر کی حمایت میں لڑنے آئی ہو مجھ

سے۔ بگلی یہ بتاؤ کہ میں اس دولت کا کیا کروں گا

میرے کس کام آئے گی یہ تم دونوں کے لئے ہی ہے

لیکن کچھ توقف کرو حامد بہت اچھا لڑکا ہے لیکن بہر حال

انجی ہے۔ پہلے اس سے پرکھ لوں یہ کام جاری ہے۔“

نہیں ہو پاتا۔“

”سہر حال جیسا تم پسند کرو۔“

ہم نے باہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ خود ہی ڈیڑی ہمارے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہم دنیا دیکھنے نکل گئے استنبول، روم، پیرس، لندن، سوئٹزر لینڈ اور نہ جانہ کہاں، کہاں ڈیڑی اس دوران مجھے بہت یاد آتے رہے تھے۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، اس کے علاوہ حامد میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔

ایک رات اس نے شراب بھی پی تھی جس پر پہلے تو مجھے حیرت ہوئی اور پھر شدید غصہ آیا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی لیکن میں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ اب اس کے وہ جذبات نہ رہے تھے جو چند روز پہلے تھے۔ وہ مجھ سے کترانے لگا تھا اور اکثر تنہا گھومنے نکل جاتا تھا۔ طرح طرح کے بہانے تراشتا تھا۔ ایک بار مجھے شبہ ہوا تو میں نے اس کا تعاقب کیا اور پہلی بار میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے حامد کو ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں بالآخر ایک ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی اور خاموشی سے واپس آ گئی۔ اس رات حامد ہوٹل سے واپس نہیں آیا تھا۔ رات کو تیز بارش ہوئی تھی اور میں ساری رات ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی خاموش سڑکوں کو گھورتی رہی تھی۔ اس رات مجھے ڈیڑی کی باتیں یاد آئی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے پہلے حامد کو پرکھ لیا جائے اس کے بعد اسے آزادی دی جائے۔ حامد میں آوارگی کے جراثیم تھے۔ وہ چھوٹا انسان تھا۔ ذہنی طور پر چھوٹا تھا اور ذہنی طور پر چھوٹے انسان کو جب دولت مل جاتی ہے تو وہ بہت پست ہو جاتا ہے۔

لیکن تصور ڈیڑی کا بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو انہیں شادی سے قبل سوچنا چاہئے تھا۔ حامد میری پسند تو نہیں تھا، میں نے اس سے محبت تو نہیں کی تھی۔ بس ڈیڑی اسے میرے سامنے لائے اور ایک خاص مقصد کے تحت لائے۔ میں نے ان سے اعتراض نہیں کیا اور وہی کچھ کیا

جوان کی اپنی خواہش تھی لیکن اس خواہش کی تکمیل کے بعد حامد کے بارے میں شک و شبہ کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ تو ان کا فرض تھا کہ وہ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے اس کے بعد فیصلہ کرتے اور حقیقت وہی نکلی۔

حامد اب دولت میں کھیلنے لگا تھا اور یہ دولت اب اس کی آنکھوں پر پردے گرانی جا رہی تھی۔

وہ صبح کو واپس آیا۔ چہرے پر شرمندگی اور گزری ہوئی رات کی محو ست کے آثار منجمد تھے۔ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا پارہا تھا۔ وہ پشیمان سے لہجے میں بولا۔

”مجھے احساس ہے کہ تمہیں بڑی تکلیف ہے یہ رات گزارنی پڑی ہوگی۔ لیکن میں کیا کروں، چند لوگوں سے شناسائی ہوگئی، یہ ہمارے کاروباری بھی ہیں، بس انہوں نے دعوت دے ڈالی تھی۔ پھر اسی دعوت میں تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ اور کچھ ایسی تیز ہوئی کہ میں واپس نہ آ سکا۔“

بڑا گھٹیا سا بہانہ کیا تھا اس نے، لیکن میں اس پر حقیقت منکشف نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا میں نے اسے کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہوں۔ بس میں نے ایک ہی بات کی۔

”حامد ہم واپس چلیں گے۔“

”میرا مقصد ہے ابھی سے، ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے؟“ وہ بولا۔

”حامد ہم واپس چلیں گے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں خاصی برہمی کا اظہار کیا تھا۔

”ابھی تو ہمارے پاس کافی وقت ہے فری! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی دل بھی نہیں بھرا اور تم واپس جانے کی بات کر رہی ہو۔“

”میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے حامد! اگر تم نہیں جانا چاہتے تو تم یہاں رک جاؤ، میں واپس چلی جاتی ہوں۔“ میں نے بدستور سختی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے بھلا، خیر اگر تم واپس ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جانا چاہتی ہو تو میں تیار ہوں۔“ اس نے بے دلی سے کہا اور پھر نہایت بیدلی سے وہ واپس چل پڑا۔

میرا ذہن سپاٹ تھا، کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی، لیکن میں نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ ڈیڈی سے اس بارے میں بات کروں گی اور ان سے کہوں گی۔ ”ڈیڈی حامد کی طرف سے محتاط رہتا ہے حد ضروری ہے۔ وہ اس مزاج کا انسان نہیں ہے جس کا ہم نے سمجھا تھا۔ وہ چھوٹا آدمی ہے اور یقیناً آئندہ بھی وہ چھوٹی حرکتیں کرے گا۔“

گھر واپس پہنچی تو ایک عجیب سا ماحول پایا۔ ملازم سبے سبے تھے اور مجھے دیکھ کر بھونچکے سے ہو گئے تھے پھر ہمارے دو دیرینہ ملازم میرے پاس آ کر رونے لگے اور میں دھک سے رہ گئی۔

”کیا بات ہے؟“

”آپ... آپ... آپ کو نہیں معلوم ہو سکا بی بی!“ فضل بابا نے پوچھا۔

”کیا نہیں معلوم ہو سکا؟“ میں متحیرانہ انداز میں بولی اور فضل کی بھیگی ہوئی آنکھیں مجھے کچھ اور بتانے لگیں۔ میں نے وحشت زدہ انداز میں فضل بابا کو جھنجھوڑ دیا۔ ”کس بارے میں کہہ رہے ہو فضل بابا! بتاتے کیوں نہیں؟“

”صاحب... صاحب...“ فضل بابا گھٹتی ہوئی آواز میں بولے۔

”ہاں کیا ہو گیا صاحب کو؟“

”بی بی! وہ تو آپ کے جانے کے دس دن کے بعد ہی... بس دل کا دورہ پڑا تھا آپ کو یاد کرتے کرتے۔“ فضل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے حواس گم ہو گئے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا کچھ کیا اور کب تک کرتی رہی۔

ہوش آیا تو تنہا تھی بس ملازمین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا میرے پاس۔

حامد بھی نہیں تھا۔ میں نے نقاہت بھرے لہجے میں حامد کے بارے میں پوچھا تو بوا بشیرن نے بتایا کہ

”صاحب تو بہت کم گھر آتے ہیں بس کبھی دن میں آ جاتے ہیں کبھی رات کو دفتری کاموں میں اٹھتے رہتے ہیں۔“

غم والہم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے مجھ پر۔ ڈیڈی نے ساری زندگی مجھے تنہا نہیں چھوڑا تھا، دنیا ترک کر دی تھی انہوں نے میرے لئے، لیکن میں نے نئی زندگی باتے ہی انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی اور میری جدائی وہ برداشت نہ کر سکے، لیکن ڈیڈی کے انتقال کو کتنے دن گزر گئے تھے۔ ہمیں خبر بھی نہ دی گئی حالانکہ بے شمار لوگ موجود تھے۔ ملازم تھے، ہمارے مجھے ان لوگوں پر شدید غصہ آیا۔ میں نے اسی وقت تنویر صاحب کو فون کیا۔ تنویر صاحب ہماری ایک فیکٹری کے نگراں تھے۔ میں نے بچپن سے انہیں دیکھا تھا ڈیڈی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

”تنویر صاحب! میں فری بول رہی ہوں۔“

”کیسی طبیعت ہے فری بیٹی! ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے۔“

”ڈاکٹر اور طبیعت کو جہنم میں جھونکیں مجھے اس بات کا جواب دیں کہ آپ کو ہمارے بارے میں معلوم نہیں تھا؟“

”میں سمجھا نہیں بیٹی؟“

”مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی تھی؟“

”اطلاع؟ وہ تو دے دی گئی تھی۔“ تنویر صاحب تعجب سے بولے۔

”کیسے دے دی گئی تھی؟“

”آپ سوئٹز لینڈ میں تھیں جواب بھی ملا تھا، حامد صاحب کی طرف سے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں تنویر صاحب!“

”جوابی تار میرے پاس موجود ہے فری بیٹی!“

”لے کر انہیں میرے پاس۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ غم و غصے سے میری کیفیت بہت خراب ہو رہی تھی۔ تنویر صاحب اتنا بڑا جھوٹ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

اسماء الحسنی۔۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

پیشانیوں سے چھٹکارہ ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو	جادو چلا نا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد دکانہ ہو یا ہو کر مرجانا
گھریلو ناچاقی	کاروباری بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں بلکہ جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

خواہش کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویذ سے آپ کی اتڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزمائیجئے ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم جو میں کی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ شاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان
سید فرمان شاہ
0300-6484398

تو نہیں بول سکتے تھے لیکن حامد نے یہ بات کیوں چھپائی
 مجھ سے۔ اس نے اتنے عرصہ تک مجھے کچھ نہیں بتایا
 اور پھر خود ہی میں نے اس کا جواب بھی حاصل کر لیا۔

حامد تو رنگِ رلیاں منانے آیا تھا۔ وہ بھلا فوری
واپسی کب پسند کرتا۔ اسے خود بھی تو واپس آنا پڑتا۔

تویر صاحب نے حامد کا جواب میرے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ” سخت غم ہوا۔ فری نڈ حال ہے۔ ابھی اسے واپس لانا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے پہلانے کے لئے رکنا ضروری ہے۔ آپ تمام امور کی نگرانی کریں۔“ حامد۔

”فری حاد! کہاں ہے وہ؟ وہ کہاں ہے
تنویر صاحب؟“

”معلوم نہیں مینی اوہ بہت کم نظر آتے ہیں۔
تمام کام ان دنوں ان کا سیکرٹری جمال دیکھ رہا ہے۔
بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں حامد صاحب کے بغیر۔“
صاحب نے جواب دیا۔

یا قاعدہ نظر نہیں آتا، پھر کہاں رہتا ہے؟“
”خدا جانے۔“

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ حامد کی فطرت سے واقف ہو گئی تھی ورنہ خوش فہمیوں کا شکار رہتی۔ تنویر صاحب کے جانے کے بعد نہ جانے کب تک سوچتی رہی۔ پھر ملازموں کو بلا کر حامد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔

بہر حال اس شام وہ واپس آ گیا۔ مجھے ہوش
وحواس میں دیکھ کر اس نے کسی خاص جذبے کا اظہار
نہیں کیا تھا۔ بس یونہی رسی طور پر طبیعت پوچھ لی۔ لیکن
میں نے تار اس کے سامنے رکھ دیا۔

”تم نے مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی حاتم؟“

”اوہ... یہ یہ کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“

”یہ جواب ہے تمہارا؟“

”نہیں، بس پوچھ رہا ہوں۔ میری ہمت نہیں
پڑی تھی فری! یہ غم ناک خبر میں تمہیں نہ سنا سکا۔ تمہیں
صد مہ ہوتا۔“

”ڈیڈی مر چکے تھے اور ہم رگم رلیاں مناتے پھر رہے تھے۔“ میں نے کہا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے حامد کہ تمہاری تقریحات ترک ہو جائیں۔ تمہیں واپس آنا پڑتا۔ اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟“

”تمہیں میری نیک نیتی پر شک نہیں کرنا چاہئے
فری!“

”میں جانتی ہوں تم کتنے نیک نیت ہو۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے فری! لیکن میری طرف سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ لوگ تمہیں بہکا رہے ہیں، تمہاری صحت پہلے ہی خراب ہے۔“

”کتنے دن کے بعد گھر آئے ہو؟“ میں نے طنز سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولا۔
”میری صحت کی طرف سے بہت فکر مند لگتے
ہو۔“ میں بدستور طنز یہ انداز میں بولی۔

فری میں سمجھ گیا ہوں، میں جان گیا ہوں کہ کون تمہیں میرے خلاف بھڑکار رہا ہے لیکن فری ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ گھر کے ملازمین اور دفاتروں میں کام کرنے والے طبقے گھسیا ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں صرف ایک بات ہوتی ہے کہ مالکان کی ہمدردیاں حاصل کریں اور اپنا مالی مفاد پورا کریں۔ تنویر صاحب بھی اس قسم کے لوگوں میں سے ہیں۔ اب میرا تجربہ اتنا بھی محدود نہیں ہے کہ میں انسانوں کے بارے میں اندازہ نہ لگا سکوں۔ یہ تارانیہوں نے محفوظ رکھا اور بالآخر تم تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ پر غور کیا تم نے؟ وہ صرف تمہاری توجہ چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ تم ان کی ہمدردی پر غور کرو، ان پر بھروسہ کرو۔ اس کے بعد وہ اپنے مسائل تمہارے سامنے لائیں گے اور ظاہر ہے اس

کے بعد تم اپنے ہمدردوں کے بارے میں نہ سوچو گی تو کس کے بارے میں سوچو گی۔ یہ لوگ میری طرف سے تمہیں بہت زیادہ بہکا دیں گے چونکہ اسی میں ان کی جیت ہے۔“

”نہیں حامد صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے تنویر صاحب کو یہ بھی لکھ دیا تھا کہ آپ نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ میں نے چہچہتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اور حامد لا جواب ہو گیا، ظاہر ہے بے چارے تنویر صاحب کو یہ بات کیا معلوم تھی کہ حامد نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اس لئے حامد کا یہ اعتراض خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

”بہر صورت۔“ حامد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں محسوس کر رہا ہوں فری کے میرے لئے حالات بہت نامساعد گارہوتے جارہے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ شروع سے لے کر اب تک میں صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ڈیڈی مرحوم نے مجھے ایک تنہا آدمی پایا اپنی بیٹی کے لئے ایک گھر داماد حاصل کر لیا۔ یہ سوچ کر کہ میں ان کا دست نگر رہوں گا اور ان کے احکامات پر عمل کرتا رہوں گا۔ انتقال ہو گیا ان کا تو ساری دولت اور ساری جائیداد وہ تمہارے نام کر گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ میں ایک اجنبی شخص ہوں اور اسی طرح ان کی بیٹی کا غلام بن کر رہ سکتا ہوں کہ اس کا دست نگر رہوں مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے فری!“

لیکن ایک حقیقت میں تمہارے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکا جو مجھے ملنی چاہئے تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہارے گھر میں صرف ایک ڈمی ہوں اور ڈمی بن کر انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ تم اپنے ملازمین سے رابطہ رکھو، ان سے دوستیاں کرو۔ جو کچھ وہ کہیں اس پر غور کرتی رہو مجھے ذلیل و رسوا سمجھو میں تمہیں اس سے نہیں روک سکتا۔“

حامد یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور میں اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں اس مکار آدمی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی، فرانس میں اگر میں اسے اس انداز میں نے دیکھ لیتی تو شاید یہی سمجھتی کہ حامد کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لیکن جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اور اس کے بعد میں کسی حماقت کی شکار نہیں ہو سکتی تھی۔ حامد پر قابو رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اس کی لگا میں کھینچے رکھوں اور لگام کو کبھی ڈھیلا نہ ہونے دوں۔

یہ بات اس سے قبل مجھے نہیں معلوم تھی کہ ڈیڈی جائیداد کے بارے میں کوئی وصیت نامہ چھوڑ گئے ہیں نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی میری تو حالت ہی درست نہیں تھی لیکن حامد یہ بات بھی مجھے بتا گیا تھا۔ یقیناً اسے ان ساری چیزوں سے دلچسپی ہو گی۔ ڈیڈی کی بات نہ مان کر میں نے شدید نقصان اٹھایا تھا۔

اگر حامد کو باہر کی دنیا کی ہوائ لگتی تو وہ انسان ہی رہتا لیکن میں نے اس کی اصلی تصویر دیکھ لی تھی۔ اور اب میں شاید اس پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ جواب سے پہلے مجھے اس کی ذات پر تھا چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ ڈیڈی کر گئے ہیں اب اس سے قطعاً انحراف نہ ہوگا۔

حامد حسب معمول اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ میں اسے کسی بات کا پابند نہیں کر سکتی تھی۔ جب دل چاہتا وہ گھر آ جاتا۔ جب دل چاہتا چلا جاتا۔ ابتدا میں، میں نے اس سے پوچھا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ پاسکی۔ کئی بار اس نے مجھ سے بڑی بڑی رئیس وصول کی تھیں۔ اس کے علاوہ دفتر سے بھی وہ رئیس حاصل کرتا رہتا تھا۔ جس کی اطلاع مجھے مل جاتی تھی۔ لیکن میں چشم پوشی کرتی رہی۔ البتہ اس دن میں خود پر قابو نہ رکھ سکی جب مجھے حامد کی دوسری شادی کی خبر ملی۔ حامد نے ایک اور شادی کر لی تھی، نہ جانے کب۔ ممکن ہے مجھ سے شادی سے قبل ہی وہ شادی شدہ ہو۔ اس جیسے شخص کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ یہ خبر

مجھے ایک بالکل غیر متعلق آدمی سے ملی تھی۔ یہ ایک اسٹیٹ بروکر تھا۔ جو حامد سے ملاقات کے لئے آیا تھا، حامد نے اپنی بیوی کے لئے ایک بنگلہ خریدا تھا۔ اس کے کاغذات کی تکمیل کے لئے بروکر یہاں آ گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی حامد کی بیوی ہوں۔ لیکن چند ایسی باتیں ہوئیں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ حامد نے یہ بنگلہ اپنے بیٹے کے نام سے خریدا ہے، کامران حامد یہ اس کے بیٹے کا نام تھا۔ اسی بات سے میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے مجھ سے قبل ہی وہ شادی شدہ ہو۔

غم و غصے سے میں پاگل ہو گئی۔ حامد آیا تو میں طوفان بنی بیٹھی تھی جو اسے دیکھتے ہی بھڑک گیا۔

”تم پہلے سے شادی شدہ ہو حامد یا میری تقدیر پھوٹنے کے بعد تم نے یہ شادی کی تھی؟“ جواب دو حامد!“ اور حامد کا چہرہ اتر گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا لیکن پھر سنبھل گیا۔

”تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے؟“

”مجھے میری بات کا جواب دو حامد! مجھے صرف جواب دیکار ہے۔“

”وقت آ گیا ہے فری کہ میں تم پر اپنی حقیقت کھول دوں۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔ اتنی وسیع کہ اگر میں تمہیں حقیقت حال سے روشناس نہ کر دوں تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ آؤ فری! براہ کرم اس وقت تک کے لئے برے خیالات ذہن سے نکال دو جب تک تم پر میری حقیقت واضح نہ ہو جائے۔ آؤ میں اس سے قبل تم سے کچھ نہ کہوں گا۔“

”کچھ ایسی اداکاری کی تھی اس نے کہ میں بے وقوف بن گئی میں اس اسرار کو جاننے کی خواہاں ہو گئی جس کے بارے میں حامد نے کہا تھا اور حامد مجھے اپنی کار میں لے آیا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور میرے استفسار کے باوجود خاموش رہا تھا۔ بس اس نے ایک جملہ کہا تھا۔ ”چند لمحات توقف کرو فری! تم پر تمام حقیقتیں عیاں ہو جائیں گی۔“

میں اس کا فریب نہیں سمجھتی تھی اور تحسرس میں ذہنی میں یہاں تک آ گئی تھی۔ آخری وقت تک میں اس کی چال نہ سمجھتی۔ مجھے تو اس وقت احساس ہوا جب حامد نے مجھے اس پہاڑ کی چوٹی سے نیچے ٹھکلیل دیا تھا۔

میں گہرائیوں میں جا رہی تھی لیکن شاید میری روح نیچے پہنچنے سے قبل ہی بدن کی قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ میں نیچے گرتے بدن کو دیکھ رہی تھی اور میرا دل چاہا تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لپک لوں لیکن ان نادیدہ ہاتھوں میں اتنی قوت نہیں تھی۔ میرا بدن پانی میں آگرا اور یہاں لگی ہوئی جھاڑیوں میں اٹک گیا۔ یہ جھاڑیاں اب یہاں نہیں ہیں پہلے تھیں۔ میرا وجود بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں ہر فکر سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک میں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا کوئی خیال ہی نہیں آیا مجھے۔ لیکن جی اس وقت نہ جانے کیوں مجھے سب یاد آ رہا ہے۔۔۔ یہ سب کچھ۔“

ہمیشہ شرارتوں پر آمادہ رہنے والا جی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”آؤ دیکھیں فری! اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں دیکھو تو کسی! پتہ تو چلے کہ حامد اب کس حال میں ہے۔“

دو دن میرے دل میں بھی حامد کو دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھی اور اس بار میں تیار ہو گئی۔ اسی میرے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔

”ہم اس تک کیسے پہنچ سکیں گے جی؟“

”ہمارے لئے کیا مشکل ہے۔ چلتی رہو میرے ساتھ۔ میں تمہیں حامد کی رہائش گاہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں گا۔ چلتی رہو۔“

یہ وہ گھر نہیں تھا جہاں میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی کوئی نئی جگہ تھی۔ لیکن بے حد خوبصورت پہلی کونٹھی سے ہزار درجے حسین اور کشادہ۔ سامنے کی سمت بڑا لان تھا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جو ملازمین کے لئے تھے۔ مالکان کے

جسے کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔ ملازم ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ خوب چہل چل تھی۔
جی ایک گھنے درخت کی شاخ پر ان جالیکا۔ ”اب تم جانو تمہارا کام۔ یہ دنیا تمہاری ہے۔“
اس نے کہا۔

”یہ حامد کی کوٹھی ہے۔ مگر حامد کہاں ہے؟“
”تلاش کرو۔“ منقوس جی پھر فس پڑا۔ اس کی ہنسنے کی عادت بھلا کہاں جاسکتی تھی۔ میں اس اجنبی ماحول میں حیران تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں کیا کروں۔ بہر حال وہاں سے آگے بڑھ گئی اور اصل رہائش گاہ کی عقیبت تکل آئی۔ اس سست ایک اور عمارت بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی عمارت جو الگ تھلگ تھی۔ اس کا بڑا سا دروازہ بند تھا مجھے حامد کی تلاش تھی۔
حامد کہاں ہے؟

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے کچھ لوگ اس طرف آتے نظر آئے۔ وہ اچانک گھوم کر سامنے آ گئے تھے اس لئے میں خود کو ان سے چھپا بھی نہیں سکی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور انہیں میں حامد بھی تھا۔ خوبصورت، خوب رو حامد جو پہلے سے زیادہ حسین، پہلے سے زیادہ جوان نظر آ رہا تھا میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ آہ! کس قدر خوبصورت لگ رہا تھا وہ۔
ان لوگوں نے مجھے دیکھا اور ٹھنک گئے۔
پھر آگے بڑھ آئے۔

”آپ۔۔۔ آپ شاید بھٹک کر ادھر آ گئی ہیں خاتون۔ ملازموں نے آپ کو کاغذ نہیں کیا، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ حامد نے معصومیت سے پوچھا۔
میں بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا کج بخت کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں فری ہوں۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ حامد نے پھر پوچھا۔

”کسی سے نہیں، بس یوں ہی آ گئی تھی۔“
میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”یوں ہی؟“ حامد حیرانی سے بولا۔
”تم حامد ہوتا؟“ میں نے تلخ مسکراہٹ سے پوچھا اور حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
”کامران حامد۔۔۔ حامد میرے والد کا نام ہے۔“ اس نے جواب دیا اور میں چونک پڑی۔ مجھ سے بھی تو حماقت ہوئی تھی۔ بھول ہی گئی تھی کوئی آج کی بات تھی۔ سا لہا سال بیت گئے تھے۔ طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ میں نہیں بدلتی تھی لیکن حامد تو بدل گیا ہوگا۔ بوڑھا ہو گیا ہوگا، پچیس سال کم تو نہیں ہوتے۔ تو یہ حامد کا بیٹا کامران ہے۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، پھر کامران نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“
”میں۔۔۔ میں آپ کے والد سے ملنا چاہتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ! خاتون شاید آپ کو میرے والد کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔“ کامران نے کہا۔
”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بیمار ہیں، شدید بیمار۔۔۔ نی بی ہے انہیں، دونوں پیچھے کھل چکے ہیں، ہر وقت خون تھوکتے ہیں، وراصل انہوں نے اپنی صحت اپنے ہاتھوں تباہ کی ہے۔ شراب کی زیادتی۔ اور اب بھی باز نہیں آتے۔“
نوجوان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”تو وہ کسی اسپتال میں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”جی نہیں گھر پر ہیں، موت کا انتظار کر رہے ہیں۔“ نوجوان نے کہا۔

”میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اپنی دشمن ہیں آپ؟“

”کیوں؟“ میں نے کہا۔

”ان کا مرض شدت اختیار کر چکا ہے۔“

ڈاکٹروں نے ہدایت کر دی ہے کہ ان سے قطعاً دور رہا جائے، ورنہ کوئی بھی اس مرض کا شکار ہو سکتا ہے۔“

”ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا آپ نے انہیں؟“

”ہسپتال..... وہ انہیں موت گھر کہتے ہیں۔“

موت سے انہیں شدید خوف محسوس ہوتا ہے، ان کا خیال

ہے کہ ہسپتال میں انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کئی بار انہیں

ہسپتال اور سنی ٹوریم بھیجا لیکن بھاگ آتے ہیں وہاں

سے۔ بس یہ بوڑھے لوگ بعض اوقات اولاد کے لئے

درد سہین جاتے ہیں لاپرواہ ہو جاؤ تو زمانہ اخلاقیات

کے لاکھوں سبق دہرا دے گا لیکن.....“

میرے ذہنوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حامد کا بیٹا

بول رہا تھا۔ حامد کا گناہ بول رہا تھا۔ یہ حامد کی حیثیت تھی

اس گھر میں جو میری دولت غصب کر کے حاصل

کیا گیا تھا۔ ان کے لئے حامد نے مجھے قتل کیا تھا اسے

اس کے کئے کی سزا تو ملنی ہی چاہئے تھی۔ قدرت کسی

ظالم کو اس طرح تو نہیں چھوڑ دیتی۔ مجھے انوکھا سکون

محسوس ہوا۔

”تو حامد کی تمہاری کون کرتا ہے؟“

”بس ایک بڑے میاں ہیں ہمارے پرانے

ملازم۔ بچپن سے ساتھ ہیں۔ دونوں بوڑھے موت کے

خطرہ ہیں۔“ کامران مسکرا کر بولا۔

”کہاں ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا۔ اور کامران

نے اس الگ تھلگ عمارت کی طرف اشارہ کر دیا

جو میرے عقب میں تھی۔

”وہاں..... شاید ڈیڈی نے یہ عمارت اسی لئے

تعمیر کرائی تھی اور کوئی مصرف تو نہیں ہو سکتا اس کا۔“

مگر خاتون! میں نے آپ کے سوالات کے جواب تو

دے دیئے اب میری باری ہے، اپنے بارے میں تو کچھ

بتائیں۔ آپ، آپ کا محل وقوع کیا ہے؟“

”میں؟“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

جھوٹ ہی بولا جاسکتا تھا ان سب سے حقیقتوں

کو برداشت کرنے کی ہمت کہاں ہوگی ان میں چنانچہ

میں نے کہا۔ ”میں ایک ستم رسیدہ ہوں، بے حد

بد نصیب۔ یورپ میں رہتی تھی۔ میرے والد صاحب

حامد صاحب کے دوست تھے۔ ان کے سوا میرا کوئی نہیں

تھا اس جہاں میں۔ لاکھوں روپے کی دولت کی وارث

ہوں لیکن اس جہاں میں یک و تنہا ہوں، اپنوں کے لئے

ترستی ہوں۔ مرتے ہوئے والد صاحب نے کہا تھا کہ

ان کے دوست حامد کے پاس چلی جاؤں۔ نہ جانے کتنی

دقتوں کے بعد یہاں تک آئی ہوں لیکن اب..... اب کیا

کروں۔“

کامران کے چہرے پر ہمدردی کے آثار پھیل

گئے۔ وہ بڑی اپنائیت سے آگے بڑھ کر بولا۔ ”تو اس

میں پریشانی کی کیا بات ہے آپ صحیح جگہ پہنچ گئیں بس

اتنا ہی کافی ہے کہ آپ یہاں تک آ گئیں۔ ہم سب

آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“ پھر کامران نے اپنی

ساکھی لڑکیوں سے میرا تعارف کرایا۔

”یہ میری بہن عذرا حامد ہے، یہ نہیں حامد اور یہ

خواتین ان دونوں لڑکیوں کی سہیلیاں ہیں اور آپ.....“

”اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں اس

جھرمٹ میں ایک نام بھی گھڑ چکی تھی۔

”میرا نام ماریا ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ماریا۔“

کامران نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”اور خاص طور سے اب

آپ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ آئیے میں آپ کو مکی سے

ملاؤں۔ مگر یوں کریں۔ عذرا تم گیسٹ روم کھلوادو۔ مس

ماریا کو پہلے غسل وغیرہ سے فارغ ہونے دیں۔ اس کے

بعد انہیں مکی سے ملائیں گے۔ جاؤ کوئی تکلیف نہ ہو مس

ماریا کو۔“

”آئیے۔“ عذرا نامی لڑکی نے کہا جو کامران کی

بہن تھی۔ اور میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

جی کا تہقبہ پھر میرے کانوں میں ابھرا تھا۔ یہ

شریر شخص تو میری اس حرکت سے بہت خوش ہوا ہوگا۔

میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔

لیڈیز گیسٹ روم اس کوٹھی کے شایان شان تھا۔

عذرا مجھے ایک خوبصورت کمرے میں چھوڑ گئی اس نے

میرے سامان کے بارے میں پوچھا۔

”بس بے سرو سامانی کی حالت میں ہوں۔“

دوسرا کوئی لباس بھی ساتھ نہیں لاسکی۔

”کیا ہرج ہے۔ میرے کپڑے آپ کے لئے بالکل درست ہوں گے۔“ اس نے کہا اور مجھے لباس مہیا کر دیئے گئے۔ میں ہاتھ روم میں داخل ہو گئی۔ بدن کی کشافیت نے میرے ذہن میں بھی فوری تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں اور میرے اندر سے خواہشات بیدار ہو گئی تھیں چنانچہ میں نے ایک عمدہ لباس پہنا۔ چہرہ اور بال درست کئے اور جب باہر آئی تو عذرا میری منتظر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے لگی۔

”بہت خوبصورت ہیں آپ کس ماریا۔“

”شکر یہ۔“

”یورپ میں آپ کہاں مقیم تھیں؟“

”فرانس میں۔“

”اس کے باوجود آپ بے حد سادہ ہیں۔ آئیے آپ کو می کے پاس لے چلوں سب لوگ وہاں آپ کے منتظر ہیں۔“

”کیا آپ نے اپنی می کو میرے بارے میں بتا دیا؟“

”ہاں کامران بھیانے تو نہ جانے کیا کیا کہا ہے می سے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انہیں آپ کے آنے کی اطلاع تھی۔ ایک بات عرض کر دوں آپ سے۔“ عذرا بولی۔

”جی۔“

”مئی دولت پسند ہیں ان سے اپنی امارات کے خوب تذکرے کریں وہ آپ سے بہت خوش ہوں گی، دیکھئے ہر انسان کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ آپ محسوس نہ کریں۔“

”کوئی بات نہیں ہے آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور پھر میں نے اپنی سوکن کو دیکھا۔ اس عورت کو جس کی خاطر حامد نے مجھے قتل کر دیا تھا۔ کسی دور میں بے شک حسین ہوگی اب تو کھنڈرات باقی تھے جن میں اس نے چراغاں کر رکھا تھا۔

اس نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میک اپ سے لتھڑی ہوئی تھی مجھے اس کے سینے سے لگ

کر سخت کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے دل جوئی کے بے شمار کلمات کہے۔ اور مجھے تسلیاں دیتی رہی کہ میں کوئی فکر نہ کروں یہ میرا خاندان ہے۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے میرے بارے میں بھی پوچھتی جا رہی تھی اور میں مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن میرا ہر جھوٹ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھاتا تھا۔

یہاں میری بڑی خاطر مدارت ہوئی۔ کافی رات گزرے مجھے ان لوگوں سے چھٹکارا ملا تھا اور عذرا مجھے میرے خواب گاہ میں پہنچا گئی تھی۔ اندر داخل ہو کر مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ میں کس چکر میں پڑ گئی تھی۔ میری روح پر جھوٹ کے انبار لگتے جا رہے تھے اور میں بو جھل ہوتی جا رہی تھی دل چاہ رہا تھا یہاں سے بھاگ نکلوں میری اپنی دنیا کس قدر پرسکون ہے۔ کوئی جھوٹ، کوئی فریب، کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

جی ایک روشن دان سے اندر داخل ہو گیا اور میں غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”اب بولو کیا کروں؟“

”کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”بہت برا۔ میں خوش نہیں ہوں۔“

”مرزندہ انسان ناخوش ہے، بے سکون ہے سکون صرف ہماری دنیا میں ہے۔ زندگی اور سکون دو مختلف چیزیں ہیں۔“

”بدن کا بوجھ، التعداد کشافیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جب زندہ تھی تو اتنا غور نہیں کیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے حسد، جلن، فریب نہ جانے کون کون سے جذبے چھپے ہوئے ہیں ہڈیوں کے اس خول میں۔ وہ عورت میری سوکن ہے دل چاہتا ہے اس کا خون پی جاؤں۔ میری دولت پر عیش کر رہی ہے ورنہ حامد کے پاس کیا تھا۔“

”حامد سے ملاقات ہوئی؟“

”نہیں، لیکن سنا ہے اس کی بری حالت ہے۔“

”لو اس سے۔ کیا تمہارے دل میں اس کے لئے ہمدردی ابھرتی ہے۔“

اور میں حامد سے ملی۔ وہ بولا "تم کون ہو؟"
 "بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں ہے حامد
 ! میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔ اس
 قدر خوف زدہ کیوں ہو؟" میں نے طنزیہ انداز میں
 مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔ "لیکن تمہارا خوف بھی
 ٹھیک ہی ہے ہر مجرم بزدل ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی آخری
 سانس تک اپنے جرم کو فراموش نہیں کر سکتا۔ شاید یقیناً
 تمہاری بھی یہی کیفیت ہوگی۔ اس طرح تو تم اپنے
 خوف میں حق بجانب ہو۔"

"ت..... تو..... تم میرا دہم نہیں ہو سکتیں۔
 تمہارے خدو خال تمہاری شکل تمہاری آواز سب کچھ
 وہی ہے۔ سب کچھ وہی۔"

"اگر تمہیں اس قدر اعتماد ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو
 میں مان لیتی ہوں کہ میں فری ہوں۔"

"مگر تم..... تم زندہ کیسے ہو گئیں؟ تمہاری یہ
 شکل صورت! تم بوڑھی بھی نہیں ہوئیں۔"

"مرنے والے اپنی جگہ رک جاتے ہیں حامد
 ! پھر ان کی عمر نہیں بڑھتی۔ میری عمر وہی ہے جس عمر میں
 تم نے مجھے اس دنیا سے رخصت کر دیا تھا۔"

"ت..... ت..... تو تم روح ہو، بدروح ہو؟"
 "بدروح۔" میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ

پھیل گئی۔ "ہاں تم مجھے ایک بدی روح کہہ سکتے
 ہو اور تمہارے اندر جو روح موجود ہے وہ یقیناً نیکیوں کی

جانب راغب ہوگی، کیا خیال ہے حامد! کیسی پائی یہ جرم
 کی زندگی تم نے؟ میں تمہارے اہل خاندان سے بھی مل

چکی ہوں۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں
 معلومات حاصل کیں ہیں اور محسوس کیا ہے کہ سب تم

سے نفرت کرتے ہیں کوئی تمہارے پاس پہنچنے
 کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ تم ٹی بی کے آخری اسٹیج کے

مریض ہو۔ تمہارے بیٹے تمہاری بیٹیاں، کوئی بھی تمہارا
 نام محبت سے نہیں لیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں نا حامد جن کے

لئے تم نے مجھے اس دنیا کو چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ تم
 نے مجھے اس عمر میں قتل کر دیا تھا حامد، جس عمر کو اسٹلوں کی

عمر کہا جاتا ہے۔ کچھ ملا تمہیں اس قتل کے بعد۔ میری
 دولت سے تم نے ان لوگوں کو عیش کرا دیے، کیا خیال
 ہے یہ دولت تمہارے بھی کسی کام آئی؟ کیسا پایا حامد تم
 نے اس دنیا کو؟"

"تم..... ت..... تو..... آہ..... تم..... آہ یہ
 نہیں ہو سکتا یہ نہیں ہو سکتا، تم مجھے خوف زدہ نہیں
 کر سکتیں فری..... آخر تم بچپن سال کے بعد میرے
 پاس کیوں آ گئیں؟"

"پس دل چاہا تھا کہ جا کر تمہاری حالت تمہاری
 کیفیت دیکھوں، تم نے میرے باپ کی موت سے مجھے
 بے خبر رکھا، اس باپ کی موت سے جس نے مجھے ماں
 بن کر پالا تھا۔"

"بتاؤ کیا انتقام لوگی مجھ سے، بولو۔ جواب دو۔"
 اس نے کہا۔

"جب میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی
 تو میں نے تمہیں دیکھا، جان، خوبصورت پہلے سے

زیادہ دیدہ زیب، پہلے سے زیادہ دلکش۔ اور میں نے
 تمہیں حامد کہہ کر مخاطب کیا۔ لیکن حامد وہ تم نہیں تھے۔"

"پھر..... پھر کون تھا وہ؟"
 "تمہارا بیٹا کامران۔ تمہارا ہم شکل۔"

بالکل تمہاری طرح....." میں نے مسکرا کر کہا پھر بولی۔
 "لیکن میں اسے حامد سمجھ لوں گی۔ میں اسے حامد بنالوں

گی۔ میں اسے اپنے پیار کے جال میں پھانس لوں گی
 میں اسے زندہ درگور کر دوں گی اور! یہ سب تمہاری زندگی

میں ہوگا۔ یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا، کیا خیال
 ہے، کیسی ترکیب ہے یہ؟"

"آہ! نہیں..... خدا کے لئے نہیں..... ایسا مت
 کرنا۔ میری زندگی چند روزہ ہے۔ میں تو یونہی لب

گور ہوں۔ میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔"
 زندگی کی ہر خوشی تیج دی تھی، اپنا سکون اور آرام

حرام کر لیا تھا۔ تم نے مجھے اس شفیق باپ کی موت سے
 لاعلم رکھا۔ اپنی خود غرضی کی بنا پر، اور اس کے بعد تم نے

ایک اور عورت کے لئے مجھے بھی ہلاک کر دیا۔ میرا کیا

تصور تھا، مجھے جواب دو۔ کیا میں تم سے انتقام لینے میں حق بجانب نہیں ہوں؟“

”انتقام!“ حامد اچھل پڑا۔ ”تو تم... تو تم مجھ سے انتقام لوگی، کیا تم مجھے ہلاک کر دو گی؟“

”ارے نہیں۔۔۔“ میں ہنس پڑی۔ ”تم تو دیسے ہی نیم مردہ ہو تمہیں ہلاک کرنے سے کیا فائدہ اور پھر کسی کو موت کے حوالے کر دینا تو اس کے ساتھ رحم اور ہمدردی ہے، یہ دنیا، یہ زندگی، جس قدر ناپائیدار اور جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا تمہیں پورا پورا احساس ہوگا۔ تمہیں اس زندگی سے نجات دلانے کا مقصد تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی کی گئی۔۔۔ ہاں! میں تمہارے کرب میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتی ہوں حامد، اور یہی میرا انتقام ہوگا۔“

”اوہ! تم کیا کرو گی، مجھے بتاؤ تم کیا کرو گی؟“

حامد نے لرزاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں۔۔۔ اب سے پہلے تو میرے ذہن میں کوئی۔۔۔ ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا لیکن اچانک ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں اور بڑا ہی دلچسپ و شگفتہ ہوگا یہ۔ کیا خیال ہے اس بارے میں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے حامد سے پوچھا۔

”کاش! اس سے اچھی کوئی ترکیب میرے ذہن میں آسکتی۔ کاش میں تمہیں اس سے زیادہ اذیت دے سکتی! میں تو پھر بھی تمہارے مقابلے میں رحم دل ہوں تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ جواب دو۔ تم نے کیا کیا تھا۔ پہلے مجھے وحشی اذیتیں دیں پھر اس وقت موت کے منہ میں دھکیل دیا جب میں نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا اس دنیا میں۔ بولو تم نے یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں کیا تھا؟“

”مجھے معاف کر دو فری! مجھے معاف کر دو۔ میں مریض ہوں میں زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہوں۔ میں چند روز کا اور مہمان ہوں اس دنیا میں، مجھے یہ اذیت نہ دو۔“

”مجھے تم سے نفرت ہے، بے پناہ نفرت۔ تم مجھ

سے معافی مانگ رہے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں۔ یہ سب کچھ جس پر یہ لوگ عیش کر رہے ہیں میرا ہے، یہ زندگی تو میری تھی لیکن اب یہ سب۔۔۔ تم اس سے بھی کڑی سزا کے مستحق ہو کاش کوئی اس سے اچھی ترکیب میرے ذہن میں آ جاتی۔ بس اتنا ہی بتانا تھا تمہیں۔ چلتی ہوں۔۔۔“ میں نے کہا۔

”معاف کر دو فری! معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“ وہ چیختا رہا اور میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ میں بے حد مسرور تھی۔ حامد کی یہ کیفیت میرے لئے بہت مسرور کن تھی۔ اس شخص نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے عوض یہ انتقام بہت پاک تھا۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے میری دولت، میری زندگی چھین کر دوسروں کے قبضے میں دے دی تھی اور میں بس اسے معاف کر دیتی۔ ناممکن تھا، قطعی ناممکن تھا۔

ملازم فضل و فائز میں بھار ہا تھا۔ وہ بے چارا اب کسی قابل نہیں رہا تھا۔ میں اس کے سامنے سے گزر کر چلی آئی لیکن اسے یہ بھی نہیں چل سکا۔

عمارت سے باہر نکلی تو کامران نظر آ گیا۔ اسی طرف آ رہا تھا مجھے دیکھ کر ٹھنک گیا اور پھر تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ ”آپ۔ آپ۔ آپ ڈیڈی سے ملنے گئی تھیں بل لیں آپ ان سے؟“

”ہاں۔“

”آپ کو ہماری باتوں سے خوف نہیں محسوس ہوا؟“

”خوف!“

”ڈیڈی کا مرض چھوت کا مرض ہے۔“

”میں ان باتوں پر بھروسہ نہیں کرتی۔“

”میں بھی نہیں کرتا، بس مئی کے احکامات ہیں کہ

کوئی ان کے قریب نہ جائے، کوئی ان سے نہ ملے۔“

”اوہ کامران کیا آپ کی مئی حامد صاحب سے

نفرت کرتی ہیں؟“

”یہ بات نہیں۔ بس مئی نفاست پسند ہیں اور حفظان صحت کے اصولوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ آئیے اس درخت کے نیچے بیٹھیں گے۔“ کامران نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ چل پڑی قرب و جوار کا ماحول بے حد خوبصورت تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کامران بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”اگر مئی حفظان صحت کے اصولوں کا خیال رکھتی ہیں تو حامد صاحب کی یہ حالت کیسے ہوئی، ان پر توجہ کیوں نہیں دی گئی؟“

کامران کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”چھوڑیے مس مار یا! آپ کہاں ان الجھنوں میں پڑ گئیں۔ میں آپ کو بہت جگہ تلاش کر کے اس طرف نکل آیا تھا۔ بس یوں ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں آپ اس طرف نہ نکل آئی ہوں۔“

”حامد صاحب میرے ڈیڈی کے دوست ہیں مجھے ان سے ہمدردی ہے۔“

”ڈیڈی اپنی فطرت کے شکار ہوئے ہیں مئی کی ان کی طرف سے بے توجہی بلا وجہ نہیں ہے۔“

”تم سب لوگ بہت اچھے ہو کامران مجھے تم نے بڑی اپناہٹ بخشی ہے اس لئے میں اس گھر کے معاملات سے پوری پوری دل چسپی رکھتی ہوں مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟“

”ڈیڈی کبھی اس گھر سے غفلت نہیں رہے۔ ضدی اور ہمیش پرست، شراب اور عورت ان کی زندگی رہی۔ یہ بیماری بھی ان کی ہمیش کوشیوں کا شاخسانہ ہے۔ مئی نے ہمیشہ انہیں ان تمام چیزوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی کسی کی بات مانی۔“

”وہ اب بھی شراب نوشی کرتے ہیں؟“

”ہاں، اب بھی۔“

”کوئی غم تو نہیں ہے انہیں؟“

”نہیں مس مار یا! وہ غم پالنے والے لوگوں میں

سے نہیں ہیں۔“

”تم لوگ بھی ان سے ہمدردی نہیں رکھتے؟“

”حالات ہی ایسے رہے ہیں مس مار یا! انہوں نے ہمیں کبھی خود سے قریب نہیں ہونے دیا۔ ہم ہمیشہ ان کی محبت سے محروم رہے ہیں اس لئے اب ہم بھی اس کے عادی ہیں۔“

”کیا نشے کے عالم میں ان کی ذہنی کیفیت کچھ خراب ہو جاتی ہے۔“

”کبھی غور نہیں کیا۔۔۔ کیوں؟“

”اس وقت بھی وہ حواس میں نہیں تھے۔“ میں نے پیش بندی شروع کر دی۔

”اوہ! آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟“ کامران نے چونک کر پوچھا۔

”وہ مجھے نہیں پہچان سکے کہنے لگے۔“ ان کا کوئی دوست نہیں ہے میں تجوٹ بول رہی ہوں، بے وقوف بنارہی ہوں سب کو، میں بدروح ہوں۔ میں فری ہوں۔ یہ فری کیا ہے کامران؟“ میں نے غور سے کامران کو دیکھا اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی لیکن دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر کہا۔

”ان کے ذہن کی اختراع ہوگی ویسے ان کی یہ کیفیت نئی ہے بہر حال مس مار یا! براہ کرم ان کے لئے پریشان نہ ہوں، یہ بتائیں آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”آپ جیسے غفلت لوگوں کی موجودگی میں مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ بہت خوبصورت کوٹھی ہے آپ کی۔“

”اگر آپ کو پسند آگئی ہے تو واقعی خوبصورت ہے۔“ کامران بولا۔ حامد کی آواز بھی حامد کا انداز تھا۔ پھر وہ سب لڑکیاں آئیں حامد کی بیٹیاں اور دوسری رشتہ دار لڑکیاں۔

”ہوں! یہ تنہائیاں کیا کہہ رہی ہیں؟“

”کیوں کامران بھائی؟“

”ابھی تو چند گھنٹے ہی گزرے ہیں، تم سب

کیسی باتیں کرنے لگیں۔ "کامران بولکھلانے لگا۔ میں انجان بن گئی جیسے ان کا مذاق سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں، یورپ سے جو آئی تھی لیکن ان تمام باتوں سے میں خوش تھی۔ وہ شروع ہو گیا تھا جو میں چاہتی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "یورپ کی زندگی کیسی ہے ماریا!"

"بس زندگی جیسی ہوتی ہے۔"

"سنا ہے وہاں بڑی آزادی ہے۔"

"ہاں، جہاں سے میں آئی ہوں وہاں بڑی آزادی ہے، کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ ہلکا پھلکا خوشگوار سکوت فضاؤں میں ہوتا ہے۔"

"کسی سے محبت نہیں کی؟" ایک لڑکی نے سوال کیا اور میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"جواب نہیں دیا تم نے ماریا؟"

"اس بات کا جواب نہیں دے سکتی۔"

"خیر، اب کر لیما، ارادہ ہے؟" عذرا نے اپنی دانست میں مجھے کہہ دیا۔

"ہاں ارادہ ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور لڑکیاں کامران کو مبارکباد دینے لگیں۔ میں البتہ اسی طرح انجان بنی رہی جیسے ان کے مافی الضمیر سے ناواقف ہوں۔ کامران انہیں ڈانٹنے لگا اور یوں یہ تقریبی شغل دیر تک جاری رہا۔

رات کے کھانے پر میں نے مسز حامد کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ فضول گفتگو کی میں نے کامران سے کہا۔

"مسز کامران اب تو میں یہاں آئی گئی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے اپنے درمیان جگہ دے دی ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنی دولت یہاں منتقل کر لوں لیکن اس کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کسی اچھے سے وکیل سے مشورہ کر کے میرا سرمایہ یہاں منگوانے کی کوشش کریں۔"

"ہاں کامران بہتر ہوگا تم نور الدین صاحب سے رابطہ قائم کر دو اور بے چاری ماریا کی یہ مشکل حل

کر دو۔ ہر چند کہ یہاں رہ کر اسے دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن بہر صورت وہ اس کا سامیہ ہے جس قدر جلد منتقل ہو جائے بہتر ہے اور ہاں ماریا! مجھے تم سے کچھ اور گفتگو بھی کرنی ہے تم ایک ایسی معزز ہستی کی بیٹی ہو جس کی ہم سب بے حد عزت کرتے ہیں۔ اور ماریا تم میرے بچوں سے مختلف نہیں ہو۔ تمہارے بہتر مستقبل کے لئے میں نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا۔ میں چاہتی ہوں اب تم بقیہ زندگی ہمارے ساتھ ہی بسر کرو۔" مسز حامد نے کامران کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی یہ ساری باتیں کر ڈالیں۔

"اس کے انتظامات ہو رہے ہیں می آپ فکر نہ کریں۔" عذرا نے می کی باتوں کے جواب میں کہا۔

"کیا مطلب؟" مسز حامد نے تعجب سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے میرا مطلب ہے آپ سب لوگ انتظامات کر رہے ہیں۔" عذرا نے مسکرا کر کہا اور دوسری لڑکیاں بھی زیر لب مسکرا نے لگیں عذرا کا مطلب کچھ اور تھا، کامران اسے گھورنے لگا۔ لیکن عذرا ان سب باتوں سے انجان بن گئی تھی۔ یہ رات بھی خاموشی سے گزر گئی اور پھر دوسرا دن شروع ہو گیا۔

وہی تقریبات وہی معمولات، میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ میں یہاں خوش ہوں یا ناخوش بس جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہو چکا تھا اس کی تکمیل چاہتی تھی اور اس کے بعد شاید میرے لئے یہاں رکنا ممکن نہ ہوتا البتہ اس دن دو پہر ایک پھوٹا سا دلچسپ واقعہ ہوا۔ کامران نے حسب معمول مجھے تلاش کر لیا تھا اور یہ وقت نہایت موزوں تھا کیونکہ دوسرے تمام لوگ دوپہر کو سو جایا کرتے تھے۔ اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور میں نے اسے اندر بلا لیا۔

"یہاں نہیں رکھیں گے ورنہ صورتحال یکسر غیر مناسب ہو جائے گی تم ابھی مقامی ماحول سے واقف نہیں ہو ماریا! یوں کر دو، لان میں آ جاؤ، اسی جگہ جہاں کل ہم لوگ بیٹھے تھے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" کامران نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

وہ چلا گیا اور میں نے اپنے بال وغیرہ درست کئے اور مسکراتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی۔ ہم دونوں درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور کامران مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً ہم نے حامد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑکی جس کے پاس میں نے حامد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی جانب کھلتی تھی اور یقیناً حامد نے ہمیں یہاں بیٹھے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ بانٹا کانپتا اسی طرف آ رہا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

”یہ نہیں ہو سکتا، یہ نہیں ہو سکتا، کامران! یہ بدروح ہے۔ یہ بری روح ہے۔ اس سے بچو، تم بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ یہ۔۔۔ یہ تمہیں نقصان پہنچا دے گی۔ بھاگ جاؤ کامران یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس کے قریب میں مت آؤ۔ یہ۔۔۔ یہ بے حد خوفناک ہے۔ وہ باگلوں کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ کامران کے ہونٹ بھیج گئے وہ ناخوشگواہی کے سے انداز میں حامد کو گھورنے لگا۔

”آپ باہر کیوں چلے آئے ڈیڈی! آپ کو علم ہے کہ ڈاکٹروں نے آپ کو چلنے پھرنے سے منع کیا ہوا ہے۔“

”میں۔۔۔ میں تمہارا باپ ہوں کامران! میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے میری بات مان لو۔ اس بدروح کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ ہم سب کو تباہ و برباد کر دے گی۔ بھاگ جاؤ کامران! تمہیں احتیاج کرتا ہوں ورنہ ورنہ شدید نقصان اٹھاؤ گے۔“ حامد نے کہا اور کامران کا موڈ سخت خراب ہو گیا۔

”ڈیڈی! آپ اندر جائیے، آرام کیجیے۔ ورنہ میں ممی کو آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

”آہ! میری بات مان لو کامران۔ کامران میری مان لو، خدا کے لئے میری مان لو۔ یہ۔۔۔ یہ تمہیں زندہ درگور کر دے گی۔“ حامد نے درد بھرے لہجے میں کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”خدا کے لئے معاف کرو فری! ہمیں معاف کر دے، جو کچھ ہو چکا ہے، اسے بھول جاؤ، اپنی دنیا میں واپس چلی جاؤ۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کرو فری۔۔۔ خدا کے لئے۔“

کامران آگے بڑھا اور اس نے حامد کا بازو پکڑ لیا۔ ”ڈیڈی! آپ اس کی توہین کر رہے ہیں۔ یہ ہماری مہمان ہے براہ کرم آپ اندر جائیے، چلے جلدی چلے۔“

کامران نے سخت لہجے میں کہا، اس نے حامد کا بازو پکڑ لیا تھا پھر وہ اسے دھکیلتے ہوئے انداز میں لے کر آگے بڑھ گیا اور اس غارت کے دروازے پر چھوڑ آیا جہاں سے حامد باہر نکل آیا تھا۔

میرے ہونٹوں پر پرسکون مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ میں اس ساری کارروائی سے بے حد مطمئن تھی۔ کامران تھوڑی ہی دیر میں، اپنی آگیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا لیکن میں نے لاپرواہی سے شانے ہلا دیئے تھے۔

”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کامران کہ اب شاید ان کی ذہنی حالت بھی خراب ہوتی جا رہی ہے بہتر یہ ہوگا کہ ڈاکٹر کو ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بتا دیا جائے۔“

”ممی خود یہ کارروائی کریں گی مجھے تو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری پرسکون گفتگو میں انہوں نے خلل اندازی کی۔ آؤ موڈ خراب ہو گیا ہے چلتے ہیں یہاں سے۔“ کامران نے کہا اور ہم دونوں کوشی کی جانب بڑھ گئے۔

دوسرا واقعہ رات کے کھانے کے بعد پیش آیا۔ ہم رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے اور بیرونی برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ مسز حامد چونک پڑیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا اور متحیر رہ گئیں۔

”ارے یہ اپنی رہائش گاہ سے کیسے نکل آئے؟“ ان کے لہجے میں درشتی تھی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ حامد تھا اس کی حالت کچھ اور خراب

نظر آ رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں وہ خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا یہاں پہنچ گیا۔

”اوہ! تو یہاں موجود ہے، تو موجود ہے۔ نہیں جائے گی تو یہاں سے۔ نہیں جائے گی۔ اس خاندان کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑے گی، بیگم، کامران کو بچاؤ یہ فری ہے اس کی روح ہے جو ہم سے انتقام لینے آئی ہے، اسے یہاں سے بھگادو۔ میں سچ بول رہا ہوں۔“

”کیا مصیبت ہے مئی! اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ ڈیڈی پاگل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے خود کو تباہ کر لیا ہے تو ہمیں کیوں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوپہر کو بھی انہوں نے مارا کی انسلٹ کی تھی۔ اور اب بھی وہی رٹ لگاتے ہوئے ہیں۔ مئی! آپ انتظام کریں ان کا مورنہ میں اس کو بھی سے چلا جاؤں گا۔“ کامران نے سخت لہجے میں کہا۔

”آخر تم کیا چاہتے ہو حامد، فری پھر تمہارے ذہن میں زندہ ہو گئی ہے۔ وہ مر چکی ہے اور تم بھی اگر اس کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تو خودکشی کر لو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ جاؤ اپنی موت گاہ میں موت کا انتظار کرو۔“

دو قوی بیکل ملازم حامد کو زبردستی باہر لے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ کا سوڈ خراب ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معافی مانگی اور فری کی کہانی سنائی۔

”یہ سب گناہوں کی سزا ہے مار پائی، حامد نے پوری زندگی جھوٹ اور فریب کے درمیان گزاری ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کی اور چند ماہ کے بعد ہی اکتا گیا۔ گھر سے غائب رہنے لگا۔ میں فاتحہ کرتی رہی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس نے فری نامی کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس کے بعد وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد وہ میرے پاس پناہ لینے آیا۔ کوئی اور اس کے فریب کا شکار ہو گیا تھا اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں سب کچھ بھول کر اس کے لئے سینہ سپر ہو گئی۔ میں نے ہر خطرہ مول لیا اور اسے بچا لیا اور پھر کچھ دن ٹھیک رہنے کے بعد وہ دوبارہ بھاگ

گیا۔ میری اس جانفروشی کے صلے میں اس نے مجھے ایک چھوٹا سا ہنگلہ خرید کر دے دیا تھا۔ پھر اس کمینہ صفت انسان نے اس لڑکی کو قتل کر دیا جس سے اس نے شادی کی تھی اور اپنے مجرم خمیر کو دھوکہ دینے کے لئے شراب کا بے تحاشہ استعمال شروع کر دیا۔ میں پھر اس کا سہارا بنی لیکن اس سے وفا کی کوئی امید نہیں تھی اور وہی ہوا۔

شراب اور عورت میری ساری زندگی دکھوں میں گزری۔ اس نے کہیں سے دولت حاصل کر لی، لیکن دولت سکون تو نہیں دیتی۔ اگر میرے بچے میرا سہارا نہ ہوتے تو میں کب کی خودکشی کر چکی ہوتی۔ اور اب میرا وقت ہے، میرا دور ہے اور میں اس سے انتقام لے رہی ہوں۔ میں نے اسے بے حیثیت کر دیا ہے وہ اسی قابل ہے۔“

”ہاں، وہ اسی قابل ہے۔“ میں نے نفرت سے سوچا۔

☆.....☆.....☆

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بعد حامد نہیں نظر آیا تھا اس کی رہائش گاہ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اسے وہاں سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میری دولت کی منتقلی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ لیکن میں بے سکون تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ حامد بار بار میرے سامنے آئے اذیت سے بڑے جھگڑائے اور میں اس کے کرب سے لطف اندوز ہو سکوں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جمی دور سے چیخا اور میں چونک پڑی۔ میں نے اس دروازے کو آگ کی لپیٹ میں دیکھا جو اس کمرے میں داخل ہونے کا دامن راستہ تھا کھڑکیاں، کمرے کا فرنیچر، قالین، سب کچھ جل رہا تھا چاروں طرف آگ لگ رہی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جمی روشندان میں بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہوا جمی؟“

”آگ لگی ہے۔“ جمی نے کہا اور ہنس دیا۔

”میں مصیب میں ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔“

میں جل کر بولی۔ اور جمی روشندان سے اڑ کر میرے

پاس آ بیٹھا۔ وہ بدستور ہنس رہا تھا۔ ”جی، جی کہیں اب کیا ہوگا؟“

”آگ اسی پاگل بوڑھے نے لگائی ہے، باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور وہ آگ کے درمیان گھرا جھج رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ وہ فری ہے ایک روح ہے، وہ جو انہیں تباہ کرنے آئی ہے وہ ان سے انتقام لے رہی ہے، اسے جل جانے دو۔ ورنہ سب اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤ گے۔“

”اوہ۔“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا تب جی بولا۔

”آؤ فری! یہاں تحفے بڑھتی جا رہی ہے آگ پھیل رہی ہے آؤ باہر چلیں۔“

”اس۔“ میں چونک پڑی۔ پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ میں ہڈیوں اور گوشت کے اس ہجرے سے باہر نکل آئی اور بڑے سکون کا احساس ہوا۔ ایک دم کیفیت بدل گئی تھی میری، مجھے دکھ ہونے لگا۔ افسوس کس ناپاک کثافت میں داخل ہو گئی تھی میں۔ بلاوجہ میرے ذہن میں ایسے فاسد خیالات پیدا ہو گئے تھے بھلا مجھ کو اس سے انتقام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ انتقام لینے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ اس کی مرضی، تو بہ تو بہ کیسا گناہ کیا ہے میں نے، بے چارہ حامد تو خود ہی زندہ درگور ہے۔ اسے دکھ پہنچا کر مجھے کیا ملا۔

میں نے آگ میں اپنے بدن کو دیکھا۔ اگر میری ہڈیاں چاٹ رہی تھیں۔ ناپاک خاک کی کثافت۔ قصور میرا بھی نہیں تھا۔ بدن کی قید ایسے ہی گندے خیالات کی محرک ہوتی ہے۔ روح کتنی ہلکی پھلکی ہوتی ہے اس میں کوئی بڑا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ یہ صرف اس خاک کے قید خانے کی غلامت تھی۔

شریر جی آئندہ میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کرنا۔ آؤ اب واپس چلیں یہاں سے۔“

میں باہر نکل آئی اور اب ہمارا رخ اپنے سکون گاہ کی طرف تھا جس میں ایک گہری خاموشی پھیلی ہوئی

تھی جہاں سکون ہی سکون تھا۔ گہرا بے کراں سکون اور خاموشی اور جب میں اپنی جگہ پر پہنچی تو اچانک جی ایک دودھیا ہالا میں قید ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں بدحواس ہو گئی اور ایسی حالت میں ایک انتجان منزل کی طرف بھاگتی گئی جب میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو مجھے پتہ چلا کہ جی پر ایک عامل نے اپنا قبیلہ جمالیا تھا۔

اور پھر اس وقت سے آج تک میں بھٹکتی پھر رہی ہوں اور اسی درخت پر اپنا مسکن بنالیا ہے۔

محترم بزرگوار! میری التجا ہے کہ آپ میری مدد کریں تاکہ میں آئندہ بھٹکنے سے بچ جاؤں اور مجھے منزل اور سکون مل جائے۔“

یہاں تک بول کر وہ روح کرب و اذیت سے مزید سکونے لگی۔

اس روح کی آہ وزاری رولو کا کے دل و دماغ پر کافی اثر کر گئی رولو کا چند لمحے سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ ”آپ گھبرا میں نہیں مجھ سے جہاں تک ہوسکا میں آپ کی ابدی سکون کے لئے سب کچھ کروں گا اب صبح کا اچالا پھیلنے والا ہے میں بہت جلد عملی قدم اٹھاؤں گا۔“

رولو کا کی بات سن کر اس روح نے اپنا سراو پر اٹھایا اور بولی۔

”محترم بزرگوار! آپ کا مجھ پر احسان ہوگا، میں آپ کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

اور پھر رولو کا نے جس درخت کے نیچے موجود تھا اس درخت کے گرد سے حصار ختم کر دیا اور بولا۔ ”میں نے درخت کے گرد سے حصار ختم کر دیا ہے اب آپ بے خوف و خطر درخت پر رہیں۔“

میں چند دن میں آپ کو خوش خبری ضرور سناؤں گا۔“

ایک مرتبہ پھر اس روح نے رولو کا کا شکریہ ادا کیا اور ایک طرف کو پرواز کر گئی۔

(جاری ہے)



موت کا بدلہ

مریم قاسم - حیدر آباد

ہیولہ کسی آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں اور سامنے موجود عورت کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں اس کے بعد عورت ہوا میں معلق ہوئی اور بڑی تیزی سے دیوار سے ٹکرائی تو اس کا سر پاش پاش ہو گیا اور پھر.....

خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ایک دہشت ناک، خوف ناک، تھیراگیز کہانی

تھیں۔ اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگی تھیں

”سبھا کرونا مکہ میری مئی تمہاری مئی کی طرح نہیں ہیں۔ وہ بہت سخت ہیں اگر مجھے دیر ہوگئی تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔“

”ایک تو تمہاری مئی کی باتیں بھی میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہر بات پر ناراض ہوتی رہتی ہیں۔“

”خاموش ہو جاؤ نا مکہ وہ میری مئی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بولا تو تمہاری خیر نہیں۔“

صائمہ اور نا مکہ کافی شاپ میں بیٹھی کافی پی رہی تھیں سردیوں کے دن تھے ایسے میں راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔

”اچھا یار میں تو چلتی ہوں ورنہ میری مئی دیر ہو جانے پر بہت ناراض ہوں گی۔“ صائمہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”یار احد ہوتی ہے، جب سے آئی ہو بار بار گھڑی دیکھے جا رہی ہو، کوئی دیر نہیں ہوئی کچھ دیر مزید بیٹھ جاؤ پھر چلی جانا۔“ نا مکہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

دونوں کچھ ہی عرصے میں کچی سہیلیاں بن گئی

Dar Digest 67 May 2015

”اچھا بھی ٹھیک ہے لیکن جانے سے پہلے
دومنٹ کو میری بات تو سن جاؤ۔“
”بکو۔“ صائمہ مسکرا کر بولی اور ایک بار پھر کرسی
پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں شاید یاد ہو کہ آج سے تقریباً ایک ماہ
پہلے میں نے تمہیں اپنی اولڈ داوی کے بارے میں
بتایا تھا۔“
”ہاں یاد آیا بہت بیمار تھیں وہ، اب طبیعت کیسی
ہے ان کی؟“

”ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ وہ اب
اس دنیا میں نہیں رہیں۔“
”اوہ! مائی گاڈ، آئی ایم سوری۔ مجھے بہت
افسوس ہوا۔“

”ارے افسوس کس بات کا، یار مجھے تو خوشی ہوتی
ہے کہ وہ مر گئیں چلو جان تو چھوٹی نا۔“
”اوپوشٹ آپ نائلہ کو اس کرتے کرتے تھکتی
نہیں تھم۔ دادی تھیں وہ تمہاری۔“

”دادی میری تھیں نا تجھے کیوں رونا آرہا ہے۔
اور ویسے بھی میں نے تجھے کوئی افسردہ خبر دینے کے لئے
نہیں روکا تھا۔ بڑی دلچسپ بات ہے جو میں تجھے بتانے
والی ہوں۔ میری دادی جس بنگلے میں رہتی ہیں، بلکہ رہتی
تھیں وہ بہت ہی خوبصورت اور شاندار ہے جب تک وہ
زندہ رہیں، ہمیں وہ نمل سکا، ظاہر ہے ان کی ملکیت جو تھا
میری مئی تو ان سے اتنی تنگ تھیں کہ الگ گھر میں رہتی
تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ سے یہی چاہتے
تھے کہ وہ گھر ہمیں مل جائے لیکن ان کے زندہ رہتے یہ
ممکن نہیں تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں تو وہ بنگلہ خود
بخود ہمارے حصے میں آ گیا ہے، اب بہت جلد ہم لوگ
وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔“

تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ نئے گھر کی خوشی میں
میں پارٹی دوں گی۔ شاندار اور شاندار قسم کی پارٹی
اور تجھے ہر صورت میں آنا ہوگا بلکہ تجھے کو تو میں روک لوں
گی وہاں پر۔“

نا بابا ایک تو تم اپنی دادی کی ڈ۔ جھ پر پارٹی رکھ
رہی ہو، اوپر سے میں تمہارے گھر میں رہوں۔ یہ بھول
جاؤ، میں نہیں رہنے والی تمہارے بھوت بنگلے میں۔“
”کیا.....؟ کیا کہا..... اسے بھوت بنگلہ کیا
سوچ کر کہہ دیا تم نے اس گھر کو۔“

”بھئی ظاہری بات ہے جب اتنے اچھے
گھر میں تمہاری جیسی چیزیں راج کرے گی تو وہ بھوت
بنگلہ ہی کہلائے گا ناں۔“

صائمہ بول کر چپ ہوئی تو دونوں ہنسے لگیں۔
”اچھا چلو ٹھیک ہے میں اپنی مئی سے پوچھوں
گی اگر وہ مجھے کچھ دن تمہارے گھر ٹھہرنے کی اجازت
دے دے تو۔“ صائمہ نے نائلہ کو گندہائے کہا اور اپنے
گھر چلی گئی۔

صائمہ اور نائلہ دونوں انٹر کی طالبہ تھیں صائمہ
نہایت ذہین اور محنت سے پڑھنے والی لڑکی تھی۔ جبکہ
نائیلہ بہت ہی شوخ و چٹیل قسم کی لڑکی تھی۔ لیکن پھر بھی
دونوں میں بہت سی باتیں Common تھیں اس
لئے بڑی جلدی گہری دوست بن گئیں۔

دو دن بعد نائلہ کا فون آیا یہ بتانے کے لئے کہ
”اس نے پارٹی کے تمام انتظامات کر لئے ہیں اور کل
رات پارٹی ہے۔“ صائمہ نے جھٹ اپنی مئی سے اجازت
مانگی، پہلے تو وہ انکار کرتی رہیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نائلہ
اچھی لڑکی ہے انہوں نے حالی بھر لی، صائمہ نے خوشی
خوشی یہ بات نائلہ کو بتائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔

صائمہ نے چار اچھے سے جوڑے اپنے سامان
میں پیک کئے اور ضرورت کی چند چیزیں رکھیں اور اگلے
دن کا انتظار کرنے لگی۔

اگلے روز دوپہر کو کھانے کے بعد نائلہ نے
صائمہ کو پک کر لیا کیونکہ وہ بنگلہ شہر کی آبادی سے بہت دور
تھا۔ اس لئے وہاں پہنچتے پہنچتے ہی دو گھنٹے لگ جانے
تھے۔

پورے راستے دونوں خوش گپیوں میں مصروف
رہیں۔ گھر پہنچ کر باہر بڑے سے گیٹ کے سامنے نائلہ

نے گاڑی روک دی۔ صائمہ تو اس گھر کی خوبصورتی میں کھوی گئی۔ چونکدار نے گیٹ کھولا وہ اندر داخل ہوئیں۔ سامنے بہت بڑا لان تھا۔

نجانے کیوں کچھ دیر کے لئے تو صائمہ کو واقعی وہ بنگلہ کسی بھوت بنگلے کی طرح معلوم ہوا۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحوں وہ تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی اور بچوں کی طرح لان کی گھاس پر ٹپکنے لگی۔

نائملہ اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنسنے لگی۔ ”اب اندر چلو کیا سارے مزے باہر ہی لینے ہیں۔“ نائملہ بولی تو صائمہ نے گاڑی سے اپنا بیگ نکالا اور نائملہ کے ساتھ ساتھ اندر آ گئی۔

نائملہ نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر بیٹھایا ابھی کوئی اور مہمان نہیں آیا تھا۔ ”تم بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی میز کو بلاتی ہوں۔“ نائملہ اپنی میز کو بلانے چلی گئی۔ اور صائمہ آرام سے بستر پر بیٹھ کر نائملہ کا کمرہ غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے مختلف قلم اسٹارز کی تصویریں اپنے کمرے میں لگا رکھی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں اس کی میز پر بیدہ کمرے میں آئیں۔ بڑے مازورن لوگ تھے وہ۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی نائملہ کی طرح خوب فیشن کر رکھا تھا اور اسٹائلش کپڑے پہن رکھے تھے۔

”کیسی ہو مینا؟ ہماری پہلی مہمان تم ہی ہو۔ مت پوچھو مجھے کتنی خوش ہوئی ہے تمہارے یہاں آنے سے۔“ وہ بری خوش اخلاقی سے بولیں۔

”اوہ! تمہیں یو آئی۔“ صائمہ نے بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

”اچھا نائملہ تم ایسا کرو کہ صائمہ کو اس کا کمرہ دکھاؤ میں ذرا اپنے روم میں جا رہی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں نائملہ نے صائمہ کا بیگ اٹھایا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ وہ اسے لے کر اس کے کمرے تک آئی۔ ”یار نائملہ یہ کیا مجھے اتنی دیر کمرہ کیوں دیا ہے۔“ وہ شکوہ کر بیٹھی۔

”سوری صائمہ لیکن جو کمرے میرے روم کے پاس ہیں وہ ابھی سیٹ نہیں کئے“ نائملہ نے جواب دیا تو

صائمہ چپ ہوئی۔ ”یہ ایک بات تو بتائیے تو میرے روم کے پاس روم کیوں لینا چاہ رہی ہے۔ کہیں تجھے ڈر تو نہیں لگ رہا۔“

”نہیں مجھے تو تم جیسی چڑیل سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تو یہ تو پھر پیارا سا گھر ہے۔“ نائملہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔ مجھے پارٹی کی تیاریاں بھی کرنی ہیں۔ تم آرام سے بیٹھو۔“ نائملہ باہر جا چکی تو صائمہ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور بستر پر لیٹ گئی۔ یہ کمرہ نہایت شاندار تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ”اس گھر میں نائملہ کی دادی کتنے مزے سے رہتی ہوں گی۔“ لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ وہ تو بے چاری بیمار تھیں۔ اور اکیلے گھر میں بس ملازموں کے ساتھ رہتی تھیں۔

اچانک اس کی نظر سامنے میز پر رکھی ہوئی ڈائری پر پڑی وہ بلیک کلر کی لیدر کی ڈائری تھی بے اختیار ہو کر اس نے اسے اٹھایا اور صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور زبیدہ اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر صائمہ بری طرح بوکھلا گئی۔ اور جلدی سے ڈائری واپس میز پر رکھ دی۔ ”اوہ آئی ایم سوری۔ مجھے اس طرح آپ کی چیزیں نہیں چھیننی چاہئیں تھیں۔“

”نہیں مائی چائلڈ اس اوکے تمہارا جہاں دل چاہے آؤ جاؤ کیونکہ ویسے بھی ابھی ہم نے نائملہ کی دادی کے انتقال کے بعد اس گھر کی سیٹنگ نہیں کی ہے۔ اس کمرے کی ترتیب بھی ابھی صحیح نہیں ہوئی اور یہ ڈائری جو تمہارے ہاتھ میں ہے ہماری نہیں ہے بلکہ نائملہ کی دادی یعنی میری ساس کی ہے۔“ وہ کچھ دیر یونہی اس سے باتیں کرتی رہیں پھر اٹھ کر چلی گئیں۔

صائمہ یہ سوچ کر بہت خوش ہوئی کہ اب وہ سارے گھر میں آزادی سے گھوم پھر سکتی ہے اور پھر وہ شام میں ہونے والی پارٹی کی تیاری کرنے لگی۔

شام کو نائملہ کی تمام سہیلیاں آ گئیں، خوب ہلہ گلہ ہوا۔ اس کی ساری سہیلیاں بھی اس کی طرح نہایت شوخ

وچنچل قسم کی تھیں۔ انہوں نے مل کر خوب اہم بچایا۔ اتنی سخت سردی میں بھی وہ کولڈ ڈرنک کے گلاس غنائت پیتی رہیں جبکہ صائمہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی کافی کے سب لے رہی تھی۔

اچانک لائٹ چلی گئی پورے گھر میں گھپ اندھیرا بچھا گیا اندھیرا ہوتے ہی تمام لڑکیاں ڈر گئیں ان میں صائمہ سب سے زیادہ ڈری ہوئی تھی اس دوران اس کے کندھے پر پیچھے سے کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی۔

نائملہ یہ کیا بد تمیزی ہے ذرا نا بند کرو مجھے۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ نائلہ بولی۔

”تو پھر کس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔“

”مجھے کیا پتا میں تمہارے پاس تھوڑی بیٹھی

ہوں۔“ نائلہ بولی۔

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ لائٹ دوبارہ آ گئی۔

”کوہ! شکر ہے لائٹ آ گئی۔“ نائلہ نے سکے کا سانس لیا کہ

اچانک ہی صائمہ کی نظر سامنے سے گزرتے ہوئے ایک

سامے پر پڑی اس جگہ تھا تو کوئی نہیں لیکن بس ایک سایہ تھا

جو چل رہا تھا اس سامے کو دیکھ کر صائمہ کو جھرجھری آ گئی وہ

بار بار پلک جھپک کر دیکھنے لگی مگر وہاں اب کوئی ہوتا تو نظر آتا۔

بڑی دیر تک پارٹی چلتی رہی اور ہلا گلہ ہوتا رہا

اور پھر سب کی سب شانت ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد نائلہ نے کہا ”چلو ایک گیم کھیلتے

ہیں یعنی کسی بھٹکی ہوئی روح کو بلا تے ہیں۔“

یہ سنتے ہی تمام لڑکیاں خوش ہو گئیں۔ بڑی گول

میز پر سے انہوں نے تمام چیزیں ہٹائیں اور ایک بڑا

کاغذ امیز پر بچھا دیا اس کے بعد نائلہ نے تمام تفصیل سے

لڑکیوں کو آگاہ کیا کنول نام کی ایک لڑکی پنسل لے کر بیٹھ

گئی اور پنسل کی نوک کاغذ پر نکا دیا۔ تمام لڑکیاں یک زبان

ہو کر ہلکی ٹھہری ہوئی آواز میں بولنے لگیں۔ ”اس کمرے

میں یا قریب و جوار میں کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے تو ہم اس

سے مخاطب ہیں، اے بھٹکی ہوئی روح ہمارے سوال کا

جواب دو اور اپنی موجودگی ثابت کرو، اے بھٹکی ہوئی روح

جواب دو اور اپنا نام بتاؤ..... اپنا نام بتاؤ..... اپنا نام

بتاؤ۔۔۔ سب کی سب لڑکیاں اس جیسے کی تکرار کرنے لگیں اور کافی دیر تک۔۔۔

پھر اچانک پنسل حرکت میں آئی اور کاغذ پر ایک

نام لکھا گیا وہ نام تھا ”ہما“

نائملہ بری طرح ڈر گئی اور اندرونی طور پر اس

پر کچکی طاری ہو گئی۔ ”بس کرو، ختم کرو یہ سب کچھ۔“ اتنی

سخت سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے

لگی تھیں۔

کنول حیران و پریشان سب کو دیکھنے لگی اس پر خوف

سوار ہو گیا تھا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا تم سب یقین کرو کسی ان

دیکھی طاقت کے تحت خود بخود میرا ہاتھ چل رہا تھا۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ نائلہ نے سختی سے کہا

تو کنول کو غصہ آ گیا۔ ”حد ہوتی ہے ایک تو پہلے خود ہی کہا

کہ کسی روح کو بلا تے ہیں اور اب آگے سے بد تمیزی

کر رہی ہو۔“ دونوں میں خوب بحث چمڑ گئی یہاں تک کہ

باقی لڑکیوں نے بیچ میں بڑکے انہیں الگ کیا۔

بہت بد مزگی ہوئی اور پھر سب لڑکیاں اپنے اپنے

گھروں کو چلی گئیں۔

صائمہ کو نائلہ کے ایسے رویے پر بڑی حیرت

ہوئی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ”آخر بات کیا ہے

! وہ اچانک اتنی اپ سیٹ کیوں ہو گئی ہے۔“ مگر وہ ابھی

اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ اگر کہیں اسے

اس پر بھی غصہ آ گیا تو اس لئے وہ چپ بی رہی۔

اچانک اسے لگا کہ کمرے کے باہر کوئی ہے۔ ہلکی

سی آہٹ سنائی دے رہی تھی وہ بستر سے اٹھی اور کمرے

سے باہر نکلی اور کمرے کا دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگی

کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی وہ صائمہ کی عمر کی ہی ہوگی

وہ چلتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ نزدیک آ کر وہ

صائمہ کو گھورنے لگی۔ ”تم کون ہو؟“ صائمہ نے

پوچھا۔ ”اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میرا نام ہما ہے۔ میں یہاں کام کرتی ہوں

اور اسی جگہ رہتی ہوں۔“ وہ بڑے مودبانہ لہجے میں بولی۔

”خیر اب اتنی رات ہو گئی ہے تم چا کر سو جاؤ ضرور

تھک گئی ہوں کی۔“
”مجھے تھکن محسوس نہیں ہوتی، میں تو ویسے بھی
خیر چھوڑیں، آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ وہ بولی۔
”تم تو بڑی اچھی لڑکی لگتی ہو۔ مجھ سے دوستی
کرو گی؟“ صائمہ نے اس سے دوستی کے لئے ہاتھ آگے
بڑھایا تو اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ ملایا تو ایک لمحے کو
صائمہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا
تھا۔ صائمہ نے فوراً ہی ہٹا دیا۔ ”اچھا اب مجھے نیند
آ رہی ہے، میں چلتی ہوں۔“ اور پھر وہ تیزی سے اپنے
کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا، وہ
بستر پر بیٹھ کر ہمارے بارے میں سوئے گئی۔

پھر جب دادی نے ہمارے کمرے کی تلاشی لی تو
وہاں سے ان کی انگوٹھی نکلی تو انہوں نے اسی وقت ہمارا
کو کلام سے نکال دیا۔ پھر نبھانے ہمارے کیسے شک ہو گیا۔
وہ میری مٹی سے لڑنے لگی۔ کہنے لگی ”آپ نے
مجھ پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے، آپ نے مجھے جان بوجھ
کر پھنسا دیا ہے۔“

مٹی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تو وہ
تجورا کر فرش پر گر پڑی اور اس کا سر میز سے ٹکرایا اور خون
نکلنے لگا۔ میں اور مٹی گھبرا کر اسے دیکھنے لگیں مگر افسوس کہ
وہ ہمیشہ کے لئے بہت دور جا چکی تھی۔

تب مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ ہم نے کیا کر دیا
کیونکہ ہمارے میری بڑی اچھی دوستی تھی۔ ہم نے اس کے
ماں باپ سے۔ ”یہ ہی کہا کہ وہ نبھانے خود بخود کیسے
گر گئی۔“ اور اس کی ڈتھ ہو گئی۔ غربت بہت بری ہوتی
ہے، مٹی نے اس کے والدین کو پانچ ہزار روپے دیئے کہ
وہ کفن و دفن کا انتظام کر دیں اور وہ لوگ خاموش ہو گئے۔
اور آج پارٹی میں جب ہمارا نام کنول نے لکھا تو
میں بہت بری طرح گھبرا گئی۔

”ویسے ایک ہمارا کو تو میں بھی جانتی ہوں۔“
صائمہ بولی تو ناملہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کون ہے
وہ؟“ ناملہ نے جلدی سے پوچھا۔

”ارے اتنے تجسس کی کیا بات ہے تمہاری
ملازمہ ہے وہ۔ ابھی تم سے پہلے میری اس سے ملاقات
ہوئی تھی۔ اور ہم میں دوستی بھی ہو گئی ہے لیکن پتا نہیں
کیوں مجھے کچھ عجیب سی لگی وہ لڑکی۔“ صائمہ نے کہا۔

”کیا کہہ رہی تھی وہ؟“ ناملہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔
”کچھ نہیں کہہ رہی تھی، اتنا ڈر کیوں رہی
ہو؟“ صائمہ نے ناملہ سے پوچھا۔

”ڈر نے کی بات ہے صائمہ، اب ہمارا نام کی کوئی

پھر تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ دروازے پر دستک
ہوئی تو وہ بری طرح اچھل پڑی۔ ”کک۔۔۔ کون ہے؟“
”صائمہ میں ہوں ناملہ۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔“ ناملہ کی
آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی جا کر دروازہ کھولا۔
”اوہ شکر ہے کہ تم آگئیں مجھے اکیلے میں بہت
ڈر لگ رہا تھا۔“ صائمہ بولی۔

”بیج؟“ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا تھا۔ اچھا یہ لو
چاقوزے۔“ ناملہ نے اسے چاقوزوں کا لفافہ تھمایا۔
پھر وہ بستر پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ ناملہ بھی پاس پڑی کرسی
پر بیٹھ گئی۔ ”تم ضرور سوچ رہی ہوں گی کہ آج شام پارٹی
کے وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں اتنے غصے میں کیوں
آگئی تھی۔ اور ڈر کیوں گئی تھی دراصل بات ہی کچھ ایسی
ہے صائمہ کہ تم بھی سنو گی تو ڈر جاؤ گی۔“

میں سمجھیں اپنا ایک راز بتا رہی ہوں کچھ عرصہ
پہلے ”ہمارا“ اس گھر میں ملازمہ ہوا کرتی تھی، یہ تب کی بات
ہے جب میں اور مٹی اس گھر میں رہتی تھیں۔ ایک دن
میری دادی نے اپنے لئے سونے کی ایک بہت
خوبصورت انگوٹھی خریدی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگی کہ میں
نے اسے چھ لیا۔ اور وہ میری سب سے بڑی بھول تھی۔
جیسے ہی دادی کو انگوٹھی کی گمشدگی کا علم ہوا تو انہوں نے
ایک مصیبت ہی کھڑی کر دی۔

جب میں نے یہ بات اپنی مٹی کو بتائی، پہلے تو وہ

لڑکی ہمارے پاس کام نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے
روح لوٹ آئی ہے، میری دادی کہا کرتی تھیں۔ "بعض
اوقات روحیں کسی وجہ سے مڑ کر پھر لوٹ آتی ہیں۔" ٹھہرو
مجھے می کو بتانا ہوگا۔

"لیکن نائلہ وہ تو سچ سچ کی لڑکی تھی کوئی روح
نہیں تھی۔" صائمہ بولی۔

"اگر سچ سچ کی لڑکی تھی بھی تو، میں نے تم سے کیا
کہا، اب کوئی ہمارا نام کی لڑکی اس گھر میں نہیں ہے۔" اتنا
کہہ کر نائلہ نے صائمہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنی می
کے کمرے میں آئی اور اس کی می کو ساری بات بتائی تو وہ
پہلے تو روجوں والی بات پر یقین کرنے سے انکار کرنے
لگیں پھر بولیں۔ "چل کر ہاشم (چوکیدار) سے پوچھتے
ہیں کہ کیا اس نے کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھا
ہے۔" پھر وہ تینوں چوکیدار کے پاس پہنچیں مگر سامنے کا
منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے وہ دروازے کے پاس
فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔

تینوں اسے دیکھ کر چیخنے چلانے لگیں پھر بدحواسی
کے عالم میں بولیں۔ "لڑکیوں اس طرح چیخنے سے کچھ
نہیں ہوگا ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی ہوگی ضرور کوئی چور
ڈاکو گھر میں گھس آیا ہے۔"

تینوں بھاگتی ہوئی واپس آئیں نائلہ کی می زبیدہ
نے کئی بار پولیس کون کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی
ہوئی۔ کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا اور پھر جب ایک بار انہوں
نے فون ملانے کی کوشش کی تو دیکھا کہ تار کٹی پڑی ہے۔

"یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟" زبیدہ حیرت سے
چلیں۔ "اوہ! میرے خدا یہاں تو میرا دم گھٹ رہا ہے۔"
نائیلہ روتے ہوئے بولی۔

اچانک ہی راہداری میں کسی کے چلنے کی آہٹ
ہوئی۔ تینوں ہم گئیں۔ "تم لوگ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔"
زبیدہ نے صائمہ اور نائلہ کو ایک طرف کیا اور کمرے سے
باہر نکل آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ "کوئی بھی
نہیں ہے۔" وہ بولیں۔ واپس اندر آئی ہی تھیں کہ اچانک
انہیں کسی نادیدہ وجود نے ہوا میں اچھال دیا۔ اور وہ ہوا

میں اڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائیں۔

ٹکرائی زوردار تھی کہ ان کا سر کئی حصوں میں بٹ
گیا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی بے سدھ
ہو گئیں۔

صائمہ اور نائلہ خوف سے جینٹیں مارنے لگیں
پھر اچانک سارے کمرے کی چیزیں ہلنے لگیں تو وہ دونوں
گھبرا کر کمرے سے باہر آئیں تو دیکھا کہ سامنے ہمارے
کھڑی ہے وہی ہمارا جس سے صائمہ نے بات کی تھی۔

نائیلہ نے بتایا کہ "یہ وہی ہمارا ہے جو کہ مر چکی ہے۔"
وہ دونوں خوف سے دیوانوں کی طرح سارے
گھر میں بھاگنے لگیں کہ کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے مگر وہ
جہاں جاتیں نامعلوم کس طرح ہمارا بھی وہاں پہنچ
جاتی۔ آخر تھک کر دونوں زمین پر بیٹھ گئیں دونوں پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگیں۔

"اچانک انہیں اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی۔
"میں لوٹ آئی ہوں نائلہ۔" دونوں نے بری طرح ڈر
کر پیچھے دیکھا، وہاں ہمارا ہاتھ میں تیز دھار بڑی چھری
لئے کھڑی تھی۔

پھر ہمارا کی روح ہوا کی سی تیزی سے آگے
بڑھی، اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر نائلہ کی
آنکھوں میں بیوست ہوئے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے نائلہ
بے خود اور مبہوت ہو کر فرش پر ڈھلے گئی، تو وہ روح آگے
بڑھی اور چھری نائلہ کی گردن پر پھیر دی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے نائلہ کا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔

"میں اپنا بدلہ لینے آئی تھی۔ وہ پورا ہوا اب میں
جاری ہوں۔ اتنا کہہ کر ہمارا وہاں سے چلی گئی۔

صائمہ نائلہ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے
لگی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، اس رات کو جب انہوں
نے روجوں کو بلایا تو ہمارا کی بھنگی ہوئی روح وہاں آ پہنچی
اپنی موت کا بدلہ لینے کے لئے اور اپنے مقصد میں وہ
کامیاب رہی۔





سکتے کی موت

ایس اتیار احمد - کراچی

سترہ سال پہلے مرنے والی لڑکی اچانک زندہ ہو گئی اور زندگی کے شب و روز میں رواں دواں ہو گئی، اور پھر وہ دوبارہ ستاون سال بعد ایک مرتبہ پھر مر گئی اور چننا کے سپرد ہو گئی، ناقابل یقین مگر حقیقت کہانی میں موجود ہے۔

ایک عجیب و غریب عقل کو اچھے میں ڈالتی ناقابل یقین سوچ سے بالاتر حقیقت

کر دیتا ہے جسے موت سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عامل سکتے کی یہ کیفیت خود ختم کرتا ہے یا یہ کیفیت اس وقت کے بعد خود ختم ہو جاتی ہے جو وقت عامل نے مقرر کیا ہو۔

آپ نے ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ سنا ہوگا کہ ایک آدمی مر گیا اسے قبر میں اتارنے لگے تو وہ زندہ ہو گیا۔ یہ سکتہ ہوتا ہے جو از خود بھی ختم ہو سکتا ہے اور کالے عمل

کسی مرے ہوئے انسان کا زندہ ہو جانا کسی بھی ڈاکٹر کے لئے قابل یقین نہیں ہو سکتا لیکن محترم سید محمود شاہ من گھڑت قصے سنانے والے نہیں۔ ان کی ہر کہانی سچی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے ملور پر تحقیقات کی تو انکشاف ہوا کہ یہ کالے عمل کے اثرات تھے۔ ایسے واقعات پاکستان میں بھی ہوئے ہیں۔ کالے عمل کا حامل مطلوبہ فرد پر سکتہ طاری

Dar Digest 73 May 2015

سے طاری کیا ہوا سکتا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے جہاں تک اس کہانی کا تعلق ہے یہ گئی ہے۔

ایک سرکاری کام کے سلسلے میں مجھے پٹیالہ جانا پڑا۔ یہ میرا ایک عام سفر تھا جسے ایک ہندو نے یادگار بنا دیا۔ گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں خشکی تھی۔ موسم تو اچھا خاصا دگلش تھا مگر میں یورہور ہاتھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ٹرین کا سفر مجھے کبھی اچھا ہی نہیں لگا اور دوسری بات یہ کہ ڈبے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اکثریت ایسے ہندوؤں کی تھی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں تھیلیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان تھیلیوں میں ان کے مرے ہوئے عزیزوں کی ہڈیاں تھیں جنہیں وہ دریائے گنگا میں پھینکنے کے لئے ہردوار جا رہے تھے۔

ہردوار کے بارے میں بتاتا چلوں کہ ہردوار ضلع سہارن پور کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ بھارت کے صوبہ اتر پردیش کا یہ قصبہ مذہبی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قدیم زمانے میں ہردوار کا نام کپیلا تھا۔ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا اس قصبے کے پاس بہتا ہے۔ وہاں ایک گھاٹ ہے جس کو ”ہری کا چرن“ کہتے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ صدیوں پہلے ان کے دیوتا نے یہاں اشان کیا تھا اور دیوتا کے قدموں کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصبہ ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہے۔ تقریباً ہر ہندو کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں ہردوار جا کر گنگا برد کی جائیں کیونکہ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جس کی ہڈیاں ہردوار جا کر ”ہری کے چرن“ کے پاس دریا میں پھینکی جاتی ہیں۔ اس مردے کی آتما کو سکون ملتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔

میرے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس نے ہڈیوں والی تھیلی اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔ ادا سی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میں بودیت کم کرنے کے لئے کسی ہم سفر کے

ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

”لالہ جی۔۔۔!“ میں نے خاموشی کو توڑا۔۔۔

”آپ ہردوار جا رہے ہیں۔۔۔؟“

”ہاں جی۔۔۔!“ اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا اور بات ختم کر دی۔

اس کے بعد میں نے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ ”یا اللہ! پٹیالہ جلدی آئے تاکہ میں اس مائمی ماحول سے نکل کر بھاگ سکوں۔“ یہ سفر میری زندگی میں بدترین سفر ثابت ہو رہا تھا۔

پٹیالہ سے پہلے گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی، ہمارے ڈبے سے ایک دو مسافر اتر گئے ایک مسافر ہمارے ڈبے میں آیا۔ وہ اپنی ہمت کڈائی سے مکمل ہندو بنیا نظر آتا تھا۔ قد درمیانہ، ٹانگیں پتلی، منگے جیسی تو نہ جو اس کے داخل ہونے سے پہلے ڈبے میں داخل ہوئی۔ اس نے سرسری طور پر تمام ڈبے کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر پر پڑی۔

”سکھد یو۔۔۔!“ اس نے پکارا۔۔۔ ”تم کدھر؟“ اور آ کر اس سے لپٹ گیا۔

ان دونوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے انداز سے ہی معلوم ہو گیا کہ برسوں کی آشنائی ہے۔

گاڑی نے وسل دی اور ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ نوارد مسافر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر وہ آٹس میں باتیں کرنے لگے جو مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”سکھد یو۔۔۔!“ نوارد مسافر نے کہا۔۔۔

”تمہاری تپنی کی مرتیو کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے تمہیں خط ڈال دیا تھا مگر کاروباری مصروفیات کی وجہ سے نہ آ سکا۔ معاف کرنا۔“

”کاروبار میں اتنا مصروف ہونا بھی درست نہیں کہ عزیزوں کی موت پر بھی انسان نہ آ سکے۔“ سکھ دیو نے شکوے کے انداز میں کہا۔

”میں تو اطلاع کو صحیح نہ سمجھا تھا۔“ نوارد نے

کہا۔ ”میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہاری طرف سے دوسری اطلاع آئے گی کہ پشپا بھا بھی مر گئی اور زندہ ہو گئی تھی۔“

اس ہندو کی یہ بات سن کر میں نے غیر ارادی طور پر حیرت ناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں بھی سمجھ گئے اور میری طرف متوجہ ہوئے۔

”بابو جی.....!“ بوڑھے سکھ یو نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس کی بات سن کر شاید حیران ہو گئے ہیں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے، دنیا میں ہر انسان کو ایک دفعہ مرنا ہے مگر میری چنی دو بار مری ہے۔ ایک دفعہ وہ اس وقت مری جب اس کی عمر سترہ سال تھی اور پھر وہ آج سے چند ماہ قبل ستاون سال کی عمر پر مری ہے۔“

میری حیرت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں.....“ کوئی مردہ زندہ ہوا ہو، نہ کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔“ ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسے لگا جیسے یہ دونوں ہندو کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہوں اور پاگل پن میں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہوں۔ سکھ یو کا پاگل پن تو سمجھ میں آتا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی تھی۔ بیوی اسے بہت پیاری ہوگی اور اس صدمے کا اثر اس کے دماغ پر پڑا ہوگا مگر دوسرے کا پاگل پن ناقابل فہم تھا۔

”آپ کی چنی پہلی بار مری تھی تو پھر زندہ کیسے ہوئی.....؟“ میں نے سکھ یو سے پوچھا۔

”بابو جی.....!“ اس نے جواب دیا۔ ”میری شادی کو چند ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن میری چنی کو قوتیج ہوا۔ وہ درد کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسی۔ ہم اس کی انتہائی شرمناک گھاٹ لے گئے۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی مگر بھگوان کی کرپا سے۔“

وہ زندہ ہو گئی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ پھر ہم نے زندگی کے چالیس سال اکٹھے گزارے۔ اس سے میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اب میرے بچے جوان ہیں اور اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ تقریباً تین ماہ قبل میری چنی کو ٹھنڈ لگ گئی پھر تیز بخار ہو گیا۔ حکیم سے دوا کی لی مگر چوتھے دن وہ مر گئی۔ میرے گلے میں آپ جو تھیلی دیکھ رہے ہیں اس میں اس کی ہڈیاں ہیں جنہیں میں ہر دوارے لے جا رہا ہوں۔“

”لالہ جی!“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ سب ہوا کیسے؟“

”بابو جی.....!“ اس نے آہ بھر کر کہا۔ ”یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اگر میں تمہیں سنا بھی دوں تو شاید تمہاری عقل اس حقیقت کو سچ تسلیم نہ کرے۔ مگر یہ حقیقت ہے میرا سارا گناؤں اس کا گوارہ ہے۔“

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہ پٹیل کا اسٹیشن تھا اور مجھے یہاں اترنا تھا میں نے اپنا سامان اٹھایا اور گاڑی سے اتر گیا۔ ایک قسطنطنیہ تھی جو میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی کہانی شروع ہی نہ کرنا تو اچھا تھا۔

”موت کے بعد پھر زندگی ایک غیر فطری عمل تھا۔“ مجھے قوی یقین تھا کہ اس کی کہانی سچائی سے خالی ہوگی۔

میری تعیناتی جلال پور میں تھی۔ میں نے پٹیل میں دو دن گزارے۔ سرکاری کام نبھایا اور واپس جلال پور چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد میرا تبادلہ جلال پور سے مکتسر ہو گیا۔ مکتسر اب انڈیا کے صوبہ پنجاب میں ہے۔ ایک شام میں اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ گشت پر نکلا۔ مکتسر کے مین بازار میں کچھ لوگ جمع تھے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور لوگ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی دونوں کو دو دو ڈنڈے لگائے۔ وہ فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک سپاہی سے کہا۔ ”ان دونوں کو تھانے لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔“ سپاہی ان دونوں کو لے کر تھانے چلا گیا اور میں تھوڑی دیر پوچھ کچھ کے لئے وہاں رک گیا۔ ان کے مابین لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کی بازار میں کپڑے کی دکانیں تھیں ان میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اس روز معاملہ ذرا سنگین ہو گیا تھا۔

دو تین گھنٹے بعد میں جب تھانے میں داخل ہوا تو تھانے میں ان دونوں کے علاوہ ان کے چند عزیز بھی موجود تھے۔ چونکہ کیس معمولی نوعیت کا تھا اس لئے

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں دکانداروں کو ڈانٹ پلا کر ان کی آپس میں صلح کروادی جائے ایسے واقعات تو پولیس والوں کا روز مرہ کا معمول ہوتے ہیں۔ ان دونوں دکانداروں کے سر پرست باہر موجود تھے۔ انہیں بلایا ان میں سے ایک شخص کو دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے کچھ یاد نہ تھا۔

بہر حال میں نے اس سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟“ اس نے ایک دکاندار کا نام لے کر کہا۔ ”وہ اس کا پتا ہے۔“ اس نے اپنے بیٹے کی وکالت میں بولنا شروع کر دیا۔ ”ہم شریف لوگ ہیں۔ میرا شہر میں کپڑے کا کاروبار ہے۔ عرصہ دراز سے ہم نہایت ایمانداری سے کاروبار کر رہے ہیں۔ اس کی تصدیق آپ بازار سے کر سکتے ہیں۔“

میں اس کی باتیں سننے کی بجائے اس کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی جو اس شخص سے وابستہ تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

”میرا نام سکھد یو ہے، تمہارا صاحب۔۔۔!“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”آپ پورے بازار کے دکانداروں سے پتہ کریں جی۔۔۔!“

مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی سکھد یو ہے جو کچھ عرصہ قبل مجھے پتیا لے جاتے ہوئے ٹرین میں ملا تھا اور وہ ہر دو روز چار ہاتھ تھا۔

ایک رسمی سی کارروائی کے بعد میں نے فریقین میں صلح کروادی اور آئندہ دکاندارانہ کرنے کا وعدہ لے لیا۔ تمام لوگوں کو تمہانے سے چلے جانے کا کہہ کر سکھد یو کو تھوڑی دیر کے لئے رک جانے کو کہا۔ سب چلے گئے تو میں نے سکھد یو کو ہر دو روز والا سفر یاد دلایا اور اپنی کشتی کا اظہار کیا۔ اس کی جان میں جان آئی ورنہ مارے خوف کے اس کا برا حال تھا۔ میں نے اسے اگلے دو دن مصروف ہونے کی وجہ سے کہا کہ ”دو دن کے بعد شام کو آنا، تمہاری کہانی تفصیل سے سنوں گا۔“

تیسرے دن شام کو سکھد یو وعدے کے مطابق آ گیا، تھوڑی گپ شپ کے بعد اس نے اپنی کہانی شروع کی جو میں اسی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

”میں جوان ہوا تو میرے پتا نے مجھے اسکول سے اٹھالیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آٹھویں جماعت تک پڑھ لینا ہی بہت ہے۔ مجھے اپنے پتا کے ساتھ دکان پر بیٹھنا پڑا۔ گاؤں میں ہماری کپڑے کی دکان تھی۔ چار پانچ سال کے مختصر عرصے میں بھگوان کی مہربانی اور ہماری محنت سے ہمارا کاروبار چمک اٹھا پھر ہم نے ایک دکان کسٹر کے مین بازار میں بھی کھول لی۔ گاؤں والی دکان پر پتا جی بیٹھتے تھے اور شہر والی دکان میں نے سنبھال لی۔ اب میرے ماما پتا میرے بیاہ کی فکر کرنے لگے۔ میں بیاہ کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا۔ سچ پوچھیں تو میں نے کاروبار میں اپنے آپ کو اتنا الجھا رکھا تھا کہ سوائے روپیہ کمانے کے مجھے کوئی اور سوچ ہی نہ تھی۔ میری ماں میرے سر پر سہرا سجاتا چاہتی تھی لیکن میں بیاہ سے دامن بچا کر اپنے کاروبار کو بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش میں تھا۔ یہی میری ضد تھی جس کے آگے میرے گھر والے بے بس تھے۔“

ایک دن ایک لڑکی اپنی نوکرائی کے ہمراہ میری دکان پر آئی۔ میرا واسطہ ہر طرح کے گاہکوں سے رہتا تھا۔ مگر میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ رنگ بھی سانولا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی بلکہ جادو کا سا اثر تھا۔ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ لڑکی نہیں دیوی ہے۔ اس کی آنکھوں کی کشش مجھے مسحور کر رہی تھی۔ شاید میں ہونق لگ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی اور بولی۔ ”آپ کے پاس بوسکی ہوگی؟“

آپ جانتے ہیں کہ ہماری نو جوانی کے زمانے بوسکی بہت مہنگا اور مشہور کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں نے فوراً بوسکی کے تھان نکالے اور اس کے آگے ڈھیر کر دیئے۔ اس نے دو سوٹ خریدے اور چلی گئی۔

”وہ چلی گئی مگر مجھے لگا کہ میرا سب کچھ اپنے ساتھ

لے گئی ہو۔ میں آج تک حیران ہوں کہ مجھے جیسے مکمل کاروباری شخص پر اس کے عشق کا بھوت کیسے سوار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا جادو تھا جس نے میرے اندر کے نوجوان سکاھد یو کو جگا دیا۔ اب تو کسی پہلو پر نہیں نہ تھا۔ اس کو دیکھنے کی خواہش من میں پھلنے لگی۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ گھر کیا تو طبیعت بوجھل بوجھل تھی۔ وہ رات صبح طریتے سے میں سو بھی نہ سکا، صبح صبح نہا کر مندر بھی گیا۔ بھگوان سے اس کے ملن کی پرار تھا کی اور۔ امید لئے دکان پر آیا کہ شاید وہ دیوی پھر آ جائے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ابھی تو کل کپڑا لے کر گئی تھی۔

کئی دنوں کے مسلسل انتظار کے بعد میری دکان کے بھاگ جا گئے۔ اس دفعہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ آئی۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔ میرے چہرے پر ایک انجالی سی مسرت آ گئی۔ ایسے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

وہ بول پڑی: "اس دن تم نے غلطی سے کپڑا بہت سستا دے دیا تھا۔ مجھے تو شاید پتہ بھی نہ چلتا میری اس سہیلی پریم کور کو جب میں نے سوٹ دکھائے اور قیمت بتائی تو یہ حیران رہ گئی۔ اس نے یہی کپڑا چند دن گزرے کہ خرید لیا تھا۔ آج پھر ہم نے بازار سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کپڑے کا قیمت واقعی زیادہ تھا۔ لگتا ہے تم سے بھول ہو گئی ہے۔" یہ ساری باتیں وہ ایک ساتھ کہہ گئی۔

"دیوی جی! آپ نے اور کپڑا لینا ہے تو لے جائیں۔ اس سے بھی آدھے ریٹ پر دوں گا۔"

یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ "جبکہ اس بند کرو تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو کپڑے کے ٹکڑے پر بک جاتی ہیں۔" اس نے اپنا ہنوا کھولا۔ باقی رقم میرے منہ پر ماری اور بکتی جھکتی، غصے میں پیر پختی دکان سے چلی گئی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے

آخر کون سی خطا کی ہے۔ میں غلط کردار کا آدمی نہ تھا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھگی گئیں۔

منجھو میرا ایک جگہری یار تھا۔ اکثر شام کو میری دکان پر آتا تھا۔ شام کو منجھو آیا تو میں نے اسے پوری رام کہانی سنا ڈالی۔ وہ جگت استاؤ تھا۔ کہنے لگا۔ "سکاھد یو اپنا کاروبار آرام سے کرو۔ لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنا کاروبار بھی برباد کر دو گے اور بدنامی مفت میں ملے گی۔" مگر میری حالت میرے قابو سے باہر تھی۔ میں نے منجھو کی بہت منت سماجت کی پھر اس نے میری مدد کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ شاید وہ بھی معاملے کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔ اس کی دکان پر ایک بڑھیا آیا کرتی تھی جس کی لڑکیاں سوزن کاری میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ ان کے کاڑھے ہوئے کپڑے منجھو کی دکان پر لاتی تھی۔ اس کا شہر کے کئی گھروں میں آنا جانا تھا۔ منجھو نے اس سے راز داری کا وعدہ لے کر بات کی۔

"شاہ صاحب اوو بڑھیا بڑی تیز نکلی۔ اس نے لڑکی کا مکمل پتہ معلوم کر لیا۔ وہ لڑکی سیٹھ بھگوان داس کی سب سے بڑی بیٹی پشپا تھی۔ پشپا سے چھوٹی تین بہنیں اور تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ بڑھیا کے بقول پشپا پاکیزہ اور نیک لڑکی تھی۔" میں نے بڑھیا کو اس کی توقع سے بڑھ کر انعام سے نوازا، بڑھیا کی خواہش تھی کہ وہ میرے اور پشپا کے درمیان تعلیق پیدا کر دے گی مگر میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑھیا کو اس کام سے روک دیا۔

ایک دن میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ "میں سیٹھ بھگوان داس کی بڑی بیٹی پشپا سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں ساری عمر بیاہ نہ کروں گا۔" "بیاہ کا سن کر میری ماں بہت خوش ہوئی۔ اگلے ہی دن میرے ماں باپ سیٹھ بھگوان داس کی حویلی میں میرے رشتے کے لئے گئے۔ میں اس کام کو بہت دشوار سمجھ رہا تھا۔ اتفاق سے سیٹھ بھگوان داس میرے باپ کا پرانا جاننے والا نکلا اور پلک جھپکتے میری اور پشپا کی بات چلی ہو گئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد میری شادی پشپا سے ہو گئی۔

شادی سے پہلے اسے میرے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ شادی کے بعد جب اسے پوری کہانی کا علم ہوا تو وہ میری محبت کی قائل ہو گئی۔

ہماری شادی کو چند ہی ماہ گزر رہے تھے۔ پوہ کا مہینہ تھا۔ سردی بہت تھی۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا، باہر دروازے پر ایک جوگی نے صدا لگائی۔ دروازہ کھلا تھا اور جوگی کشتکول لئے کھڑا تھا۔ میری ماں نے پشپا سے کہا کہ ”جا بیٹی! جوگی بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے کچھ دے آؤ۔“

پشپا نے کچھ پیسے لئے اور جوگی کو دیئے گئی۔ جوگی نے اپنا کشتکول آگے کرنے کی بجائے پیچھے کر لیا اور نگاہیں پشپا پر مرکوز کر دیں۔ اتنے میں میری ماں بولی۔ ”جوگی بادشاہ نئی دلہن ہے۔ اس کو دعا دے دو۔“ جوگی بولا۔ ”دعا رحم کی یا قہر کی؟“

میری ماں دوڑی گئی اور کہا۔ ”مہاراج! رحم کی دعا کرو۔“

میں صحن میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جوگی نے اپنے کشتکول سے کندم کے چند دانے اٹھا کر پشپا کے منہ پر مارے اور بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ میری ماں گھبرا گئی میں نے اٹھ کر ماں کو تسلی دی مگر وہ کہہ رہی تھی کہ ”ایسے لگتا ہے جوگی ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔“

جوگی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پشپا کے پیٹ میں بائیں جانب درد شروع ہو گیا جو بڑھ گیا۔ میں دوڑ کر گاؤں کے حکیم کے گھر گیا۔ حکیم صاحب بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھے فوراً میرے ہمراہ آ گئے۔ پشپا درد سے تڑپ رہی تھی۔ حکیم صاحب نے ایک سفوف پانی میں گھول کر پشپا کے منہ میں ڈالا جس سے درد کی شدت میں کمی آ گئی مگر وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ حکیم صاحب کی دوائی کا اثر تھا یا وہ درد کو برداشت کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

حکیم صاحب نے مجھ سے کہا ”اپنی بیوی کو شہر لے جاؤں وہاں اسپتال میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس سے اس کا علاج کرواؤ۔“ میں نے فوراً ایک ٹیل گاڑی کا انتظام کیا، پشپا

کو اس میں ڈالا اور شہر کو روانہ ہوئے۔ ابھی شہر کچھ دور تھا کہ پشپا نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔

وہیں سے ٹیل گاڑی واپس موڑی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

بہر حال موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ پشپا کو میں نے بڑی چاہت سے حاصل کیا تھا۔ محبت کی جیتی ہوئی بازی میں اتنی جلدی ہار جاؤں گا اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں اس شام کو کبھی نہیں بھول سکتا جب پشپا کی ارحمی شمشان بھومی لے جائی جا رہی تھی۔ پھر میری پشپا کو بہت ساری خشک لکڑیوں میں دفن کر دیا گیا۔ کئی کنسٹرکشن ایجنسی تھی لکڑیوں پر انڈیل دیا گیا۔ شام گہری ہو گئی۔

سردی زیادہ تھی اور آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میرے باپ نے مجھے چتا کو آگ لگانے کے لئے کہا۔ مذہبی فرض کی بجائے آوری کی خاطر میں نے اپنی محبوب بھتیجی کی چتا کو آگ لگا دی۔ اب پشپا کی چتا بڑے دھیمے انداز میں جل رہی تھی حالانکہ اس پر خاصی مقدار میں بھی ڈالا گیا تھا۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ چتا کی آگ نے تھوڑی سی جگہ کو روشن کر رکھا تھا۔ ورنہ ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے رشتہ دار کھسکنے لگے۔ چتا نے مجھے کہا کہ ”تم بھی چلو صبح آ کر پھول جن لیں گے۔“

شاہ صاحب! ہم ہندو لوگ مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ میرا دل وہاں سے جانے کو نہ کر رہا تھا۔ پتا سے کہا۔ ”آپ لوگ چلیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ چلے گئے۔ میں تنہا اس ہیبت ناک مقام پر موجود رہا۔ میرے سامنے پشپا کی چتا جل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی چتا میں اس جگہ جلی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی چتا میں جلتی دیکھی تھیں۔ مگر میری بھتیجی کی چتا اس طرح نہیں جل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آگ میری بھتیجی کو جلاتا نہیں چاہتی تھی۔

تیز ہوا سے جھاڑیوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی اس سے خوف آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گرد و نواح میں بہت ساری آتماں بے چین پھر رہی ہوں۔ میرا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا رو رہا تھا۔ شدید سردی کے علاوہ جو دوسری پریشانی مجھے لاحق تھی وہ یہ کہ چٹا کی آگ ہوا کے جھونکوں سے بھڑکنے کی بجائے بجھتی جا رہی تھی۔

میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے کی جھاڑیوں میں مجھے ایک سایہ دکھائی دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس سائے پر مرکوز کر دیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ اگر میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت کرنا بھی چاہتا تو نہ کر سکتا تھا۔

وہ سایہ آہستہ آہستہ چٹا کی جانب بڑھنے لگا۔ جونہی وہ چٹا کے قریب پہنچا تو چٹا کی آگ کی روشنی میں اسے دیکھا۔ ایسے لگا جیسے میرا دل اچھل کر طلق میں آ گیا ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ وہی جوگی تھا جو دن کو ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے پشپا کے چہرے پر گندم کے دانے مارے تھے۔ وہ پوری فلم میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

جوگی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر منتر پڑھنے کے بعد اس نے چٹا کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے مشکول میں کچھ دانے تھے جن کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چٹا پر پھینکتا جا رہا تھا۔ چٹا کی آگ پہلے بھی صحیح طریقے سے نہیں جل رہی تھی۔ اب جوگی کے منتر نے یہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب آگ مکمل طور پر بجھ چکی تھی۔ جوگی کے منہ سے غیر مبہم سی آوازیں مسلسل نکل رہی تھیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میرے دل میں خوف کی شدت میں بھی کمی آ رہی تھی۔

جب آگ اچھی طرح بجھ گئی تو جوگی نے اپنا مشکول زمین پر رکھ دیا اور چٹا کی لکڑیوں کو ہٹا کر شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ پشپا کی لاش تک آگ پہنچی تھی

یا نہیں کیونکہ اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ اس نے پشپا کی لاش کو اٹھا کر چٹا کے ساتھ زمین پر رکھ دیا اور خود لاش کے سر کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر وہی غیر مبہم سی آوازیں اس کے منہ سے نکلتے لگیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر جوگی نے اٹھ کر پانی کی طرح کا کوئی مگنول پشپا کی لاش پر پھینکنا شروع کیا۔

شاہ صاحب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کو میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا۔

میرے سامنے پڑی ہوئی پشپا کی لاش نے حرکت کی۔ پھر جوگی نے اسے ایسے اٹھایا جیسے کوئی کسی کو سوتے میں جگاتا ہے۔ پشپا اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔

میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رک گئی۔ میرا دماغ اذف ہو چکا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ یہ کیا ہے کہ جوگی ایک طرف چل پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے پشپا اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی سدھایا ہوا جانور اپنے مالک کے پیچھے چلتا ہے۔

کچھ دیر تو میں وہاں شمشان بھوی میں بیٹھا رہا۔ میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ شمشان بھوی سے تھوڑی دور راستے کے ساتھ چند مسلمان کسانوں کے گھر تھے۔ ان لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ راستے کے بائیں ساتھ والا گھر شمشاد خان کا تھا۔ جب جوگی ان مسلمان کسانوں کے گھروں کے پاس سے گزرنے لگا تو میری نگاہ ایک کسان پڑی جو اس بلا کی سردی میں لائین لے کر مویشیوں کے باڑے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کوئی قوت بیدار ہو گئی ہو۔ میں نے پورے زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ جتنا شور مچا سکتا تھا مچایا اور ساتھ ہی جست لگا کر پشپا کو پکڑ لیا۔

جونہی میں نے پشپا کو چھوا تو وہ ایک بے جان مجسمے کی طرح زمین پر گر پڑی۔ چند کسان لائیاں لے

پولیس آفیسر ہیں۔ ان کے نام میں بتا دیتا ہوں۔ ان کو بلوا کر قہر یق کر لیں۔“

”پشپا اور تمہارا پھر کتنے عرصے کا ساتھ رہا؟“ میں نے سکھد یو سے پوچھا۔

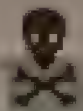
”ہم دونوں تقریباً چالیس برس اکٹھے رہے۔“ چند لمحے اس نے خلاء میں گھورنے کے بعد کہا۔ ”اس کے نظن سے میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان چالیس برسوں میں، میں نے کئی بار اس سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا مگر ہر بار اس کا یہی جواب تھا۔“ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ مرنے سے تین چار دن قبل اس کو ٹھنڈ لگ گئی اور تیز بخار ہو گیا۔ یہی بخار اس کی موت کا باعث بن گیا۔

”اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والے کئی لوگ ایسے بھی تھے جو چالیس برس پہلے بھی پشپا کی ان رسومات میں شرکت کر چکے تھے۔ اس بار بھی چتا کو میں نے آگ لگائی۔ اب کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا آگ نے پشپا کو جلا کر راکھ کر دیا۔“

سکھد یو نے مزید بتایا کہ ”پشپا کی خواہش تھی کہ اس کے پھول ہر دو درے جا کر گنگا میں بہائے جائیں۔“ چنانچہ وہ اس کے پھول (ہڈیاں) لے جا رہا تھا تو مجھ سے ٹرین میں اس کی ملاقات ہوئی۔

بوڑھے سکھد یو کی یہ حیران کن کہانی میں نے سن لی اور وہ چلا گیا۔ میں خاصی دیر سوچتا رہا، کیا ایسا ممکن ہے؟ یہ کہانی میں کبھی فراموش نہ کر سکا۔ ایک دفعہ سکھد یو کے گاؤں کا ایک جہان دیدہ شخص مجھے مل گیا۔ اس کہانی کے متعلق اس سے پوچھا۔

”تھانیدار صاحب!“ اس شخص نے کہا۔ ”واقعی ہمارے گاؤں میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ سکھد یو نامی شخص کی پتی کو سکتہ ہو گیا تھا۔ لوگ سمجھے وہ مر گئی ہے۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی پھر ایک جوگی نے منتر پڑھا اور وہ پھر ہوش میں آ گئی۔“



کردوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ شمشاد خان آگے آگے تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں چار پائی پر پڑا تھا۔ حکیم امجد علی میرے سر ہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ رشتہ دار ہمارے گھر میں جمع تھے۔ سب سے پہلے میں نے پشپا کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں ہے اور ہوش میں آ چکی ہے۔

شمشان بھومی کے باہر جب میں چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا تھا تو شمشاد خان اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اور پشپا کو اٹھا کر ہمارے گھر لے آئے تھے۔ جہاں میں اور پشپا کچھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آ گئے تھے۔ اس جوگی کا کسی کو پتہ نہ چلا کہ کدھر غائب ہو گیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے تمام حالات تفصیل سے بیان کئے۔ تمام لوگ حیران رہ گئے۔ اگر وہ میری کہانی پر یقین نہ بھی کرتے تو کیا کرتے کیونکہ ان میں سے بہت سارے لوگ ایسے موجود تھے جن کے سامنے پشپا مری تھی اور انہوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔

شاہ صاحب! آپ یہ سن کر اور زیادہ حیران ہوں گے کہ پشپا نے اس کہانی پر بالکل یقین نہ کیا۔ وہ کہنے لگی کہ ”استہنا ہی یاد ہے کہ جوگی ہمارے دروازے پر آیا تو وہ اس کے پاس گئی۔ جوگی نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ اس کو اپنے اندر بجلیاں سی کوندنی محسوس ہوئیں پھر جوگی نے گندم کے چند دانے کشتول سے اٹھا کر اس کے منہ پر مارے اور وہ چلا گیا۔ اس کے بعد پشپا کے پیٹ میں درد اٹھا جو بڑھتا ہی گیا۔“ پشپا نے کہا کہ ”اسے یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اسے دوائی دی تھی اور پھر وہ سو گئی یا بے ہوش ہو گئی تھی۔“ پشپا نے کہا۔ ”اسے ہوش آیا تو وہ گھر میں اپنی چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہیں۔“

آپ یقین کریں! یہ واقعہ بالکل سچا تھا اور اس کے بہت سارے عینی گواہ اب بھی زندہ ہیں۔ آپ





خوف کا شکار

خلیل جہار - حیدر آباد

آدھی رات کے وقت کمرے میں ایک گرجدار کھردری آواز ابھری، اس مکان کو فوراً خالی کر دو، ورنہ مرتے کے لئے تیار ہو جاؤ، آواز اتنی دھشت ناک تھی کہ سنے والوں کے پسینے چھوٹ کٹے کہ اتنے میں

حقیقت سے فرار انسان کو ناقابل اذیت سے دوچار کر دیتا ہے، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

ہو جانے پر اسے واپس اپنے ملک آ جانا تھا اور دو سال میں وہ اتنی دولت کمانے میں کامیاب ہو جاتا کہ اپنا ذاتی گھر خرید لے۔

عمران کے والد شرف الدین کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنا ذاتی مکان خرید کر اس میں اپنی زندگی گزاریں مگر ساری زندگی ان کی کرائے کے مکانات میں ہی گزری تھی۔ زندگی میں انہوں نے یہ اچھا کام کیا تھا کہ

جب سے رومی کی شادی ہوئی تھی، وہ ایک عجیب خوف کا شکار تھی۔ جب تک اس کا شوہر عمران اس کے ساتھ تھا اسے اپنے کمرے سے اتنا خوف نہیں آتا تھا۔ جتنا اب آنے لگا تھا۔ عمران جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کمپنی نے اسے دو سال کے لئے بیرون ملک بھیج دیا۔ وہ بھی بہت خوش تھا۔ اس طرح عمران کو زیادہ رقم کمانے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ دو سال کا معاہدہ پورا

Dar Digest 81 May 2015

اپنے بیٹے عمران کو بڑھا لکھا دیا تھا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے سبب ہی پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے کی نوکری مل گئی تھی، شرف الدین اچھی تعلیم نہ ہونے کے سبب ساری زندگی محنت مزدوری کرتے رہے، ایک مزدور آدمی گھر کا چولہا جلا لے دینی بڑی بات ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ ذاتی مکان کیسے خرید سکتا ہے۔ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے یہ ان کی زندگی کا آخری مکان تھا۔ جوانیوں نے بدلاتھا۔ عمران کی شادی کے چھ ماہ بعد کی زندگی نے شرف کو مہلت نہ دی اور ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس مکان میں رومی رہتی تھی وہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں اس کی ساس رحمت بی بی سوتی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں رومی خود سوتی تھی۔ وہ رات کو جب کمرے میں سوتی اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کمرے میں کوئی ہے۔

آج بھی وہ کھکی باری بستر پر لیٹی تو فوراً ہی نیند آ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک انتہائی بد صورت آدمی گھوڑے پر سوار ہے اور رومی اسے دیکھ کر بھاگ رہی ہے۔ وہ اپنی تیز دھار ٹکوار سے اسے ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا تھا لیکن پھر بھی رومی کے قریب نہیں آ پا رہا تھا۔

اچانک رومی کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے شخص نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور ٹکوار سمیت گھوڑے سے کود پڑا۔ رومی اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر چیخ پڑی۔ اسے رومی کی چیخ کی کیا پرواہ تھی۔ اس آدمی نے ایک بھر پور وار سے اس کی گردن جسم سے جدا کر دی اور اس نے بالوں سے رومی کے تن سے جدا سر کو فضا میں بلند کیا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ انتہائی مکروہ نظر آ رہا تھا۔

ایک جھٹکے سے رومی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے سے نہا رہا تھا۔ ابھی وہ چار پائی سے اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بدن پر کوئی بھاری شے ریگ رہی ہو۔ اس کے وزن سے رومی کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ

سے چیخ نکلی۔ رومی کے منہ سے چیخ کا ٹکٹا تھا کہ وہ شے اس کے بدن پر سے اپنا وزن کم کرتی چلی گئی۔ رومی نے جیسے ہی محسوس کیا اس کے بدن سے وزن کم ہو گیا ہے وہ فوراً بستر سے اٹھی اور اپنی ساس رحمت بی بی کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس کی بے ترتیب سانسوں اور گھبراہٹ کو دیکھ کر ساس بھی گھبرا گئی۔

”کیا بات ہے بہو خیریت ہے تا تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”وہ..... وہ..... وہ..... آ..... امی.....“

”ہاں، ہاں بولو کیا بات ہے۔ وہ کیا ہے لیکن پہلے ٹھہرو تم یہ پانی پی لو تا کہ تمہاری گھبراہٹ دور ہو۔“ رحمت بی بی نے ایک گلاس رومی کی طرف بڑھایا۔

رومی نے جیسے ہیے کر کے پانی کا گلاس پی لیا۔ چند لمحوں میں وہ اس قابل ہو گئی کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات بیان کر سکے جب اس نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعہ کا ذکر کیا۔ رحمت بی بی مسکرا دیں۔

”بس اتنی سی بات..... خواب دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہو گئی ارے بھئی ایسے خواب کبھی کبھار آ جاتے ہیں اس میں اتنا گھبرانے کی کون سی بات ہے۔“

”میں جب نیند سے بیدار ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی بھاری شے میرے جسم پر چل رہی ہے۔ میرے چیخنے پر وہ شے میرا جسم چھوڑ کر چلی گئی۔“ رومی نے بتایا۔ ”یہ تمہارا وہم ہے ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بھاری شے تمہارے جسم پر چلے اور تمہیں کچھ نہ ہو۔“ رحمت بی بی نے کہا۔

”میری بات کو جھوٹ نہ سمجھیں یہ حقیقت ہے۔“ رومی روہا سی ہوتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم کیا چاہ رہی ہو وہ بتا دو۔“

”میں اس کمرے میں اب نہیں سوؤں گی۔“

رومی نے فیصلہ سنا دیا۔

”بس اتنی سی بات، ٹھیک ہے تم مت سونا۔“

”ہاں بس ایسی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے کل میں تمہارا خوف دور کرنے کے لئے اکیلی اس کمرے میں سوؤں گی۔“
 ”کیا ہوا امی؟“ رومی نے کمرے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔
 ”ارے بخت بلے نے میرا پیٹ پھاڑ دیا ہے۔“

”لیکن پیٹ تو ٹھیک لگ رہا ہے۔“
 ”ارے ہاں واقعی میرا پیٹ بالکل ٹھیک ہے مگر کمرے میں مجھے ایسا لگا تھا کہ اس منخوس کا لے لے لے پیٹ پھاڑ دیا ہے اور سرخ خون بھی تیزی سے بہہ رہا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ اس کمرے میں کچھ ہے۔“ رومی نے کہا۔
 ”ہاں بیٹی تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تمہارا کمرہ آج بھی عمران بھی ملک سے باہر چلا گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کریں۔“
 ”کہیں ہمیں یہ آسیب نقصان نہ پہنچا دے۔“

”میں نے کہا۔“
 ”ہاں تک کرنا تو شروع کر دیا ہے۔ کسی دن نقصان بھی پہنچا سکتا ہے ہمیں آسیب سے بچنے کے لئے کچھ نہ کرنا پڑے گا۔“ رحمت بی بی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا اور پھر وہ بولیں۔ ”آؤ بیٹی تمہارے کمرے میں چل کر کچھ سوچتے ہیں۔“ رحمت بی بی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”امی کیا بات ہے مجھے آپ زیادہ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہیں۔“
 ”ہاں ایسی ہی بات ہے مجھے کچھ یاد آ گیا ہے۔“
 ”کیا یاد آ گیا ہے؟“ رومی نے پوچھا۔
 ”آج سے پندرہ سال پہلے میں جہاں رہتی تھی۔ وہاں ہمارے پڑوس میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہونے لگے تھے۔“

”کیسے واقعات؟“
 ”اس طرح کے جیسے اب ہمارے ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس گھر کے لوگوں کو ڈرایا جانے لگا تھا۔ جب انہوں نے اس کانوٹس نہیں لیا تو پھر ایک دن اس گھر میں

”تم بالکل بے فکر ہو مجھے ایسا کچھ نہیں ہوگا جو تم سوچ رہی ہو۔“ رحمت بی بی نے رومی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دوسری رات آنے پر رومی کے بار بار منع کرنے پر بھی رحمت بی بی اس کمرے میں سو گئیں۔ وہ رومی کو مطمئن کرنے کو کمرے میں بظاہر سو رہی تھیں لیکن وہ جاگ رہی تھیں۔ اندر سے وہ بھی خوف زدہ تھیں کہ کہیں واقعی اس کمرے میں آسیب نہ ہو کیونکہ آسیب ہی مختلف شکل میں آ کر تنگ کرتے ہیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی ان کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ بار بار کروٹیں بدل بدل کر غیند کو لانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر نجانے کب انہیں نیند آ گئی۔ ایک خوفناک شکل کا کالا بلا تیرتی ہوئی اس کی جانب آیا۔ اسے دیکھ کر رحمت بی بی کی کھال بندھ گئی۔ بے اختیار ان کا دل چاہا کہ وہ بستر سے اٹھ کر بھاگ جائیں مگر ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ کالا بلا چھلانگ لگا کر ان کے پیٹ پر سوار ہو گیا۔ وہ بہت وزنی تھا۔ انہیں اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں باہر کو اپنے لگیں۔ کالا بلا اپنے پچھلے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ آگے کے دونوں پاؤں کے نیچے اس نے رحمت بی بی کے سامنے لہرائے ان بیٹوں میں تیز دھار ناخن چمک رہے تھے۔ وہ حیرت سے ان ناخنوں کو دیکھنے لگیں۔ کالا بلا تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے وہ ناخن رحمت بی بی کے پیٹ میں داخل کر کے پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پیٹ پھٹنے کی دیر تھی کہ اس میں سے سرخ خون تیزی سے بہنے لگا۔ بڑی بی بی میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ انہوں نے زور سے کالے بلے کو دھکا دیا اور خود اپنے پیٹ کو پکڑ کر چیختی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر دوڑ پڑیں ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ

جو آسیب تھا وہ ان کی جوان لڑکی کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اور اس نے گھر میں توڑ پھوڑ کرنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ کبھی وہ لڑکی گھر کے لڑکوں کو مارتی، کبھی انہیں دبوچ کر ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اتنی طاقتور ہو جاتی تھی کہ کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی، کئی کئی لوگ مل کر اس لڑکی کو قابو کرتے تھے۔ اُسے رسیوں میں جکڑ دیتے تھے۔ تب کہیں جا کر قابو میں آتی تھی۔

”پھر کیا ہوا؟“

”ان لوگوں نے کسی مولوی سے لڑکی کا علاج کرایا۔ لڑکی کا علاج ہو جانے پر وہ گھر خالی کر کے چلے گئے۔“

”جب لڑکی کا علاج ہو گیا تھا پھر وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔“ رومی نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے کہ مولوی صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے لڑکی کا علاج ضرور کر دیا ہے مگر اس گھر میں جو قلوں رہتی ہے وہ پھر کی اور کے جسم میں داخل ہو کر اس لڑکی سے زیادہ تمہیں پریشان کرے گی اس لئے ان لوگوں کا گھر خالی کر دینا ہی ان کے حق میں بہتر ہے اور آج تک وہ گھر انسانوں سے آباد نہیں ہو سکا۔ ابھی تک خالی ہے۔“

”تو کیا ہمیں بھی یہ گھر خالی کرنا پڑے گا۔“

رومی سوچ میں پڑ گئی۔

”تم پریشان مت ہو، مجھے کچھ سوچنے دو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ رومی کے پاس آئیں۔

”رومی بیٹی میں عمران کے ماموں کے پاس جا رہی ہوں۔“

”امی مجھے کیلے میں ڈر لگے گا۔“ رومی نے کہا۔

”تم ڈرو نہیں، اگر ڈر محسوس ہو تو برابر واسلے گھر سے لطیفیں آپا کو بلا لیں۔“ وہ بولیں۔

رومی اچھا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ رحمت بی بی کے جانے پر رومی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں ایسی مصروف ہوئی کہ اسے ڈر و خوف کا احساس ہی نہیں ہوا۔

وہ اس وقت چونکی جب ساس گھر میں داخل ہوئیں۔

وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”ہاں بھئی میرے جانے پر کچھ ہوا تو نہیں۔“

”امی جان مجھے بتائی نہیں چلا۔ دن میں ویسے بھی ڈر کہاں لگتا ہے، رات کی تاریکی میں خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیا ماموں سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں بھئی ملاقات ہو گئی اور ملاقات کیسے نہ ہوتی۔ سارا دن وہ گھر میں بنائے ہوئے آستانے میں آنے والے لوگوں کے بچوں پر جھاڑ پھونک کرتے رہتے ہیں، یہی ان کی مصروفیت اور یہی ان کا روزگار ہے۔“ رحمت بی بی نے بتایا۔

”ماموں نے کیا بتایا۔“

”انہوں نے یہی کہا ہے کہ ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود کسی دن گھر پر آئیں گے اور دیکھیں کہ آسیب ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ یہ چار تعویذ جلائے کے لئے دیئے ہیں روزانہ ایک تعویذ جلائے ہوگا۔“ رحمت بی بی نے بتایا۔

”ماموں سے کہیں جلدی آجائیں، خدا نخواست کچھ ہونہ جائے۔“ رومی نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا۔ ماموں بہت پیچھے ہوئے عامل ہیں ان کے آگے بڑے سے بڑا جن بھئی ناک رگڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“ رحمت بی بی نے بتایا۔

”کیا واقعی؟“ رومی چونکی۔

”ہاں، ہاں، بھئی مجھے تم سے جھوٹ بول کر کیا ملے گا۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ رومی مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔

عصر کے فوراً بعد رحمت بی بی نے ماموں کا دیا ہوا ایک تعویذ صحن میں جلا دیا اور اس کی راکھ کوتالی میں بہا دیا۔ وہ مطمئن تھیں کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ قلوں انہیں پریشان نہیں کرے گی۔ جب رات وہ سونے کو بستر پر لیٹیں۔ گھر میں سناٹا تھا وہ پرسکون نیند سو گئیں اچانک رات کا وہ نجانے کون سا پہر تھا کہ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا ہے۔ رومی

کے کمرے سے برتن پھینکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔
رات کی تاریکی میں وہ آوازیں بہت زور سے سنائی
دے رہی تھیں۔ برتنوں کے زمین پر گرنے اور ٹوٹنے کی
آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

خوف کے مارے وہ دونوں لرز کر رہ گئی تھیں۔
خوف و وحشت سے ان کے منہ سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔
وہ زور زور سے چیخ کر محلے والوں کو گھر میں بلانا چاہ رہی
تھیں مگر ان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل پا رہا تھا۔

پوری رات ایسے ہی ڈرتے ہوئے گزری۔ رومی
کے کمرے میں اتنے برتن نہیں تھے جتنے برتن رات بھر
گرتے اور ٹوٹتے رہے۔ فجر کی اذانیں ہونے پر یہ سلسلہ
بند ہوا۔ اور ان دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ رات بھر
جاگتے رہنے سے ان کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ چند لمحے کو
سکون میسر آنے پر وہ بستر پر ایسے سوئیں کہ دن چڑھے ہی
ان کی آنکھیں کھلیں دوپہر کے دو بج رہے تھے۔

رومی نے ہاتھ روم جاتے ہوئے اپنے کمرے
میں ایک نظر ڈالی اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا رات بھر
برتن گرتے اور ٹوٹتے رہنے کی آوازیں ان دونوں سانس بہو
نے سنی تھی۔ مگر کمرے میں ایک برتن زمین پر ٹوٹا دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔ بالکل اسی طرح صاف ستھرا دکھائی
دے رہا تھا جیسے رات میں اس کمرے میں کچھ ہوا ہی
نہیں ہے۔ رومی کے سانس کو ہٹانے پر انہوں نے بھی
کمرے میں ایک نظر ڈالی اور اسے رومی کی بات سچ
ثابت ہوئی۔

”حیرت کی بات ہے رات کو ایسا لگ رہا تھا کہ
پچاس نہیں کتنے برتن ٹوٹ رہے ہیں۔ مگر کمرے میں ایک
برتن بھی نہیں ٹوٹا۔“ رحمت بی بی نے کہا۔

”ای یہ بڑے ہی خطرناک قسم کے آسیب ہیں
جو ہمیں اس طرح تنگ کر رہے ہیں۔“ رومی نے کہا۔

”بیٹی تم فکر مت کرو، عمران کے ماموں بھی کوئی
کم نہیں وہ بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر اس آسیب کو بھگانا
آسان نہ ہوتا تو وہ پہلے ہی بتا دیتے۔“ ساس نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

عصر کے وقت دوسرا تعویذ بھی جلا دیا گیا۔ رات
ہونے پر وہ دونوں سانس بہو ایک ہی کمرے میں
سو گئیں۔ آدھی رات گزر جانے پر شور سے ان کی آنکھ
کھل گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے چھت پر کوئی شادی
کی تقریب ہو اور لوگ خوشیاں مناتے ہوئے رقص و محفل
کی تقریب سجائے ہوئے ہوں پھر کچھ دیر گزر جانے پر
ایسا لگا کہ بیک وقت بہت سارے لوگوں نے چھت پر
اچھل کود شروع کر دی۔ وہ دونوں سہمی ہوئی بستر پر لیٹی
رہیں۔ جیسے ہی فجر کی اذانوں کا آواز آئیں۔ چھت
پر ایسا سناٹا چھا گیا جیسے کوئی موجود ہی نہ ہو۔ ان کی
آنکھیں غیند سے بوجھل تھیں اس لئے سکون ہونے پر
انہیں غیند آگئی اور صبح ہونے پر ہی وہ بیدار ہوئیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر رومی چھت پر ڈرتے
ڈرتے گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی رات کو چھت پر شادی
کی تقریب منعقد تھی ضرور چھت پر پھول وغیرہ پڑے
ہوں گے مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ چھت بالکل
صاف پڑی تھی۔

شام میں تیسرا تعویذ بھی جلا دیا گیا۔ حسب
معمول رات میں آسیب نے انہیں ڈرانے کے لئے
زور زور سے کبھی کھڑکی، کبھی دروازہ بجانا شروع کر دیا۔
دروازے اور کھڑکی کو اتنے زور سے بجایا جارہا تھا کہ ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ٹوٹ کر گر پڑیں گے، خاصی دیر
دروازہ اور کھڑکی بجنے کے بعد خود ہی بجنا بند ہو گئے
تھے۔ روزانہ کی طرح آج انہیں آسیب سے ذر کم محسوس
ہوا تھا۔ صبح بیدار ہونے پر وہ دونوں معمول کے کام میں
مشغول ہو گئی تھیں۔ شام ہوئی اور چوتھا تعویذ بھی جلا دیا
گیا۔ رات ہوئی اور آسیب کی موجودگی ظاہر ہو گئی۔ وہ
انتہائی بد صورت شخص تھا جو بند دروازے کے اندر سے
کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی
دے رہا تھا۔

”ایسے ہمیں کیا دیکھ رہا ہے، چل یہاں سے دفع
ہو جا۔“ رحمت بی بی نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے
کہا۔

اس نے جواب میں کچھ کہا۔ مگر وہ ایسی زبان میں تھا جو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بولتا رہا اور رحمت بی بی وہاں سے اسے چلے جانے کو کہتی رہیں۔ وہ بھی ڈھیس بنا کھڑا رہا جب رحمت بی بی نے عمران کے ماموں کی دھمکی دی کہ وہ آکر ان سے خوب بیٹے کا تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اسے جاتا دیکھ کر ساس اور بہو دونوں خوش ہو گئیں۔ انہیں عمران کے ماموں کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ آسیب پر ماموں کی دھمکی کام کر گئی تھی۔ وہ انہیں مزید خوف زدہ کرنے کے بجائے خاموشی سے چلا گیا۔ وہ اس کے جانے پر سکون سے سو گئیں۔

شام ہونے پر دروازے پر دستک ہوئی۔ رومی نے ٹپک کر دروازہ کھولا، دروازے پر عمران کے ماموں کھڑے تھے۔ اس نے انہیں اندر آنے کو راستہ دیا۔ ماموں اندر چلے آئے۔ دونوں نے چار دیواری کی تفصیل پوچھی۔ ان پر جو گزری تھی وہ سب انہوں نے بیان کر دی۔

”میرا شک درست تھا۔“ وہ بولے۔

”کیسا شک؟“ وہ دونوں چوکی۔

”یہی کہ وہ آسیب تمہیں محض خوف زدہ کر کے بھگانا چاہتا ہے، وہ تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ ماموں نے کہا۔

”کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔“ رومی نے پوچھا۔

”ہاں جی یہ حقیقت ہے، جنات کے وجود کو ہم جہنم نہیں سکتے۔ جنات کی دو قسم ہیں ایک قسم شریف ہے جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی جبکہ دوسری قسم جہنم پر ہوتی ہے وہ دیر ان گھروں اور درختوں پر بسیرا کرتے ہیں وہ انسانوں کی کمزوری سے واقف ہوتے ہیں اس لئے انہیں خوف زدہ کرنے کو ڈراتے ہیں۔ انسانوں کو ڈرانے کے لئے یہ مختلف روپ اختیار کر لینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان سے بچنے کا آسان طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ان سے ڈرانے جانے۔ تم نے دیکھا جب آسیب سے نہیں ڈریں تو وہ میری طرف دھمکی دینے پر فوراً ہی دفع ہو گیا۔ یہ بات میں اس وقت بھی تمہیں بتا سکتا تھا لیکن تمہیں میری بات کا یقین نہ آتا اور تم کسی اور

ٹھگ کے پاس چلی جاتی اور اپنی جمع پونجی انا بیٹھتیں، میں نے تمہیں چار تعویذ اس لئے دیئے تھے، میرے دیئے تعویذ جتانے سے تم میں اعتقاد پیدا ہوا اور تم نے آسیب سے ڈرنا چھوڑ دیا اور دھمکی بھی دے دی۔ بس میں یہی چاہتا تھا کہ تم آسیب سے ڈرنا چھوڑ دو اور وہ تمہیں ڈراتا چھوڑ دے گا۔“ ماموں نے کہا۔

”ہاں ماموں واقعی ہم تعویذ جتانے سے پہلے آسیب سے بہت خوفزدہ تھے اور اس گھر کو چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے تھے اب ہم میں اعتقاد آ گیا ہے اور جب اس کے ڈرانے پر ہم خوف زدہ نہیں ہوں گے تو وہ بھی ڈرنا چھوڑ دے گا۔“ رومی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

رومی کی بات سن کر ساس بھی مسکرا دیں۔

ماموں بھی خوش تھے کہ وہ دونوں جان چکی ہیں

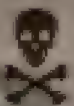
کہ آسیب پر قابو پانے کے لئے ڈر و خوف پر قابو پانا ہوگا۔

وہ بچتے ان کے امتحان کے تھے۔ آسیب نے

ہمت نہیں ہاری تھی۔ کئی بار وہ دونوں ساس بسو کو ڈرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر خود ہی ہار گیا۔ اور انہیں ڈراتا اور خوف زدہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ بھی خوش تھیں کہ ان کے ذرا ہمت دکھانے سے آسیب کو شکست ہو گئی ہے۔

عمران کے وطن لوٹ آنے تک وہ خوب مزے سے اس گھر میں رہیں۔ محلے والے بھی ان پر حیرت کرتے تھے کہ وہ دونوں نور تھیں ہو کر بھی اس آسیب زدہ گھر میں رہ رہی ہیں۔ لیکن یہ راز وہ دونوں ہی جانتی تھیں کہ آسیب کو کس طرح انہوں نے شکست دی ہے۔

عمران بیرون ملک رہ کر اتنا کماتا تھا کہ اس نے پہلی فرصت میں رہنے کے لئے ایک اچھا سا بنگلہ خرید لیا تھا اس گھر سے رخصت ہوتے وقت ساس نے پندرہ سیوں کو وہ راز بتا ہی دیا تھا کہ اس گھر میں جب بھی کوئی رہنے کے لئے آئے وہ آسیب کے ڈر سے بھاگنے کے بجائے اسے شکست دے کر شان سے گھر میں رہے۔





ناگ منکا

عابد علی جعفری - کنڈیاں

ایک دہشت ناک اور خوفناک ناک کی دیدہ دلبری کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے دشمن سپیرا کی تلاش میں سرگرداں رہا، پل پل کے لئے ناک کا سکون برباد ہو چکا تھا اور پھر اس نے اپنا انتقام

مقتل کو حیران اور دل کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی عجیب و غریب ناقابل فراموش کہانی

کو دیکھ کر میرا دل لرز اٹھا اور میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔
موم بتی سارے ماحول کو روشن کرنے میں ناکام
ہو رہی تھی۔

کہ اچانک آسمان پر بجلی چمکی تو مجھے معلوم ہوا کہ
میں ایک غار میں ہوں اور میرے ہاتھ پیچھے پیچھے پر باندھ
دیئے گئے ہیں۔ بجلی چمکنے سے غار کا دبانہ روشن ہوا جہاں
سے ایک شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ

جب میری آنکھ کھلی تو ہر طرف خاموشی کا
راج تھا۔ میرا سر ابھی تک درد کر رہا تھا، رات کا وقت
ہونے کی وجہ سے ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔
معلوم نہیں یہ کون سی جگہ تھی اور تو اور مجھے کوئی بات یاد
نہیں آ رہی تھی۔ میں کہاں ہوں یہ کون سی جگہ ہے؟
بہر حال میں جس ماحول میں تھا ایک موم بتی روشن تھی
جو ایک انسانی کھوپڑی کے اوپر رکھی ہوئی تھی، کھوپڑی

کو کالے لباس میں چھپایا ہوا تھا۔ چہرے پر نقاب تھا اور تو اور اس کی آنکھیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

وہ میرے قریب نہ آیا بلکہ غار کے ایک کونے میں کچھ اور موسم بیاں کھوپڑیوں پر رکھ کر جلا رہا تھا۔ اب بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی بھی بار بار آسمان اور ارد گرد کے ماحول کو روشن کر رہی تھی۔

کالے لبادے میں چھپا وہ شخص مسلسل کسی انجان زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اور پھر مجھے پتا چلا کہ اس غار میں، میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ ایک اور بدنصیب شخص بھی اگلے منہ پڑا ہے۔

کچھ دیر بعد پھر ماحول پر خاموشی چھا گئی بارش بھی ختم گئی۔ وہ کالے لبادے والا اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھا۔

پھر وہ کچھ دیر بعد اٹھا اور اس بدنصیب شخص کو اٹھا کر اسی کونے میں لے گیا، اس نے تمام موبقیات کل کر دیں سوائے ایک کے، کچھ دیر خاموشی ماحول پر چھائی رہی۔

پھر اس خاموشی میں کسی کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگی جیسے کسی کو ذبح کر دیا گیا ہو۔ پھر ایسی آوازیں سنائی دیں کہ جیسے کوئی غٹا غٹ کچھ لی رہا ہو۔

میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے بہت مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا تھا پھر ہوا میں کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر گری وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جو کچھ دیر پہلے اس بدنصیب شخص کے بدن پر موجود تھی۔

اب بات مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ "اس کالے لبادے والا شخص کوئی عمل کرنے کے بعد انسانی خون پی رہا تھا۔ اور میں بھی اسی سلسلے میں یہاں موجود ہوں اور اب میری باری ہے۔" یہ خیال آتے ہی میرے تور و ننگے کھڑے ہو گئے۔ میری سانس گلے میں رک کر رہ گئی میرا سر چکرا گیا اور تمام بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔

اس وقت میری زبان پر جو کچھ آ رہا تھا میں اس

کا ورد کر رہا تھا۔ اور خدا سے اپنی جان کی آزادی کے لئے دعا بھی کر رہا تھا۔ شاید کہ کوئی راستہ نکل آئے اور میری جان بچ جائے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت نیک انسان ہوں اور میں نے زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا جدید دور کا انسان ہونے کی وجہ سے کچھ میری عادتیں بری بھی ہیں لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے میرے والدین کو شرمندگی اٹھانی پڑی ہو۔

آج کل کے فیشن کے مطابق میں نے بڑے بڑے بال اپنے سر پر سجائے ہوئے ہیں جو دھوپ میں خوب چمکتے ہیں۔ چہرے پر ہلکی ڈارمی بھی ہے جو آج کل کے فیشن کے مطابق ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود میں نماز روزے کا پابند ہوں اور اکثر کلام الہی کی تلاوت بھی کرتا رہتا ہوں، اس وقت میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی اور اپنی زندگی کی دعا بھی کر رہا تھا۔

ماحول میں خاموشی کا ایک بار پھر راج تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، بس پورے غار میں اس پر اسرار کھوپڑی پر ایک ہی موسم ہی روشن تھی جو اب اپنی آخری سانس گن رہی تھی جلد ہی اس کا کام بھی تمام ہونے والا تھا۔

پھر اس خاموشی میں مجھے اپنے قریب کوئی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سرگرد کیا تو وہ کالے لبادے والا شخص میرے سر پر کھڑا تھا۔

پھر میری کرب ناک چیخوں سے غار گونج اٹھا وہ شخص میری لمبی زلفوں سے مجھے پکڑ کر غار کے اس کونے کی طرف لے گیا، پھر ملی زمین ہونے کی وجہ سے میرا بدن زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ اس بے رحم شخص کو کوئی ترس نہیں آ رہا تھا۔

میری زبان پر مسلسل آیات کا ورد جاری تھا اور اپنی جان کے لئے خدا کے حضور دعا کر رہا تھا۔

اس نے کونے میں جس جگہ باقی کھوپڑیاں پڑی تھیں اس کالے لبادے والے نے مجھے چھوڑ دیا اور موسم

انمول موتی

☆ ساری دنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لئے چاہتے ہیں، صرف ایک تیرا رب ہی ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لئے چاہتا ہے۔

☆ جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندہ کو اپنے عیبوں کا پتہ چلنے لگتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔

☆ کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا رب کریم اپنے بندہ کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔

(شرف الدین جیلانی - شذوالہ یار)

انسانی روپ میں ایک ناگ ہوں جس پر انسان نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

”اس ظلم کا بدلہ میں پوری انسان برادری سے لے رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیا ظلم ہوا ہے تم پر اور ہم کہاں ہیں اور جہاں تک مجھے کچھ یاد پڑتا ہے تو میں شام کی کلاس اٹینڈ کر کے واپس فلیٹ پر آ رہا تھا جو کہ میرے ماموں کا ہے وہ اس شہر میں کام کرتے ہیں۔“

”ہاں نو جوان، ہم شہر سے بہت دور ایک پہاڑی علاقے میں ہیں، یہاں لوگوں کو آنے سے روکا جاتا ہے تم نے ایک شخص سے لفٹ لی تھی اور اس نے تم کو کچھ کھانے کو دیا تھا۔ بس اس چیز کی اثر کی وجہ سے ہی تم یہاں پر موجود ہو۔“

”میرا نام راتاش ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں ایک ناگ ہوں۔ میری عمر سو سال سے اوپر ہے اور اس وجہ سے میں اپنا روپ تبدیل کر سکتا ہوں۔“

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”لیکن تم پر ایسا کون سا ظلم ہو گیا جو تم انسان کے دشمن بن بیٹھے ہو اور انسانوں کا خون پی رہے ہو۔“

بتیاں روشن کرنے لگا۔ روشنی ہوتے ہی میری نظر اس طرف پڑے بے سر کے جسم پر پڑی جو یقینی طور پر اس بد نصیب لڑکے کا تھا جو کچھ دیر پہلے میرے قریب ہی پڑا تھا۔

میں نے اپنی تمام قوت جمع کی اور اس کا لے لہا دے والے سے ٹکس میں بولا۔

”بے رحم، سنگدل قاتل تم میں کچھ انسانیت نام کی چیز نہیں ہے۔ تم کیوں میرے دشمن بنے ہو اور میری جان کیوں لینا چاہتے ہو؟ میرا قصور کیا ہے اور میری تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ کیا تمہاری کوئی اولاد نہیں ہے جو مجھے میرے والدین سے جدا کر کے یہاں ویرانے میں لے آئے ہو؟ بولو! کیوں انسانوں کا خون پی رہے ہو ایک انسان کی اولاد ہو کر ایک انسان کے روپ میں درندوں والا کام کیوں کر رہے ہو؟“

میری ہمت بس یہاں تک تھی اس سے آگے مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس کا لے لہا دے والے شخص نے طویل قہقہہ لگایا۔

جس کی گونج غار کے کونے کونے سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ قہقہہ بہت خوف ناک تھا جو غیر انسانی معلوم ہوتا تھا۔

پھر اس شخص کی بھیا تک آواز کانوں کے پردے ہلانے لگی۔

”انسان اور انسانیت کہاں ہے اس دنیا میں، میری دشمنی تم سے ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں سے ہے اور تم بھی ایک انسان کی اولاد ہو۔“

”کیا تم انسان نہیں ہو کیا تم کوئی جانور ہو؟“ میں بولا۔

”ہاں میں انسان نہیں ہوں تمہارا خون تو میں نے پی ہی جاتا ہے، چلو مرتے ہوئے یہ بات تمہارے ذہن میں نہ رہ جائے کہ میرا قاتل کون تھا؟ تو سنو! کیا نام ہے تمہارا چلو جو بھی ہے۔“

”الیاں میرا نام ہے۔ اور میں اصل میں مٹھی شہر کا ہوں لیکن پڑھائی کے سلسلے یہاں آیا ہوں۔“

”اچھا تو الیاں تم یقین نہیں کرو گے کہ میں

میرے ساتھ یہ کرنے والا ہے۔ بہر حال اس ناگ نے مجھے خوب زخمی کیا اس دوران سپیرا ریت میں منکا تلاش کرتا رہا کیونکہ ناگ سے وہ منکار تیلی زمین پر گر گیا تھا۔

سپیرا بے فکر ہو کر کام کر رہا تھا۔ اس دوران ناگ کو موقع مل گیا اس نے سپیرے کو ڈس لیا، زہرا تاتیز تھا کہ سپیرا منٹوں میں نیلا پڑ گیا اور ٹپ ٹپ کر جان دے دی۔

خیر میں بہت زخمی تھا اس لئے بڑی مشکل کے بعد یہاں تک آیا ہوں معلوم نہیں کتنے سال گزر چکے ہیں یا نہیں لیکن یہ واقعہ میرے دماغ سے اترنا ہی نہیں۔

زندگی کا کوئی پتا نہیں ہے راتاش بس میری یہ نصیحت یاد رکھنا، انسانوں پر اعتبار نہیں کرنا اگر بھگوان نے چاہا تو تم بھی ایک دن ناگ بن جاؤ گے، اپنے زہر کی حفاظت کرنا اور جب منکا مل جائے تو اس کو انسانوں سے بچانا، فرض کرو اگر تم نے کوئی انسانی روپ اختیار کر لیا تو اس وقت منکا کو اور حفاظت کی ضرورت ہوگی۔

اگر تم سے اس وقت منکا کھو گیا تو تم انسانی روپ میں رہو گے لیکن تمہارا جسم کسی ناگ کے جسم کی طرح کالے موٹے چمڑے کا بن جائے گا جس کی وجہ سے تم دور سے ہی پہچان لئے جاؤ گے اس لئے بھگوان کے لئے میری بات پر عمل کرنا اور منکا حفاظت کے ساتھ محفوظ جگہ یعنی منہ میں ہی رکھنا۔

اسی طرح سال پر سال گزرتے گئے، میں اس پرانی عمارت میں ہی رہا وہ بوڑھا سانپ بند دن بعد مر گیا لیکن اس کی کام کی باتیں ہمیشہ میرے ذہن میں رہتی ہیں۔

اس وقت میں نوے سال کا تھا جب میں نے وہ عمارت چھوڑی کیونکہ وہاں انسان آ گئے تھے اور اس عمارت کی مرمت کا کام شروع ہو گیا تھا۔

اس کے بعد میں ایک بند پڑی فیکٹری میں رہنے لگا جو شہر سے تھوڑے فاصلے پر تھی اور کئی سالوں سے بند پڑی تھی اس کا مالک ایک ٹریفک حادثے میں مر گیا تھا۔

”پچھلے کئی سال میں نے بہت تکلیف میں گزارے ہیں جس طرح سے تم جانتے ہو کہ کوئی بھی انسان مرد ہو یا عورت سانپ کو دیکھ لے تو وہ ڈر جاتا ہے اور جب تک اس سانپ کو ختم نہ کر دے آرام سے نہیں بیٹھتا یا پھر کسی جوگی یا سپیرا کو بلوا کر سانپ کو ختم کر دیتا ہے۔

مجھ پر بھی یہ اذیت کئی بار گزری۔ اس لئے میں آبادیوں سے دور دیرانوں اور جنگلوں میں زندگی گزارتا رہا۔

ایک مرتبہ ایک بہت ہی پرانی عمارت میں چھپ کر رہتا تھا اس وقت میری عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اس وقت میری ملاقات ایک بزرگ سانپ سے ہوئی جس کے جسم پر بہت گہرے زخم تھے۔ زخم بہت پرانے معلوم ہوتے تھے۔

اس نے بتایا کہ ”میری زندگی ایک سپیرا کے ساتھ گزری ہے۔ جس نے میرے زہریلے دانت نکال پھینکا تھا وہ لوگوں کو مجھے دیکھا کر پیسے کمانا تھا۔

وہ بہت لالچی تھا اور ہمیشہ وہ کسی ناگ کی تلاش میں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ ناگ کی طاقت یعنی اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی جو وہ دنیا سے اپنے آپ کو بچا بچا کر حاصل کرتا ہے وہ منکا جس پر اس کو ناز ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سانپوں پر حکومت کرتا ہے اور وہ اس کی مدد سے کوئی بھی روپ اختیار کر سکتا ہے۔ ایک بار اس سپیرے کو اس ناگ کا پتا چل جاتا ہے جس کے منہ میں منکا ہوتا ہے، ناگ چاند کی چاندنی میں بہت مست ہو جاتا ہے۔ اور بار بار اپنے منہ سے منکا باہر پھینکتا ہے اور منہ سے پھر پکڑتا ہے۔

وہ بھی چاند کی چاندنی رات تھی۔ سپیرا اس جگہ پہنچا یہاں اس کو پتا چلا تھا کہ ناگ اس جگہ رات میں کھلتا ہے۔

کچھ دیر خاموشی سے وہ بیٹھا رہا پھر مجھے باہر نکالا اور اس ناگ پر پھینک دیا ناگ منکا بھول گیا اور میرے ساتھ لڑائی کرنے لگا۔ مجھے خود یہ اندازہ نہیں تھا کہ سپیرا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

فرمانش.....!

شاعر ابودلامہ، مہدی کے پاس آئے اور اسے اپنا قصیدہ سنایا۔

مہدی نے کہا۔ ”اپنی کوئی حاجت بتاؤ۔“
ابودلامہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! مجھے آپ ایک کتا عنایت فرمادیں۔“ مہدی کو غصہ آ گیا، اس نے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے، میں کہتا ہوں، اپنی حاجت بتاؤ اور تم کہتے ہو کہ مجھے کتا دے دو؟“
ابودلامہ بولے۔ ”امیر المومنین! حاجت میری ہے، یا آپ کی؟“

مہدی نے کہا۔ ”تمہاری۔“
ابودلامہ نے کہا۔ ”تو میں نے آپ سے یہ کہا ہے کہ مجھے ایک شکاری کتا عنایت فرمادیں۔“
مہدی نے غلام سے کتا لانے کے لئے کہا۔
ابودلامہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! مجھے پیدل شکار کے لئے نکلنا ہوگا، کوئی سواری دیجئے۔“
مہدی نے سواری لانے کا حکم دیا۔

ابودلامہ نے کہا۔ ”اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“ مہدی نے غلام حاضر کرنے کا حکم دیا۔
اس نے کہا۔ ”کوئی چیز شکار کر کے، جب میں گھبراؤں تو اسے پکائے گا کون؟“
مہدی نے ایک لونڈی کا حکم دیا۔
اس نے کہا۔ ”امیر المومنین! یہ سب رہیں گے کہاں؟“

مہدی نے گھر کا حکم دے دیا۔
اس نے کہا۔ ”آپ نے میرے گلے میں اہل و عیال کا بوجھ ڈال دیا۔ میں کہاں سے انہیں کھلاؤں گا؟“
مہدی نے اپنے خدام سے کہا۔ ”اسے سمجھو کہ ایک باغ دے دو۔“ پھر ابودلامہ سے کہا۔ ”کیا اب بھی کوئی حاجت باقی ہے؟“
اس نے کہا۔ ”ہاں، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے ہاتھ کا بوسہ لوں۔“
(انتخاب: ایس اقبال احمد - کراچی)

اور اس کے بیٹوں کو اس فیکٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میرے دن اچھے گزر رہے تھے۔ اس فیکٹری میں میری ملاقات ایک ناگن سے ہوئی جو تقریباً میری ہم عمر تھی اور وہ بھی چند سالوں کے بعد منکا حاصل کرنے کی خواہش مند تھی! یوں ہم مل جل کر رہنے لگے، سالوں کا کوئی پتا نہ چلا اور ہم سو سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ ان سو سالوں میں، میں نے اپنے زہر کا استعمال نہیں کیا تھا۔ کیونکہ زہر استعمال کرنے سے ہماری طاقت اور عمر کم ہو جاتی ہے اور ہر ناگ کا خواب ہوتا ہے کہ وہ منکا حاصل کر لے اور سانپوں کی دنیا پر راج کرے۔

جس جوڑے کے پاس منکا ہوتا ہے اسے بہت بڑا اور چہار عزت حاصل ہوتی ہے۔ سب ہی سانپ ان سے ڈرتے ہیں اور ان کے حکم کی پیروی کرتے ہیں۔ میں اس وقت سو سال کا ہو چکا تھا، وہ چاند کی چودھویں رات تھی میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اتنا درد ہو رہا تھا کہ مجھے آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ناگن بھی میرے ساتھ نہیں تھی وہ پیٹ پوچا کے لئے شکار کرنے گئی تھی۔

درد تھا کہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میرے سر سے خون کی ایک لکیر نکل کر میری آنکھوں میں پڑنے لگی، درد تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا میں درد کی وجہ سے زمین پر گول گول گھوم رہا تھا۔ کہ اچانک ایک جھٹکا لگا اور میرے منہ سے ایک سرخ رنگ کا منکا نکل کر زمین پر گر پڑا۔

جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں بہت خوش ہوا۔ میں نے منکا فوراً اپنے منہ میں ڈال لیا مجھے بوڑھے سانپ کی بات یاد تھی۔ منکا ملنے کی خوشی میں، میں اپنے سر کا درد بھول گیا اور خوشی سے ناچنے لگا۔

ناگن آئی تو میں نے اس کو منکا کے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے مبارک باد دی اور بولی ”اب ہمیں جلد از جلد ناگ دیوتا کے پاس جانا چاہئے تاکہ وہ تم کو کوئی کام دے جس کی وجہ سے سانپوں میں

کیونکہ فیکٹری میلوں تک پہنچی ہوئی تھی اس لئے وہ ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتی تھی وہ فیکٹری میں چکر کاٹی رہتی تھی آج چاند تھوڑی دیر بعد نکلا، رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ میری طبیعت بہت بے چین تھی اور میرا دل بار بار باہر جانے کو کر رہا تھا تاکہ میں منکے کے ساتھ کھیل سکوں۔

چاند اپنی چاندنی چھاؤں کر رہا تھا میں فیکٹری سے باہر نکل آیا ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ لیکن ایک جگہ ریت زیادہ ہی نرم تھی اور ریت کا رنگ کالا کالا سا تھا یہ ریت مجھے بہت اچھی لگی مجھے یہ اس وقت احساس نہیں تھا کہ یہ ایک جال ہے اور یہ ریت نہیں راکھ ہے جس سے سانپوں کو بہت نفرت ہوئی ہے۔

کیونکہ آگ میں جل جانا سانپ کے لئے بہت تکلیف دے ہوتا ہے اس لئے وہ آگ اور راکھ سے نفرت کرتا ہے۔

لیکن میں زیادہ تر ویرانوں صحراؤں اور جنگلوں میں رہا تھا اور میرا واسطہ راکھ سے نہیں پڑا تھا۔

اس لئے اس وقت میں بہت خوش ہو کر راکھ پر کھیل رہا تھا تین چار بار میں نے منکا ہوا میں اچھالا اور ہر بار منہ سے پکڑ لیا۔

اس وقت مجھے کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔

اس بار جب میں نے منکا ہوا میں اچھالا تو ایک طرف شور ہوا تو میرا دھیان منکے سے ہٹ گیا اور منکا راکھ میں دب گیا۔

جس طرف شور ہوا تھا میں نے وہاں دیکھا تو میری دنیا ہی مجھ سے چھن گئی تھی اس بڑے بالوں والے انسان نے میری ناگن کو مار دیا تھا جو شاید میری حفاظت کے لئے وہاں آئی تھی۔

میں اس کی طرف بھاگا تو وہ سپردا وہاں سے بھاگ نکلا اور میں تڑپنے لگا کیونکہ آج کی رات اس نے میرا بہت نقصان کیا تھا ایک میرا منکا گم ہو گیا تھا اور دوسرا میری تنہائی کی ساتھی میری ناگن مجھے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی تھی۔

تمہاری عزت بن سکے۔

”ٹھیک ہے لیکن ہمیں انتظار کرنا چاہئے جب تم کو بھی منکا مل جائے تو پھر اکٹھے جائیں گے۔“ دوسری رات بھی چاند خوب چمک رہا تھا۔ اور میرا دل بار بار باہر نکل کر منکے کے ساتھ کھیلنے کا کر رہا تھا۔

میری طبیعت بے چین ہو رہی تھی اور پھر میں خود بخود دل کی تسکین کے لئے ریت پر آ گیا اور منکے کے ساتھ کھیلنے لگا میں منکے کو ہوا میں پھینکنا اور منہ سے پکڑنا یہ عمل میں کافی دیر تک کرتا رہا یہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں تھک کر واپس فیکٹری میں داخل ہو رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی انسان مجھے دیکھ رہا تھا، اب وہ بھی جا رہا تھا مجھے کچھ سمجھ نہ آیا اور میں نے یہ بات ذہن سے نکال دی۔

پھر مجھے بوڑھے سانپ کی وہ بات دل کو بے چین کر رہی تھی کہ انسانوں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا، ہمیشہ سانپوں کے دشمن ہی رہتے ہیں، چاہے وہ سانپوں کو اپنے ہاتھ سے دودھ ہی پلاتے رہے ہوں۔ میرا حال دیکھ لو میں نے سپرے کی کتنی خدمت کی تھی، اس کے ہر اشارے پر مانتا رہا لیکن آخر میں اس نے مجھے کیا صلہ دیا ایک ناگ پر اچانک ڈال دیا جو اپنی مستی میں مست تھا۔

میں نے یہ بات ناگن کو نہیں بتائی کیونکہ وہ بھی اپنے سوسال پورے ہونے کی خوشی میں خوش تھی۔ مجھے معلوم نہیں اس نے ان سوسالوں میں کتنی بار ہر استعمال کیا کیونکہ منکا اتنی ہی دیر بعد ملے گا جتنا زہر اس نے استعمال کیا ہوگا۔

کیونکہ منکا بہت قیمتی چیز ہوتا ہے اور یہ سالوں اپنی اور اپنے زہر کی حفاظت کے بعد ملتا ہے اور اس منکے کو حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے سپرے صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں اور کئی کئی سالوں تک ناگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔

رات اب گزر چکی تھی ناگن کا کوئی پتا نہیں تھا۔

میں نے منکا بہت تلاش کیا لیکن مجھے راکھ میں کچھ نہ ملا تو اس وقت میں نے اس سپیرے کی بوکا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔

اس کی بو مجھے اس کچی آبادی میں لے گئی جہاں سپیروں کے ڈیرے تھے۔ اور جگہ جگہ سپیرے بیٹھے تین بہارے تھے اور سانپ ان کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ مجھے اس وقت انسانوں سے سخت نفرت ہو گئی تھی خیر میں اپنی ناگن کو دفن کرنے کے لئے دوبارہ فیکٹری کی طرف چل دیا کیونکہ مجھے امید تھی کہ منکا مجھے مل جائے گا۔ جب میں راکھ والی جگہ پر پہنچا تو وہاں کوئی راکھ نہیں تھی وہ سپیرا ساری راکھ اٹھا کر لے گیا تھا، راکھ نہیں بلکہ میرا خزانہ بھی لے گیا تھا۔

میری دنیا تاریک ہو چکی تھی پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک انسان کا روپ دھار لیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

میری آنکھوں میں بہت طاقت آچکی تھی میں بہت دور تک دیکھ سکتا تھا میں اس رات سپیروں کی بستی میں گیا اور بہت سے سپیروں کو ابدی نیند سلا دیا لیکن میرا دشمن مجھے نہ ملا مجھے اس کی بونہ ملی۔

کافی سانپوں کو آزادی ملی ان سانپوں میں سے ایک ناگ بھی تھا جس کا منکا کھو گیا تھا اس نے بتایا "اب اگر وہ سپیرا ایک خاص عمل تمہارے منکے پر کرتا ہے تو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور وہ تم سے ہر کام کروائے گا۔" لیکن ابھی تم نے انسانی روپ اختیار کر لیا ہے اس لئے اس کا عمل بے کار ہے پر تم کو اب یہ نقصان ہے کہ تم انسانی روپ میں ہی رہو گے لیکن تمہاری جلد سانپوں کی طرح کی بن جائے گی جس کی وجہ سے انسان تم کو پہچان جائیں گے۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے کہ دوبارہ ناگ کا روپ اختیار کر لوں۔"

"نہیں اب تم ایسا بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ناگ

منکا اب تمہارے پاس نہیں ہے۔

ہاں ایک راستہ ہے اگر تم اپنے آپ کو لبادے

میں چھپا کر رکھو اور کیس انسانوں کا خون پیو تو تم ناگ کا روپ اختیار کر سکتے ہو اور وہ منکا بھی بے اثر ہو جائے گا۔ پھر میں نے یہ کالا لبادہ پہن لیا اور انسانوں کا خون پی کر پھر سے ناگ کا روپ حاصل کر لیا۔

میں مسلسل سپیرے کی تلاش میں تھا آخر میری تلاش ختم ہو گئی اور میں نے اس سپیرے کو ختم کر دیا اور اپنا ناگ منکا حاصل کر لیا۔

"اب جب تم کو ناگ منکا مل گیا ہے تو پھر یہ خون کیوں پی رہے ہو؟"

"الیاس اب یہ میری ضرورت ہے کیونکہ اب میں چوہے نہیں کھا سکتا۔ اس لئے میں اپنی خوراک اور انسانوں سے دشمنی دونوں ساتھ ساتھ پوری کر رہا ہوں۔ میرا منکا اب میرے پاس ہے۔"

اس کی باتیں میں سن رہا تھا لیکن میری زبان پر کلام الہی کا ورد جاری تھا پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر منہ اور بدن پر پھیر لیا۔

اتنے میں وہ میری جانب بڑھا اور ٹیش میں اس نے میرے بال اپنی منٹھی میں جکڑے۔ بال کا پکڑنا تھا کہ اس کے سر پر ایک زبردست شعلہ بھڑکا اور بدحواس ہو کر اس نے میرے بال چھوڑ دیئے۔

اور پھر کسی ان دیکھی طاقت نے مجھے غار سے باہر کی طرف آنا فانا دکھایا اور میں جھٹ سے غار سے باہر تھا۔ جب میں غار سے باہر نکلا تو اچانک زبردست گڑگڑاہٹ ہوئی اور پلک جھپکتے ہی پورے کا پورا غار زمین بوس ہو گیا، مجھ پر گھبراہٹ اور سکتہ طاری تھا۔ چند منٹ بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے اس واقعات کو غیبی مدد سمجھا اور یقیناً وہ غیبی مدد ہی تھی کہ میں بحفاظت غار سے باہر نکلا تھا اور غار زمین بوس ہو گیا تھا اور پھر میں نے کلام الہی کا ورد کرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔



صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلم کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دل فریب کہانی

حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات

کے ساتھ میں گھر کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر دیکھا، مجھے دوبارہ چونکنا پڑا تھا اول تو میرے گھر رات کے دو بجے آنے والا بولی تھا ہی نہیں، پھر بھی میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کوئی پڑوسی ہو، کسی مشکل کا شکار ہو اور مدد مانگنے کے لئے میرے پاس آیا ہو، لیکن جس شخص کو میں نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے دیکھا وہ گوتم بھنساالی تھا۔ مکروہ شکل کا پورا، وہ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس کی مکروہ سی آواز ابھری۔

”مجھے اندر آئے دو۔“

میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا، خود دروازہ بند کرنے کے لئے رکا لیکن وہ سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا، پھر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا، اس نے خود ہی ڈرائنگ روم کی لائٹ آن کی، اس دوران میں اس کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا تھا، اس شخص سے مجھے بدستور خطرہ تھا، لیکن اب میں اتنا بزدل بھی نہیں تھا خاص طور پر سے مہا بھارت کے دور میں اور اس کے بعد یونان میں پالیسیس کی حیثیت سے میں نے جو عمل سرانجام دیا تھا اس نے تھوڑا سا اندر کر دیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بھی نگاہوں سے گوتم

بھنساالی کو دیکھا اور کسی قدر ترش لہجے میں بولا۔

”آگے ہو تو میں نے تمہیں بلا لیا ہے، جس دور سے تم گزر رہے ہو اس کی تہذیب ذرا مختلف ہے اول تو رات کے دو بجے ایسے کوئی کسی کے گھر میں نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو میزبان کی اجازت کا انتظار کرتا ہے، تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے مجھے پسند نہیں بیٹھو۔“

وہ ایک صوفے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، پھر اس کی آواز ابھری۔ ”میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا، تمہارا مہمان نہیں ہوں بلکہ تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔“

”کر، کر، کر۔“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور خود اس صوفے کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ لیا جس سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، گوتم کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم اس کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں مصیبت میں پھنسا دوں گا، کیا سمجھے؟“

”ٹھیک، کب تک پھنساؤ گے، کیا آج ابھی اور اسی وقت؟“ میں نے کہا اور اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا۔

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو اس وقت بھی اگر میں چاہوں تو تمہیں کونٹے میں تبدیل کر دوں تمہارے پورے بدن سے آگ ابل پڑے



KALIFATA



کی، اس طرح..... اس نے ایک ڈیکوریشن میں کی جانب انگلی اٹھائی اس کی انگلی سے نیلے رنگ کی ایک شعاع خارج ہوئی اور میرا انتہائی قیمتی ڈیکوریشن میں سلگنے لگا، ایک لمحے کے لئے میرا منہ غصے سے کھلا لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ ڈیکوریشن میں بہت خوبصورت تھا اور کسی نے گفٹ کیا تھا، اس کے جل کر راکھ ہو جانے سے مجھے دلی افسوس ہوا، میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”زمانہ قدیم کے شعبہ گر میرے دور کے لوگ بھی ایسے شعبہ دیکھا سکتے ہیں، پستول کی ایک گولی تیرے سینے میں سوراخ کر سکتی ہے۔ بے شک تو نے آپ حیات پیا ہوا ہے اور وہ گولی تجھے موت نہیں دے سکتی، لیکن تیرے بدن کے زخم ضرور تجھے تکلیف دیں گے اور ان کے بھرنے میں وقت لگے گا۔“

”تم یہ بھی نہ کر سکو گے میرے نو جوان ادیب، میرے پاس اس کا تل بھی موجود ہے، لیکن نیلے رنگ کی یہ شعاع تمہیں اسی طرح خاستر کر دے گی، جیسے یہ.....“ اس نے ڈیکوریشن میں کی طرف اشارہ کیا۔

”ہوں تو پھر تو اس سے گریز کیوں کر رہا ہے جبکہ بقول تیرے مجھ سے دشمنی ہے۔“

”کور دتی کے لئے، کور دتی کے لئے، اگر میں نے تجھے ہلاک کر دیا تو وہ پیشگوئی غلط ہو جائے گی جس کے لئے مجھے نجانے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”پیشگوئی۔“

”ہاں، محبت کبھی نہ کبھی رنگ لے ہی آتی ہے، میں اسے بہت چاہتا ہوں، میں اسے کسی کرب کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا، میں نے اگر تجھے ہلاک کر دیا تو وہ مجھ سے بہت متنفر ہو جائے گی۔“

”پیشگوئی کرنے والے نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اسے اس حد تک نہ پہنچانا کہ اس کے سینے میں نفرت کا درخت اگ آئے اور وہ جب بھی تم پر نگاہ ڈالے نفرت کی نگاہ ڈالے، ایک وقت ایسا آئے گا، جب اس کے دل میں تمہارے لئے محبت بیدار ہوگی اور وہ تمہیں

اپنا لے گی، بس میں کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جس سے نفرت کا وہ درخت اگ آئے اور میرے راستے ختم ہو جائیں لیکن تو دیکھ ادیب کہ میں کتنا صبر والا ہوں کتنا انتظار کر رہا ہوں اور کب تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔“

”تو پھر تو نے مجھے کون سی مصیبت میں پھنسا دے گا کوتم بھنسا لی۔“

”یہ راز تو مجھ تک ہی رہنے دے، بس اتنا سمجھ لے کہ اگر میں صرف تیرے خلاف کچھ کرنے پر آمادوں تو تو اپنی زندگی سے تنگ آ جائے گا تجھے صرف موت کی آغوش میں پناہ ملے گی اور وہ موت میں خود نہیں دوں گا تجھے، وہ تیری طلب ہوگی اور میرا انتقام۔“

”تو ٹھیک ہے کوتم بھنسا لی، میں بھی زندگی کے انوکھے تجربے کر رہا ہوں، وہ تجربے میں جاری رکھوں گا۔“

وہ مجھے گھورنے لگا پھر بولا۔ ”تیری مرضی ہے تیار رہنا مجھے تیری موت درکار ہے لیکن وہ موت جو خود تجھے تیرے اپنے ہاتھوں آئے، میں کور دتی کے سامنے سرخرو رہتا چاہتا ہوں۔ چلتا ہوں۔“ وہ واپسی کے لئے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا، پھر بڑے دروازے سے بھی باہر نکل گیا۔

میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا کور دتی سے میرا جو رابطہ ہو گیا تھا اور جو رشتہ میرے اور اس کے درمیان قائم ہو گیا تھا وہ اتنا ہلکا نہیں تھا کہ اسے موت کے خوف سے فراموش کر دیا جاتا اور ویسے بھی میں ایک نڈر انسان ہوں، میرے بہت سے افکار و خیالات ہیں، موت کے بارے میں بھی بہر حال میں نے سوچا کوئی بیج سکا ہے آج تک، لیکن یہ اب حیات پتہ نہیں اس کا اختتام کیا ہوتا، میں نے بہت سی کہانیوں میں اب حیات کا ذکر کیا ہے، لیکن صرف خیالی حد تک حتمی طور پر میں نے کبھی نہیں کہا کہ اب حیات کا وجود ہے یا اگر وجود ہے بھی تو کیا کوئی عام انسان چتر حیوان سے اب حیات حاصل کر سکتا ہے، خیر میں اس پر کوئی اپنی رائے نہیں دے سکتا، لیکن عام لوگوں کی وہی

بات ہو جاتی ہے کہ وہ صرف کہانی کی حد تک ہیں یا پھر کہانی سے آگے بھی کچھ ہے۔

کوروتی اور گوتم بھٹالی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اب حیات کا وجود ہے اور وہ بقول ان کے یہ امرت جل پی چکے ہیں، کوروتی سے اپنی اس عمارت میں نہ رہا گیا، وہ دوسری صبح ہی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے میرے بازو سے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں رہ سکتی اب میں تمہارے بنا ڈیشان عالی، نہیں رہ سکتی میں اب تمہارے بنا۔ پتا نہیں کیا ہوگا کبھی کبھی تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے، میں جانتی ہوں تم یوزھے ہو جاؤ گے مر جاؤ گے اور میں پھر ویران ہو جاؤں گی، پھر میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر میں امرت جل نہ پی چکی ہوتی تو اپنے پریمی کے ساتھ سے بٹا کر میں بھی راکھ بن چکی ہوتی یا دھرتی کی گہرائی میں جا چکی ہوتی، یہ سب کچھ کیا ہے، منش کیا کیا سوچتا ہے، کبھی کبھی غلط۔“ ٹائٹل کے دوران میں نے اس سے کہا۔

”رات کو گوتم بھٹالی میرے پاس آیا تھا۔“

”ایں۔“ وہ اچھل پڑی۔

”ہاں وہ مجھے دھمکیاں دے کر گیا ہے، تم نے وہ ڈیکوریشن پس نہیں دیکھا جو بڑا خوب صورت تھا لیکن راکھ بن گیا ہے۔“ میں نے اسے اس ڈیکوریشن پس کی درست دکھائی اور اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیل گئے، تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

”وہ کہیں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے، جہاں تک بات رہی تمہاری تو اس کی مجال نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایسے چاب بتاؤں گی کہ تم اس سے ہی نہیں بلکہ اپنے ہر دشمن سے محفوظ رہو گے۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی؟“

”ہاں پوچھو۔“

”وہ تم تک کبھی نہیں پہنچ سکا، میرا مطلب ہے

تمہاری قربت نہیں حاصل ہوئی اسے؟“

”کبھی نہیں مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے۔“

”لیکن یوسکی کی حیثیت سے تو اس نے تم پر

قابو پالیا تھا، میں وہاں پولیس کی حیثیت سے موجود تھا

اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس نے

تمہارے بدن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔“

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو۔“

”تم پولیس کی حیثیت سے وہاں موجود تھے نا؟“

”ہاں۔“

”تو کیا تم پولیس تھے؟“

”نہیں۔“

”تو میں بھی وہ نہیں تھی جو تمہیں نظر آ رہی تھی،

یہ تاریخ کے دو کردار تھے، میں شاید پہلے بھی تمہیں

بتا چکی ہوں کہ ماضی جو گزر چکا ہوتا ہے اور اس کی

ترتیب جس طرح ہوتی ہے اس میں نئے کرداروں کی

مختلک نہیں ہوتی، زیادہ سے زیادہ اگر کوئی دیدہ ور کی

حیثیت سے تاریخ میں داخل بھی ہو جائے تو وہ صرف

دیدہ ور ہوتا ہے اور وہ نہیں سمجھ پاتا جو تاریخ کا اصل ہوتا

ہے، ہم جب تاریخ میں داخل ہوتے ہیں تو اپنی جگہ

تلاش کرتے ہیں کہ ہم کہاں ساکیں گے لیکن ہم پر جو

اس دوران بنتی ہے وہ ہم پر نہیں بنتی، بلکہ تاریخ کے وہ

کردار ہماری شکل میں اپنی کہانی بیان کرتے ہیں، لکھنا

اپنی کتاب زندہ صدیاں میں یہ بات کہ جیون کا ایسا موڑ

بھی ہوتا ہے جب ہم خود اپنی ذات کو نہیں سمجھ پاتے۔“

میں واقعی اس کی فلسفیانہ گفتگو سے الجھ رہا تھا، میں نے

گہری سانس لے کر کہا۔

”تو وہ تم نہیں تھیں۔“

”نہیں وہ اشاریہ ہی تھی، میں نے صرف اس کا

روپ دھارا تھا، اس کا میرے جیون سے کوئی تعلق نہیں

تھا۔“

”ٹھیک اور میں.....“

”تم نے بھی پولیس کا روپ دھارا تھا۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا اس سلسلے میں جبکہ تم

نے روپ دھارا ہوگا۔

”میری یہ کتاب جب تم اس کے حروف پر جاتے اور تاریخ کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہو تو پھر تمہارا ایک کردار منتخب ہو جاتا ہے، یہ میرا غل ہے یہ میرا گیان ہے۔ ایک بار میرے ساتھ بڑا دلچسپ مسئلہ ہوا، تمہیں یونان سے دلچسپی ہے نا، میں یونان کے ایک بڑے ہی اہم کردار کے ساتھ جس حیثیت سے رہ چکی ہوں سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔“

مجھے بڑی دلچسپی محسوس ہوئی تھی میں نے کہا۔
”میں سننا چاہتا ہوں اور دنگ رہ جانا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ”تو کیوں نہ اس دور میں اور اس کے آخر تک کا سفر کیا جائے، خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ ایک بار میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو طویل واقعہ تھا، مجھے پتہ چلا کہ ایک پرچار علاقے میں ایک ایسا استاد اعظم موجود ہے جو بڑے انوکھے گیان جانتا ہے جس کا نام ایلی گوس تھا، ایلی گوس سے میں نے ایک علم سیکھا، بڑا انوکھا علم تھا اور بڑی مشکل سے میں نے ایلی گوس کو اس بات کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ مجھے علم کی اس منزل تک لے جائے اس کے لئے مجھے اس انوکھے کردار میں اس حد تک پہنچنا پڑا تھا، اس کا وہ گیان اور علم اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اصل میں میں کون ہوں، وہ مجھے بڑے پیار سے اپنا وہ علم سکھاتا رہا اور جب میں نے اس کا مکمل علم سیکھ لیا تو پھر میں نے اس سے جدا ہو جانا مناسب سمجھا اور مجھے مساف کرنا دیشان عالی ایک کام میں نے کیا ہے کہ اگر کوئی ایسا علم میرے ہاتھ آ گیا جس میں میں نے سوچا کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا اس سے واقف نہ ہو تو میں نے علم سکھانے والے کو یا تو ختم کر دیا یا اسے اس طرح ساکت کر دیا کہ پھر وہ جنہش تک نہ کر سکے، تو یہی ہوا میں نے ایلی گوس کی وہ قوت سلب کر لی اور ایلی گوس کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ غضب ناک ہو گیا، وہ میرا بدترین دشمن بن گیا۔

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے اندر ابھی بہت سی خامیاں ہیں، میں زخمی ہو سکتی ہوں، دکھ درد اٹھا سکتی

ہوں، بس یہ کہ مر نہیں سکتی، اگر میرے بدن پر کوڑھ پھوٹ آئے، اگر میرے اعضاء مفلوج ہو جائیں تب بھی میں زندہ رہوں گی اور وہ زندگی کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے تمہیں اس کا علم ہے، میں بتا رہی تھی کہ وہ میرا دشمن بن گیا، پھر میرے گیان ہی نے مجھے بتایا کہ وہ میری تاک میں ہے۔

یہاں مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی میں اپنی طاقت کے زعم میں اس کے سامنے آ گئی اور اس سے کہا کہ ”وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔“

وہ سخت غضبناک تھا اس نے کہا کہ ”وہ میرا اتنا کچھ بگاڑ سکتا ہے کہ میں صدیوں اسے نہیں بھول سکوں گی۔“ اور اس نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔

ایک انتہائی طاقتور ہاتھی نما گینڈا تھا جس کا قد و قامت دیکھنے کے قابل تھا، اس نے نمونے کے طور پر اس گینڈے پر اپنا وہ علم آزما کر مجھے دکھایا گینڈا اپنی جگہ ساکت ہو گیا وہ سانس لیتا تھا بول سکتا تھا لیکن اس کے بدن میں جنہش نہیں ہوتی تھی، ایلی گوس نے کہا کہ ”وہ مجھے بھی ایک زندہ بمسودہ بنا سکتا ہے۔“ کسی بھی جگہ میں ساکت ہو سکتی ہوں اور پھر میرے جیون کا باقی سے اسی پتھر اے ہوئے بدن کے ساتھ گزرے گا اور میں کسی طور اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کر پاؤں گی۔

میں خوفزدہ ہو گئی اگر وہ یہ کر لیتا تو میرے لئے اس سے بھیانک برا اور کوئی نہ ہوتی، میرے پاس گیان ہوتے طاقت ہوتی سب کچھ ہوتا لیکن مجھے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک جگہ ساکت رہنا پڑتا، سو میں نے وہاں سے فرار مناسب سمجھا اور جو بھی پہلا زاویہ مجھے نظر آیا میں اس زاویے میں گم ہو گئی، کوئی جانا پہچانا راستہ نہیں اختیار کیا تھا میں نے، بس مجھے ایلی گوس کے سامنے سے غائب ہونا تھا، وہ زاویوں کا علم نہیں جانتا تھا، لیکن اپنے گیان سے اس نے یہ پتہ لگا لیا کہ میں کس سمت گئی ہوں اور اس نے اسی سمت کا سفر شروع کر دیا۔

میں بچ بچ اس سے ڈر گئی تھی، میں نے ہواؤں میں اور فضاؤں میں اپنا ٹھکانہ نہ بنایا بلکہ ایک

اندھیرے غار کا رخ کیا اور غار میں جا چھپی۔ جس وقت میں اس غار میں داخل ہوئی دن کی روشنی تھی لیکن غار میں اندر سے بھیانک تاریکی تھی، ایللی گوس میرا پیچھا کر رہا تھا اور میری خوشبو سونگھتا پھر رہا تھا، میں درحقیقت ڈر گئی تھی کیونکہ جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا، میری ساری کوششیں ساری قوتیں اس جگہ ختم ہو جاتی تھیں جہاں میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے مجھے کی شکل اختیار کر لیتی۔

ذرا سوچو ذیشان عالی مجھے موت نہیں ہے اور میں صدا جیتی رہوں گی، لیکن کس انداز میں..... ایللی گوس مجھ سے انتقام لینے میں حق بجانب تھا کیونکہ میں نے اس سے اس کی قوتیں چھین لی تھیں۔

غار میں کافی سے گزار لیا، پھر رات ہو گئی اور میں ایک پتھر ملی زمین پر بیٹھ کر ایک جگہ لیٹ کر سو چنے لگی کہ ایللی گوس سے پیچھا کیسے چھڑایا جاسکتا ہے۔ پھر نجانے رات کا کون سا سے تھا مجھے نیند آ گئی تھی اور میں گہری نیند سو رہی تھی کہ دفعتاً ہی میری آنکھ کھل گئی، کچھ ایسی آہٹیں ابھری تھیں، میں دہشت سے سکڑ گئی، میرا خیال تھا کہ ایللی گوس آخر کار میرا پتہ پانے میں کامیاب ہو گیا، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا جو غار دن کی روشنی میں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اب وہاں مدھم مدھم روشنی ہوتی جا رہی تھی اور اس روشنی میں میں نے کچھ بوڑھے آدمیوں کو دیکھا وہ گردن سے لے کر سروں تک لبادوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کے چہرے روشنی میں نمایاں تھے، آہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے لئے بڑا ششمنی خیر تھا جانتے ہو ان میں سے کچھ شناسا چہرے کون سے تھے۔

میں چونکہ یونان میں کافی سے بتا چکی تھی اور یونان کی تاریخ سے مجھے پوری طرح شناسائی حاصل تھی اس لئے میں نے انہیں پہچان لیا، ان میں سے ایک افلاطون تھا، دوسرا بطلیموس، تیسرا بطراط، چوتھا سقراط اور اس کے علاوہ کچھ ایسے اجنبی جنہیں میں نہیں جانتی تھی

لیکن ان کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ یونان کی قدیم تاریخ کے کچھ اہم کردار ہوں گے وہ سب میری ہی جانب مگراں تھے اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ میرے قریب پہنچ گئے غالباً وہ بطلیموس تھا جس نے مجھ سے انھنے کے لئے کہا۔ سب کے چہروں پر فکر مندی کے آثار تھے بطلیموس بولا۔

”سنو! ہم تمہیں جانتے ہیں، تم کو روٹی ہو کیا، ہم نے غلط کہا؟“

میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولی۔
”نہیں.....“

تب سقراط آگے بڑھا اور اس نے کہا۔
”کو روٹی تم کوئی نوجوان لڑکی نہیں ہو، اپنا اچھا برا سب سمجھتی ہو ایللی گوس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، دو چنچ چنچ کر تمہیں پکارتا پھر رہا ہے، وہ ہواؤں سے مدد مانگ رہا ہے، وہ تضاؤں سے باتیں کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کریں، وہ اس غار میں آسکتا ہے وہ تمہیں پاسکتا ہے لیکن میں تمہیں ایللی گوس سے بچنے کی دعوت دیتا ہوں، تمہیں ہمارا کام کرنا ہو گا اور تم اس سے بچ سکتی ہو۔“

میں جانتی تھی کہ یہ قدیم روحمیں ہیں جو یہاں میرے گرد جمع ہو گئی ہیں، میں نے خود کو سنبھال اور ان سے سوال کیا کہ وہ کون سا ایسا عمل ہے جس کے تحت ایللی گوس سے اپنا جیون بچا سکتی ہوں تب سقراط کہنے لگا۔

”میرا شاگرد سکندر اس وقت ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہے، اس کی محبوب ہستی امنا کیہ جو اس کی بیوی ہے گم ہو گئی ہے، سکندر کہیں مصروف ہے لیکن اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ امنا کیہ لاپتہ ہے اس نے اپنے خاص آدمیوں کا ایک دستہ امنا کیہ کی تلاش پر مامور کیا ہے اور وہ اسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ سکندر کو جو کچھ کرنا ہے وہ تاریخ کا بہت بڑا حصہ بننے والا ہے، لیکن اگر امنا کیہ اسے نہ ملی تو خیال ہے کہ وہ دلبرداشتہ ہو جائے گا اور اس کے بعد تاریخ نجانے کون

سارخ اختیار کر لے۔

لیکن کوروتی اصناکیہ زندہ نہیں ہے، وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر مر چکی ہے اور اس کی لاش اسی غار میں ہمارے پاس محفوظ ہے، ہم غور کر رہے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، بہت سی باتوں کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ وہ کس حیثیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ ہم اس دنیا سے دور نکل چکے ہیں اور ایک نئی دنیا کے مسافر ہیں، ہمیں معلوم ہے کوروتی کہ تیرے پاس پوشیدہ علوم ہیں اور تو اب حیات پل چکی ہے، یعنی تو زندہ رہنے والوں میں سے ہے، جو علم تیرے پاس ہیں ان میں سے ایک علم یہ بھی ہے کہ تو مردہ اجسام میں داخل ہو کر ان کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ تو بالکل اتفاقیہ طور پر ادھر نکل آئی ہے۔

لیکن یہ گیلیاس پیش گوئی کر رہا ہے کہ بہت جلد اصناکیہ کی زندگی کے لئے ایک حل نکلنے والا ہے، یہ ستارہ شناس ہے اور یونان کی تاریخ میں گیلیاس کا نام ایک ستارے کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ یونانیوں کا کہنا ہے کہ گیلیاس کی راتیں کہکشاں میں ستاروں کے ساتھ گزرتی ہیں اور وہ ان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے، تو گیلیاس ستارہ شناس نے یہ بتایا کہ ایک عورت آنے والی ہے جو ان مشکلات کا حل بنے گی اگر تو ایلی گوس سے نجات چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ ایلی گوس تیرا پتہ نہ پاسکے اور تجھ سے اپنا انتقام نہ لے سکے تو تو اصناکیہ کے قالب میں چلی جا اور اس کی حیثیت سے دو فائدے حاصل کر، پہلا یہ کہ تو ایلی گوس سے محفوظ رہ جائے گی، دوسرا یہ کہ سکندر کی زندگی کا ایک اہم باب شروع ہو جائے گا اور وہ پورے اطمینان سے وہ سب کچھ کر سکے گا جو تاریخ کا منصب ہے۔“

ذیشان عالی! زندہ انسان کے ذہن میں خوف کا عنصر بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے سانس لینے کا، درحقیقت جسم کے مختلف حصے ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک حصے کا الگ الگ کام ہوتا ہے اور اس کے بغیر اجسام مکمل نہیں ہوتے، تو خوف بھی ایک وجوہ ہے جس

کی مثال یہ ہے کہ ایک نوزائیدہ بچے کو جسے دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا سوائے ان دو چیزوں کے، یعنی ایک بھوک جس میں وہ روتا ہے یہ اس کی طلب ہے، جو آنسو اور آواز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرا خوف، تم ایک چھوٹے سے بچے کے قریب ایک زور کی آواز پیدا کرو تو وہ اچھل پڑتا ہے یعنی اس کے ضمیر میں خوف کا جو عنصر ہے وہ نومولودیت کے ساتھ بھی ہوتا ہے تو میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ایلی گوس کے تاثر سے مجھے بھی خوف کا احساس ہوتا تھا اور میں ایک پتھر یا زندہ مجسمہ نہیں بننا چاہتی تھی۔

سو میں نے ان دنیا سے چلے جانے والے مفکروں کی وہ تجویز قبول کر لی اور انہوں نے مجھے اصناکیہ کا وہ جسم دکھایا جو وہیں اس غار میں موجود تھا اور ابدی نیند سو رہا تھا۔

کیا ہی حسین مورت تھی ایسے دلکش یونانی نقوش کہ آنکھیں ان پر جم کر رہ جائیں اور پھر جواں مرد سکندر جس کی کہانیاں میرے کانوں تک پہنچ چکی تھیں، مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا اور میں نے اپنے گیان سے کام لے کر اصناکیہ کے قالب میں داخل ہونے کا عمل شروع کر دیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس کے روپ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

پراسرار بوز سے مجھے اس طرح اٹھتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ انہوں نے اس فاتح اعظم سکندر کو نئی زندگی دے دی۔

اس وقت میری سب سے پہلی طلب بھوک تھی جس کا میں نے ان لوگوں سے اٹھار کر دیا اور آخر کار تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں سے سکندر کے لوگوں نے مجھے دیکھ لیا اور خوشیوں میں ڈوب کر مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔

میں ایک دلکش حیرت سے دو چار تھی اور سوچ رہی تھی کہ آنے والا وقت میرے لئے کتنی دلچسپی کا حامل ہوگا، میں نے اپنے اندر اصناکیہ کی فطرت اور اس کے

ماضی کا جائزہ لیا اور چونکہ اب میں اسنا کیہ تھی اس لئے اس کے بارے میں اب میں سب کچھ جانتی تھی۔

اسنا کیہ کو فارس کے تاریک ایام میں اپنے وطن کی مدد کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور وہ یعنی بعد کی میں ہاختر کے گورنر کی پہلی اولاد تھی، میرا یعنی اسنا کیہ کا باپ شاہ فارس کی سلطنت میں سگود یہ کا حکمران تھا، ان دنوں فارس کی حکومت ایشیاء کے ایک تہائی حصے میں پھیلی ہوئی تھی، میری ماں سنی راس ایک اعلیٰ خاندان کی بیٹی تھی، جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا اور وہ میرے باپ کی پہلی بیوی تھی۔

واہ کس دلچسپ کہانی کا آغاز ہوا ہے اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں ذیشان عالی کہ صدیوں کے اس سفر میں ایک قدیم روح کا سفر بہت ہی دلکش اور دلچسپ تھا اور چونکہ میں خود بھی تاریخ کی دیوانی تھی اس لئے مجھے اپنے اس نئے روپ سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

فارس کا قدیم اور تاریخی شہر شرفہ چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے حسن پر جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ اسی خوبصورت شہر کے ایک پر شکوہ محل میں میرے والدین کی رہائش تھی محل کی دیواریں چکنی اور رنگین اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں، ان کے سرخ اور نیلے رنگ کے درمیان بنے ہوئے سنہری ستون اور چھت کے رنگ برنگ نقش و نگار صناعی کے نادر نمونہ تھے، شاہ دارلوش سوئم کے دور حکومت کے آٹھویں سال میں چوتھے ماہ کی چھٹی تاریخ کو میں نے اسنا کیہ کی حیثیت سے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، زندگی کے ابتدائی ایام میں نے محل کے اس اندرونی حصے میں بسر کئے جو حرم کہلاتا تھا، ویسے مجھے اپنے باپ کو بہت کم دیکھنے کا موقع ملا تھا، میں جب پانچ برس کی تھی تو ایک دن وہ بڑے غصے میں اندر آیا اور اس نے میری ماں سے کہا کہ اس نے معبد سے اجازت لے کر مجھے اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تب میری ماں نے حیرت زدہ ہو کر کہا کہ لڑکی کس طرح

جانشین ہو سکتی ہے، لیکن میرے باپ نے ماں کی بات رد کر دی اور جواب دیا کہ وقت یہی کہتا ہے کہ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ چار بیویوں اور کنیزوں سے میرے باپ کی چوبیس اولادیں ہوئیں لیکن سب کی سب لڑکیاں تھیں وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے اور پھر بڑے معبد نے جو اس دور کے مذہبی رہنما تھے اس کی اجازت دے دی تھی اس لئے میرے باپ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر کے کہا خدائے ہر عز کو یہی منظور ہے تو اسنا کیہ ہی میری جانشین بنے گی انہوں نے کہا کہ اگر یہ لڑکا ہوتی تو پانچ برس کی عمر میں معبد کے پاس تربیت کے لئے جا چکی ہوتی، اب یہ میری جانشین بن چکی ہے، اس لئے آئندہ زندگی اسے لڑکے کی طرح بسر کرنا ہوگی، ذیشان عالی اس نے یعنی میرے باپ نے یعنی اسنا کیہ کے باپ نے مجھے اٹھا کر اپنے گھٹنے پر بٹھالیا اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اسنا کیہ! آج سے تو میری جانشین ہے، میری ساری دولت ملکیت محل اور خزانے آج سے تیرے ہیں، لیکن تجھے ان کی حفاظت کے لئے بہت کچھ سیکھنا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو بیٹے کی طرح میرا نام روشن کرے۔“ آہ ذیشان عالی ذرا سوچو کیا ہی دلکش اور دلچسپ منظر تھا جب میں اپنا بچپن دیکھ رہی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ اس کے زانو پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مجھے مستقبل کے لئے نصیحتیں کر رہا تھا۔

میرا باپ بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا، لیکن ماں میری جدائی پر آنسو بہا رہی تھی، ایک طرح سے میں اس سے دور ہی ہو رہی تھی، مجھے محل میں بنی ہوئی عبادت گاہ میں بڑے معبد کی رہائش گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں میری رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میرا بستر ایک چھوٹی سی میز کپڑے رکھنے کی چوب ضرورت کے سامان اور کنیز کے سونے کے لئے لکڑی کا ایک تختہ تھا، میری کنیز اصرارہ بڑی بد صورت تھی، عبادت گاہ میں خوبصورت کنیزیں نہیں رکھی جاتی تھیں تاکہ پجاریوں کے جذبات قابو

میں رہیں اور میرے استاد کا نام ہاروں تھا۔

میری تعلیم زرتشت مذہب کے بنیادی اصولوں سے ہوئی جن کے مطابق حضرت زرتشت خدا کے پیغمبر تھے ان کا ظہور ایک ہزار سال قبل ہوا تھا۔ زرتشت دین کی مقدس کتاب آوستا تھی جس کی ایکس جلدیں سونے سے لکھی ہوئی تھیں، یہ مقدس کتابیں شہر کی پولیس کے شاہی خزانے میں محفوظ تھیں، میرے استاد نے اپنے درس میں مذہب کے جو اصول بتائے ان کی بنیاد نیک گفتار نیک کردار اور نیکیوں کے تمام اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ مذہبی رہنماؤں کا ایک علیحدہ قبیلہ تھا جسے منجہتے تھے، میرے معبد بھی منج کے درجے پر قائم تھے، پھر یوں ہوا کہ میری تعلیم کے ابتداء کے کچھ ہی عرصے کے بعد میرے باپ کو اپنا جانشین مل گیا یعنی وہ بیٹا جو میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور جس کا نام راوش رکھا گیا۔ میں اپنے بھائی سے حسد کرنے لگی، لیکن میرے استاد نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ والدین کی محبت کا سمندر بہت گہرا ہوتا ہے تو فکر نہ کر خدائے بزرگ و برتر نے تجھے پہلے منتخب کیا ہے، اپنے باپ کی جانشین تو ہی رہے گی، میں نے مقدس آتش کدے کے سامنے سورج طلوع ہونے کا منظر پہلی بار دیکھا، کیونکہ زرتشت مذہب کی عبادت اسی وقت کی جاتی تھی اور عبادت کے موقع پر مذہبی کلمات پڑھے جاتے تھے۔ پھر سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی تیز دھار خنجر قربانی کے تیل کی شرگ کاٹ دیتا تھا، پہلی مرتبہ میں اس ہولناک منظر سے خوفزدہ ہو کر رونے لگی، لیکن آہستہ آہستہ اس خونی نظارے کی عادی ہو گئی۔

ذیشان عالی میں پوری دلچسپی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، البتہ مجھے چودہویں سالگرہ کے بعد ایک اور استاد کے سپرد کر دیا گیا، پھر اس دن میں نے اپنی ماں کو آتے ہوئے دیکھا، ماں نے مجھے بتایا کہ میری عمر چودہ برس ہو چکی ہے چنانچہ مجھے نسوانی تعلیم کے لئے حرم میں واپس طلب کیا گیا ہے، میں نے سخت احتجاج کیا لیکن ہدایت تھی کہ مجھے حرم میں

واپس جانا ہے، اتنے عرصے تک لڑکے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے بعد مجھے حرم کا ماحول بے حد ناگوار محسوس ہوا۔ عود و غنہ کی تیز خوشبو خوبہ سراؤں کی بے سری آوازیں اور بچوں کی مسلسل چیخ و پکار سے میرے نا آشنا کان ناواقف ہو چکے تھے لیکن اب یہ سب کچھ مجھے سنائی دے رہا تھا اور مجھے بے حد ناگوار تھا، میری ماں کی محل سرا میں شاہانہ سجاوٹ تھی، دیواروں اور دروں پر سنہرے تاروں سے بنے پردے، چھتوں پر خوب صورت جھاڑ فانوس، مٹیلیں نرم و گداز گدے کھانے کے لئے اعلیٰ ترین غذائیں اور کنیروں اور خوبہ سراؤں کی خوشامداندہ خدمت گزاریاں یہ سب میرے سامنے لایا جا رہا تھا، حال میں انہیں دیکھنا میرے لئے ایک ناپسندیدہ عمل تھا جبکہ ماضی میں نبھانے میں کن کن لمحات سے گزر چکی تھی۔

پھر ایک دن میری ماں نے مجھ سے کہا۔
”اٹھنا کیہ! ایک بہت بڑی خوشخبری ہے تیرے لئے۔“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”تو نے سکندر کا نام سنا ہے؟“

میں نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا نبھانے وہ کیا کہنا چاہتی ہے تاہم میں نے اس سے کہا۔ ”ہاں ماں، مجھے یہ نام بتایا گیا ہے، وہ مقدونیہ کے شاہ فلپ کا بیٹا ہے، یونان کو فتح کرنے کے بعد اس نے ایشیا کا رخ کیا ہے اور اس نے ہمارے شاہ فارس کی فوجوں کو بھی جنگ میں حیرت انگیز طور پر شکست دے دی ہے، لیکن آپ کس خوشخبری کا ذکر کر رہی ہیں۔“

”شاہ فارس نے اعلان کیا ہے کہ اب وہ سکندر کو شکست دینے کے لئے خود فوج لے کر جائیں گے اور اس کے لئے پورے ملک سے افواج کو جمع کیا جا رہا ہے۔ آج تمہارے باپا کو بھی وہ فرمان لا کر دیا ہے جس کے مطابق شاہ نے بابل میں تمام سرداروں کو طلب کیا ہے تاکہ سکندر کی شکست کے لئے جنگی تیاریوں کو آخری شکل دی جاسکے، اس لئے ہم سب بابل جا رہے ہیں؟“

میں نے پوچھا۔

نجانے کیوں میرے دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ ”بابل! ہم واقعی بابل جا رہے ہیں۔“
”ہاں میری بیٹی، کیا تو نے واقعی بابل کے بارے میں تفصیل سنی ہے۔“

”ہاں میں جانتی ہوں بابل دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے اور فارس کی آخری سرحدوں پر واقع ہے، مگر ماں ہم کب تک وہاں چلیں گے؟“

میرے سوال پر میری ماں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”پکی ہام سن کر ہی اتنی خوش ہو رہی ہے، لیکن بابل شہر میں تجھے دربار شاهی میں بھی حاضری دینا ہوگی، جہاں سارے ملک کے امراء، سردار اور خاندان شاهی کے افراد موجود ہوں گے، تیرے باپ کی خواہش ہے کہ اصنا کیہ اس انداز میں وہاں داخل ہو کہ اس کے حسن و جمال کی روشنی سب کو سہرزدہ کر دے، خدا نے تجھے ایسا حسن دیا ہے جو مرد کی نگاہوں کو خیرہ کر دے، تیرے بدن کو اس انداز میں تراشا ہے کہ عین کا بھیتا جاگتا وجود سامنے محسوس ہوتا ہے، تیرے حسن میں وہ کرفر ہے کہ مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے، لیکن خیال رکھنا میری بیٹی حسن کو ہمیشہ آرائش کی ضرورت ہوتی ہے، تجھے ابھی لباس پہننے کا سلیقہ سیکھنا ہے اور دربار شاهی میں نشست و برخاست پر گفتگو کے آداب کی تربیت بھی حاصل کرنی ہے، اس کے لئے میں نے بندوبست کر دیا ہے۔“

جو بندوبست میری ماں نے وہاں کیا تھا وہ یہ تھا کہ مجھے خولجہ سراموسال اور مشاطہ کے حوالے کر دیا گیا، انہوں نے میرے حسن کو بے حجاب کیا تو میں خود مسکور ہو گئی، درحقیقت ذیشان عالی میں اپنی زندگی کے اس دور کو کبھی نہیں بھول سکتی جب میں نے خود اپنا اجنبی بدن دیکھا جو میرا نہیں درحقیقت ادھار کا بدن تھا تو میں اس کی دیوانی ہو گئی، میرا یہ جسم سنگ مرمر کی طرح شفاف اور بلورین تھا، ایک ایک انگ قدرت کی صنائی کا نمونہ تھا، پھر مجھے وہ سب کچھ سکھایا گیا جو ایک عورت کے لئے

ضروری ہوتا ہے اور جس کے بغیر اس کی زندگی حقیقی مسرتوں سے محروم رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور آخر کار روانگی کی صبح آ گئی۔

ذیشان عالی میں صدیوں پرانی روح بلکہ ایک زندہ وجود ایک اجنبی بدن کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور یہ سفر اس قدر دلکش تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ختم نہ ہو، لیکن ستائیس دن تک ہمارا یہ قافلہ بلند پہاڑی راستوں، تنگ دروں، خطرناک گھاٹیوں اور جھلستے ہوئے ریگستانوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا، جب سفر کے دوران دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت ہو جاتی تو دن کو قیام کیا جاتا اور رات کو سفر، تاریکی کی بناء پر مشعل بردار سوار ساتھ ساتھ چلتے تھے، رہنمائی کرتے۔ ہم اس قدیم راستے پر سفر کر رہے تھے جو سائرس اعظم نے اختیار کیا تھا، باختر کی کارواں سرائے میں قیام کر کے ہم نے پھر آریہ جا کر دم لیا، سوسا پرسی پولیس اور بابل سے آنے والے قافلے ہمیں ان کارواں سرائے میں ملتے رہے ان کے ذریعے ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ موسم سرما میں آرام کرنے کے بعد اب سکندر نے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ حملے کر کے ایشیا میں پیش قدمی شروع کر دی ہے اور اب پورا فارس اس بات کا منتظر تھا کہ کب شاہ دارا اپنی فوجوں کے ساتھ آگے بڑھ کر سکندر کی سرکوبی کرتا ہے۔

اب تک ہم آرام سے سفر کرتے چلے جا رہے تھے، پھر ایک رات جب تاریکی اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجاتی دے، ہمارے کتوں نے اچانک زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا اور اسی کے ساتھ بہت سے گھوڑوں کے پاؤں کی آوازیں قریب آتی سنائی دیں، پتہ چلا کہ ڈاکوؤں نے اچانک حملہ کر دیا ہے، فوراً ہی ہمارے سارے سواروں نے عورتوں، بچوں اور قیمتی سامان سے لدے ہوئے فخریوں کے گرد حفاظتی ڈیرہ ڈال دیا، ڈاکوؤں کا حملہ بہت شدید تھا، اس وقت میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، میری چھوٹی بہن مجھ سے لپٹی ہوئی تھی کہ ہم نے بھینریوں کی طرح خوفناک ڈاکوؤں کو

آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے بالوں میں ڈھکے ہوئے تھے اور وہ ہمارے محافظوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی میں نے ڈاکوؤں کے سردار کو حصار توڑ کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکوؤں نے خوب صورت کینڑوں کو گاڑیوں سے تھسیٹ تھسیٹ کر اپنے گھوڑوں پر بٹھانا شروع کر دیا تھا، لیکن سردار کا رخ ہماری گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا لیکن ایسا کوئی عمل ذہن میں نہ آیا جس سے سردار سے رہائی حاصل کر سکتی، خونخوار شکل والا سردار تیر کی طرح ہماری گاڑی پر جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے میری کلائی اس کی آہنی گرفت میں تھی، میری بہن اور میری ماں نے اپنے بالوں کی نوکیلی پن اس کے بازو میں چھوئیں لیکن اس جنگلی پر جیسے اثر ہی نہ ہوا، وہ ایک زوردار قہقہہ مار کر چلا یا۔

”ارے واہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھے مل گئی۔“ اس نے مجھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن میری ماں اور میری بہن میرے جسم سے لپٹ گئیں اس وحشی نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے تھسیٹ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا، لیکن اس جدوجہد میں میرے باپ کو نہ دیکھ سکا جو جھپٹ کر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اس کے تیز دھار تیغ نے ایک ہی وار میں ڈاکوؤں کے سردار کی گردن تن سے جدا کر دی، اپنے سردار کو گرتے دیکھ کر ڈاکوؤں نے راہ فرار اختیار کی اور تھوڑی سی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد ہمارا سفر پھر سے آگے جاری ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے اس حملے میں میں نے محسوس کیا تھا ڈیٹان عالی کہ مجھے کوئی نقصان بھی پہنچایا جاسکتا ہے، جس منزل کی جانب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور جدھر سفر میرے لئے ضروری تھا اس میں رکاوٹ پیش آجانی، مجھے تو جس منصب کے لئے تیار کیا گیا تھا، میں اس کی تکمیل کر کے اہلی گوس سے بچنا چاہتی تھی اور اس سے چھینے ہوئے ظلم کو اپنے لئے مستحکم کرنے کی خواہش مند تھی، راستے میں سکندر کی مسلسل پیش قدمی

کی خبریں ملتی رہیں، البتہ میں نے کسی سے پوچھا کہ آخر سکندر کی ان فتوحات کا سبب کیا ہے، تو مجھے بتایا گیا کہ سکندر پر دیوتاؤں کا سایہ ہے، یونانیوں میں ایک روایت یہ بھی ہے ڈیٹان عالی کہ دیوتا زورس کو سکندر کی ماں اولیمپن سے عشق ہو گیا تھا پھر ایک دن زورس سانپ بن کر اس کے بستر پر سو گیا اور سکندر کی پیدائش اسی کا نتیجہ ہے، اس بات کو سننے کے بعد اس نے اعتراض کیا کہ سانپ کو زورس دیوتا تو نہیں کہا جاسکتا، میرے اناطیق نے ہنس کر مجھے جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی، یہ سب محض روایتیں ہیں اصل بات یہ ہے کہ یونانی فوج بڑی دلیر اور فن حرب سے واقف ہے، سکندر کی تربیت یونان کے مشہور فلسفی ارسطو جیسے عالم نے کی ہے۔“

”مجھے ایک بات بتائیے، اناطیق اعظم، کیا شاہ دارا اس کی فوجوں کو عبرت ناک شکست دے سکے گا؟“ میں نے سوال کیا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو، حالانکہ شاہ دارا کی فوجوں کی تعداد سکندر کی افواج سے بہت زیادہ ہے، لیکن بد قسمتی سے ہماری فوجیں کرائے کی ہیں۔“ اناطیق کے لہجے کی فکر مندی نے مجھ پر ایک عجیب سا تاثر قائم کیا اور میں سکندر کے بارے میں سوچتی رہی، میں تمہیں ایک بات بتاؤں ڈیٹان عالی عورت بھی عجیب چیز ہوتی ہے، حالانکہ میں جس ملک اور جس وطن سے تعلق رکھتی تھی، وہ سکندر کے دشمنوں کا دیس تھا، لیکن سکندر اعظم کی بہادری اور اس کے متعلق بیان کی جانے والی داستانوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں احنا کی حیثیت سے جاگتی آنکھوں اس کے خواب دیکھنے لگی تھی، وہ کیسا ہوگا، یونان کے حسن و جمال کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ وہاں کھڑے کھڑے نقوش کے لوگ ہوا کرتے تھے، دلکش شخصیتوں کے مالک، تو اپنے دشمن کے خواب مجھے نظر آنے لگے تھے، لیکن تم ہنسو گے کہ میں اس کی دشمن بھی نہیں تھی، میں تو اپنی زندگی بچانے کے لئے اس روپ

میں سفر کر رہی تھی۔

”آء میں بیچارے کو تم ہنسالی پر غور کرتا ہوں تو

مجھے اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے، وہ بھی تمہارے ساتھ لاکھوں صدیوں سے سفر کر رہا ہے، صرف تمہاری محبت میں، ورنہ جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بھی بے شمار علوم ہیں اور ان علوم کے ذریعے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، لیکن دیکھ لو اس کائنات میں جب عشق کی کہانیاں جنم لیتی ہیں تو پھر ایسے ہی اندھے واقعات وجود میں آتے ہیں، محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیتا ہے۔ سوچتے سمجھتے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور محبوب کا تصور اس کے لئے اس کی زندگی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اگر راستے میں آنے والے کسی بھی شخص سے وہ نفرت کرتا ہے تو اس میں وہ غلط نہیں ہے چونکہ یہ بھی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔“

”میں تم سے اتفاق کرتی ہوں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“

”چلو آگے بڑھو میں سکندر کی فوجوں کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ سکندر اور دارا کی جنگ کس طرح سے وجود میں آئی اور اس میں کیا ہوا؟“

کوروتی میری اس دلچسپی سے بہت خوش ہوئی اس نے کہا۔ ”یوں کرو کہ جب میں اپنی داستان دوبارہ شروع کروں تو تم میری آنکھوں میں دیکھتے رہو، ذرا برابر یہ احساس نہیں ہوگا کہ تم اس دور کا کوئی کردار نہیں ہو، اس بار جب ہم صدیوں میں داخل ہوں گے تو میں تمہیں کوئی وجود نہیں دے سکوں گی کیونکہ میں خود وہاں ایک ایسے وجود میں سفر کر رہی ہوں جو کوروتی کا وجود نہیں ہے بلکہ ادھار کا بدن ہے جسے جینا ہے۔“

”تمہاری باتیں بے شک اچھی ہوئی ہیں جب زندہ صدیاں کتابی شکل میں آئے گی اور لوگ اسے پڑھیں گے تو اس کے بعض واقعات میں اس طرح الجھ جائیں گے کہ ان کا ذہن ان واقعات کوئی حل نہیں نکال پائے گا، لیکن میں اپنی اس کتاب میں تمہارے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کا تذکرہ کروں گا اپنے

”ارے یہ تمہارے چہرے کے تاثرات کیا

بتا رہے ہیں۔“ اچانک ہی کوروتی نے کہا اور میں چونک پڑا، مجھے بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے میں دارا کی فوجوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں راستے کا ہر منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں خود اس لشکر کا لشکری ہوں، بس یہ بھی شاید کوروتی کے طرز گفتگو کی خوبی تھی کہ انسان اس ماحول میں کھو جائے، تبھی میں نے چونک کر کہا۔

”کیا ہوا کوروتی، تم نے کیا محسوس کیا میرے

چہرے سے۔“

کوروتی ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”میں صدیوں سے جی رہی ہوں ذیشان عالی، صدیوں کا تجربہ میرے وجود میں پیوست ہے، لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں انسانی فطرت شاید جب سے انسان وجود میں آیا ہے یکساں رہی ہے، اس کے اندر حسن پرستی، خود پسندی اور کسی بھی چیز سے متاثر ہونے کے جذبے اتم حیثیت رکھتے ہیں، جب میں سکندر اعظم کا تذکرہ کر رہی تھی تو میں نے تمہارے چہرے پر رقابت کا تاثر محسوس کیا، تم سکندر اعظم کی تعریف سے خوش نہیں ہوئے تھے۔“

میں نے اسے دیکھا اور پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی، واقعی میں تھوڑی سی جلد محسوس کرنے لگا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کوروتی اب میری محبوبہ تھی، چاہے فرد فراموشی ہی کی بات کہہ لی جائے، یعنی کہاں میں اور کہاں وہ لاکھوں سال پرانی شخصیت جو بے شک انسانی جسم رکھتی تھی لیکن اگر اس کی زندگی کی تاریخ پر غور کریا جائے تو انسان کو اپنے آپ پر ہنسی آنے لگے، لاکھوں سال کی یہ عورت موجودہ زندگی میں میری محبوبہ تھی اور میں اس سے بہت متاثر تھا، میری ہنسی پر وہ بھی ہنسنے لگی پھر بولی۔

”میں نے کہا نا تم آج کی بات کر رہے ہو، میں

لاکھوں صدیوں سے ان تمام کیفیات سے دو چار ہوتی ہوئی آئی ہوں، یہاں انسان اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر سکتا۔“

احساس کی ہی نہیں تمہارے احساس کی بھی صحیح ترجمانی کروں گا۔“

”آہ تمہاری ہر خواہش تمہاری زندگی میں پوری ہو جائے، میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے اور کبھی کبھی ذیشان عالی کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہم جس کو چاہتے ہیں اسے اپنے ساتھ دور تک نہیں لے جاسکتے کیوں کہ وہ فنا کا مقام رکھتا ہے اور وہ میرے ساتھ جی نہیں سکتا، خیر چلو چھوڑو، آؤ میری آنکھوں کے راستے سکندر کے دور کا سفر کرو۔“ اس نے کہا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں، درحقیقت مجھے یوں لگا جیسے میرے اطراف میں تاریخی رنگ بکھرتا جا رہا ہو، یہ بھی شاید گزرے لمحات کا کوئی تاثر تھا، تاریخی رنگ فضا میں پھیلتا چلا گیا اور اس کے بعد جب فضا صاف ہوئی تو میں نے دیکھا کہ دارا کی فوجیں آگے کا سفر کر رہی ہیں بابل کی طرف۔

بابل اس دور میں عالمگیر شہرت کا شہر تھا، یہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں دنیا کے گوشے گوشے کے تاجر خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔ سرسبز اور خوبصورت باغات نے شہر کے حسن کو دو بالا کر دیا تھا، شہر کے گرد ایک گہری خندق تھی اور عین درمیان سے دریائے فرات خراماں خراماں بہتا تھا جس میں بھرے جہاز اور کشتیاں رواں دواں تھیں۔

یہ عظیم الشان کارواں دروازے سے بابل میں داخل ہوا، میری آنکھیں اس طرح کورتی کی آنکھوں میں گم ہو گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی سحر میں گرفتار ہو گیا ہوں، میری نگاہوں کے سامنے شہر بابل تھا۔

بابل کے حسن نے مجھے اس طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا کہ میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک جدید ملک کے جدید ترین شہر کے خوب صورت سے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں جو ایک تحریر نگار ذیشان عالی کا گھر ہے، بلکہ میں اس وقت بابل کے حسین مناظر میں گم تھا اور یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے کیے رہا تھا، پھر یہ قافلہ

شہر کے بڑے بازار میں پہنچا، یہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ مختلف ممالک کے لوگ زرق برق پوشاکوں میں کھوم رہے تھے، ان کے خوبصورت چہروں کی دمک سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ہماری منزل آگئی، پھر کورتی کی آواز ابھری۔

”ہمیں قیام کے لئے جو محل دیا گیا تھا وہ شامی محل کے بالکل قریب تھا، اس کی خوب صورت عمارت چکنے فرش، رنگین نقاشیں ریشمی پردے سب بے حد شاندار تھے۔ عورتوں کے لئے ایک حصہ درمیان میں پردے ڈال کر مخصوص کر دیا گیا تھا، ہرست خوشبو سے فضا معطر تھی، آئینے میزیں اور مسہریاں انتہائی بھی ہوئی تھیں، لیکن میں بہت تھک گئی تھی، میں نے اپنی ماں سے اپنی تحکین کا تذکرہ کیا تو اس نے کسی اور سے کہا اور اس نے فوراً ہی میرے لئے غسل کا انتظام کر دیا۔ کنیزوں نے خوشبودار پانی سے میرے جسم پر غسل دیا۔ بابل کی کنیزیں بھی اپنے فن کی ماہر تھیں، انہوں نے چند ہی لمحوں میں مجھے تازہ دم کر دیا، جسم کو مساج کر کے ساری تحکین دور کر دی، پھر مشاطہ نے تیل لگا کر میرے بال سنوار دیئے اور مجھے ایسے نرم ریشمیں کپڑوں میں ملیں کیا گیا جو میں نے واقعی پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، ز کورتی کی حیثیت سے اور وہی اصنا کیہ کی حیثیت سے سنگھار سے فارغ ہو کر جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

آہ کم بخت کو تم بھنسی تیرا ستیاناس جائے، اپنی شکل دیکھ بد نصیب اور پھر مجھے دیکھ، بہر حال میری ماں بھی غسل سے فارغ ہو گئی، میرے زرق برق لباس اور گھرے ہوئے حسن کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرا دی پھر بولی۔

”تمہارے باپ کو شاہ کے دربار میں حاضری دینا ہے اصنا کیہ اس لئے آج رات خوب آرام کر کے سفر کی تحکین دور کر لو، کل ہم بابل کی سیر کو چلیں گے۔“

لیکن ذیشان عالی مجھ میں انتظار کی تاب نہیں تھی، میں یہ رات آرام کر کے ضائع کرنے کو تیار نہیں

ٹھی، اب تک جو کچھ دیکھا تھا اور جو کچھ تم نے میری آنکھوں سے دیکھا مجھے بتاؤ کیا وہ نظر انداز کرنے کے قابل تھا، اپنی بات تو میں یوں کہوں گی کہ مجھے بائبل حسن نے دیوانہ کر دیا تھا اور میں یہ رات بائبل کی رونقیں دیکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی، میرا اتالیق پہلے ہی بائبل کے کاہنوں سے ملنے جا چکا تھا اور میں جانتی تھی کہ میری ماں رات کو کسی اور کے ساتھ مجھے میر کی اجازت نہیں دے گی، اس لئے میں نے ان سے بحث کرنا فضول سمجھا، میری بے تابی اس درجے تھی کہ اس وقت کوئی قوت میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ لیکن میرے لئے بائبل کی سیر کا صرف ایک راستہ تھا، مجھے رازداری کے ساتھ بائبل کی کسی کنیز کا سہارا لینا ہوگا، میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور پھر میری نگاہ انتخاب اس کنیز پر پڑی جس نے بڑی خوبصورتی سے میرے بدن کی مائش کی تھی اگر میں اسے وہ دست بنالوں تو ہو سکتا ہے وہ کسی تدبیر سے مجھے خفیہ طور پر محل سے باہر لے جاسکے اور میں اس شہر عجائب کی رنگا رنگ رونقوں کا نظارہ کر سکوں، یہ کنیز بہت خوب صورت تھی اور اس کا سڈول جسم شباب کی فتنہ سامانیوں سے پہنا پڑتا تھا، میں نے اس پر حربہ آزمایا اور بڑے محبت بھرے انداز میں بولی۔

”لڑکی! تیرے ہاتھ میں جادو ہے تو نے جس طرح میرے بدن کا مساج کیا ہے میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے اس سے کتنا سکون ہوا، کیا نام ہے تیرا؟“

”مجھے صبا کہتے ہیں شہزادی۔“ کنیز نے خوش ہو کر کہا۔

”صبا تو بھی کسی شہزادی کی طرح حسین ہے، تجھے دیکھ کر تو مرد دیوانے ہو جاتے ہوں گے، لیکن ایک بات مجھے بتا؟“

”کیا عالیہ؟“ وہ میرے ایک ایک لفظ سے خوشی سے پھولی چار رہی تھی۔

”کیا تو غلام پیدا ہوئی تھی؟“ میں نے سوال کیا تو اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی اداسی کی لہر پیدا ہو گئی،

اس نے کہا۔

”نہیں شہزادی، میں تو آزاد ہوئی تو لیکن میرا باپ بہت غریب آدمی تھا، ہم بارہ بہنیں تھیں اس لئے اس نے دو لڑکیوں کو فروخت کر دیا، مجھے جس شخص کے ہاتھوں فروخت کیا گیا تھا وہ ایک بد صورت اور عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بد بخت جب تک زندہ رہا میرے حسین جسم کو کتے کی طرح نوچتا رہا، لیکن شکر ہے جلدی مر گیا اس کے بعد مجھے غلام بنالیا گیا اور میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس شخص نے مجھے غلام بنایا وہ اسی حرم میں رئیس خوجہ سرہان ہے، لیکن میرے لئے وہ بے حد مہربان آقا ہے، اس نے مجھے کبھی عام کنیزوں کی طرح نہیں سمجھا پچھلے پانچ برس سے میں بڑے عیش و آرام سے ہوں میرا مالک مجھ پر بڑا بھروسہ کرتا ہے، خفیہ کاموں کے لئے وہ ہمیشہ مجھے ہی شہر میں بھیجتا ہے اور آج رات بھی مجھے اس کے ایک کام سے جانا ہے۔“ ذیشان عالی اسے کہتے ہیں تقدیر کا کھیل، جس بات کے لئے میں نے اسے اتنا قریب بلایا تھا وہ خود بخود ہو گئی، تب میں رازداری سے اس سے کہا۔

”میرا دل بھی بائبل کا حسن دیکھنے کے لئے بے قرار ہے صبا، کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی؟“

”آپ کو شہزادی؟“ صبا کے دل میں خوف بیدار ہو گیا، پھر اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”میں جس جگہ جا رہی ہوں وہ باب منوا کے باہر واقع ہے، آپ کو اس جگہ لے جانا بہت خطرناک ہوگا کیونکہ رات کو بائبل میں چور اور بزن گھومتے رہتے ہیں۔“

”مگر میں اس لباس میں نہیں جاؤں گی، نہ ہی زیور اور جواہرات پہنوں گی، تم مجھے بھی کسی کنیز کا لباس لا کر دے دو، بھلا کنیزوں کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے اور سنو انکار نہ کرنا، میں تمہیں اس کام کا بھاری انعام دوں گی۔“

”ٹھیک ہے تمہیں یہ ساری تیاریاں کرنی ہیں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”باہر تو خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ہم محل سے باہر نکل پائیں گے؟“

”ہاں میرے پاس خصوصی اجازت نامہ موجود ہے، محل کے دربان اور سنتری مجھے نہیں روکیں گے اور

چونکہ آپ میرے ساتھ ہوں گی اس لئے آپ سے بھی کچھ نہیں پوچھا جائے گا بشرطیکہ آپ نقاب میں ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”جیسے ہی سب سو جائیں تو لباس لے کر آ جانا۔“ اور ذیشان عالی محل کے پھانک پر دربانوں نے ہمیں روکا، لیکن وہ اجازت نامہ جو اس خصوصی پتھر کی لوح کی شکل میں تھا، ان کے لئے کافی تھا، وہ لوح دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی، میں بے حد خوش تھی، میرے پورے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی، اصنا کیہ کی حیثیت سے میری زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا پہلا اتفاق تھا اور چونکہ میں نے اصنا کیہ کو اپنے پورے ذہن اور پورے وجود میں ضم کر لیا تھا اور کچھ وقت کے لئے بھول گئی تھی کہ صدیوں سے جینے والی کوروتی اصنا کیہ کے جسم میں ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں اصنا کیہ کے جسم میں عمر کی منازل طے کر کے بچپن سے جوانی تک آئی تھی، بس یہ تجربہ تھا اور یہ تجربہ میرے لئے اتنا دُش تھا، دل چاہتا تھا کہ اصنا کیہ کا انجام دیکھوں۔

ہاں ذیشان عالی یہ بات بڑے دکھ کی ہے بے شک میں جانتی ہوں کہ کچھ لوگ میرے اتنے قریب آئے اور انہوں نے میرے ساتھ بڑا وقت گزارا اور بڑا اچھا وقت گزارا، لیکن میں یہ سوچ کر ہی دکھی ہو جاتی تھی کہ آخر کار وہ بوڑھے ہو جائیں گے پہلے جائیں گے میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور میں زندہ رہوں گی، ان کی یادوں کو ساتھ لے کر، میں تمہیں سچ بتاؤں ذیشان عالی، میں نے اس کے لئے بڑا ایک خصوصی ملل کیا ہے، میں نے بہت سے جاپ کئے ہیں ایسے فنکاروں کی مدد سے جو یہ فن جانتے تھے کہ انسانی ذہن کو کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ جو یادوں کی شکل میں انسانی ذہن میں باقی رہ جاتے ہیں انہیں کس طرح اپنے ذہن کے خلیوں سے مٹایا جاسکتا ہے، مجھے معاف کرنا تم خود بھی اس بارے میں سوچو گے کہ اتنا اچھا وقت گزارنے کے بعد میں تمہیں بھول جاؤں گی، لیکن تم مجھے خود بتاؤ

حقیقت یہی ہے۔“

”تو میں بتا رہی تھی کہ اس وقت اصنا کیہ کی حیثیت سے محل سے پہلی بار باہر نکلی تھی۔ زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا یہ ایک انوکھا اتفاق تھا چنانچہ ہم دونوں آگے چلتی ہوئی ایک کشادہ شاہراہ پر آ گئیں جس کے دونوں جانب کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے، آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی روشنی میں بابل کا شہر عجائب میرے سامنے پھیلا ہوا تھا، کوروتی نے خوشی سے صبا کا بازو دباتے ہوئے کہا کہ بابل کی ساری رنگینیاں مجھے دکھا دے۔“ وہ شوخ سے ہنسی کے ساتھ بولی۔

”شہزادی کیا آپ واقعی شہر کی رنگینیاں دیکھیں گی، حالاں کہ اس میں خطرہ بہت ہے، ایسی جگہوں پر قتل و عصمت درمی چوری اور ہرنی عام ہوتی ہے۔“

میرا دل تو چاہا کہ میں ہنسوں اور اس کو بتاؤں کہ ایسے خطرات کی مجھے پروا نہیں ہے اور میں نے اس سے یہی کہا لیکن مفہوم دوسرا تھا، میں نے اس سے کہا۔

”صبا تو اطمینان رکھ، مجھے کسی خطرے کی پروا نہیں ہے۔“

”تو پھر آئیے میرا کوئی تصور نہیں ہے۔“

بابل دیکھنے کے شوق نے اصنا کیہ کو یعنی مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہم سب سے پہلے بڑے مندر میں گئے صبا نے مجھے بتایا کہ مذہبی روایت کے مطابق ہر عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ زندگی میں ایک مرتبہ کسی اجنبی کے ساتھ سوئے۔ مندر کے پائیں باغ میں بیٹھی ہوئی عورتیں اسی لئے منتظر ہیں، یہ باغ آپ جیسی شہزادیوں کے گھومنے کے لئے نہیں ہے۔“

اس کے بعد ہم ایک اور بہت بڑے باغ میں پہنچے وہاں جگہ جگہ درختوں میں ٹنگی ہوئی قدیمیں روشن تھیں اور لوگوں کا ایک ہجوم ملے کا سماں پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ تماشے اور رقص و سرور کی محفلیں جھی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ بڑا سا شیج بنا ہوا تھا جس کے گرد ساز بجانے والے بڑی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے، ایک شخص چنچ چنچ کر لوگوں کو دعوت دے رہا تھا کہ اہل بابل آؤ،

یا اللہ پناہ دے

اس نیند سے جس سے فجر کی نماز قضا ہو۔

ایسی مصروفیات سے جس سے ظہر کی نماز قضا ہو۔

ایسے قیلو لے سے جس سے عصر کی نماز قضا ہو۔

ایسی محفل سے جس کے لطف سے مغرب کی

نماز قضا ہو۔

ایسی تھکاوٹ سے جس سے عشاء کی نماز قضا ہو۔

(محسن عزیز حلیم..... کوٹھا کلاں)

دیکھا یہ سب کیا ہے۔

میرا دل تو چاہا کہ میں اپنا ہاتھ پیچھے کر لوں لیکن

بوزخمی کا ہنہ پر جو بیت رہی تھی اس میں بھی مجھے مزہ آ رہا

تھا، میں نے اس سے کہا۔

”تو میرا ہاتھ دیکھ۔“

”میں کیا کہوں، کیا کہوں تجھ سے دنیا کے بہت

بڑے بڑے لوگ محبت کریں گے کیا سمجھی اور اور نہیں

ہرگز نہیں، کوئی غلام لڑکی اتنا بڑا درجہ حاصل نہیں کر سکتی،

لیکن لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں، دنیا کا عظیم ترین مرد اپنی

تکوار کے ذریعے تجھ تک رسائی حاصل کرے گا۔ وہ تجھے

اپنی ملکہ بنائے گا تو نے سونے کی قسمت پائی ہے، بس

بس اب چلی جا ورنہ میرا جی تو ازن خراب ہو جائے گا۔

میں تیرے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتی،

تو تو تو..... پتہ نہیں تو کیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی لکیروں

میں کائنات کے بہت سے راز چھپے ہوئے ہیں آہ میں

ان رازوں سے واقف نہیں ہو سکتی، لیکن ہر لکیر مجھے آواز

دے رہی ہے کہ مجھے پڑھ مجھے سن مجھے دیکھ، آہ میرا

دماغ پھٹ جائے گا، لڑکی تو چلی جا چلی جا۔“

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے مسکراتے ہوئے صبا کو

دیکھا تو صبا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، میں

اس کے ساتھ باہر نکل آئی تو صبا نے سر دلہے میں کہا۔

مصر کی نامور رقاصہ کے فن کا تماشہ دیکھو، ذرا دیر کے بعد

ایک لڑکی اسٹیج پر آئی، اس کے رقص میں جادو تھا، ہجوم تھا

کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، لڑکی کا قیامت خیز شباب اور

ہیجان خیز رقص لوگوں کو بدست کئے دے رہا تھا، ان کی

بے باک دست درازیوں پر قہقہوں کا شور بلند ہوتا، صبا

نے میرے کندھے پر ہتھکی دی اور بولی۔

”جلدی چلو شہزادی یہاں سے جلدی آگے بڑھو۔“

تھوڑے ہی منظر دیکھے تھے کہ مجھے اندازہ

ہو گیا کہ بائیں واقعی شہر طرب ہے، ہر جگہ بے حجابی تھی،

عیش و طرب تھا، خوبصورت جوڑے بے باکی کے ساتھ

داویش دینے میں مصروف، بازاروں کی چہل پہل

روشنیوں اور تاریکیوں میں بکھرتے ہوئے بدست قہقہے

ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک

کاہنہ کے خیمے پر پڑی، میں نے محض تفریح کی خاطر

اسے ہاتھ دکھانے کا ارادہ کیا، خیمے میں صرف ایک شمع

روشن تھی، بوڑھی کاہنہ ایک پرانے غالیچے پر بیٹھی ہوئی

تھی، میں نے اسے چاندی کا ایک سکہ دیا تو اس کے

جھریوں دار چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے

شرارتا پہلے صبا کو آگے دھکا دیا، کاہنہ نے اس کا ہاتھ

دیکھنا شروع کر دیا۔

”لڑکی تو کثیر ہے، لیکن تو جلدی سے بائیں سے

دور بہت دور دراز کا سفر کرے گی اور تو ہمیشہ ملازم نہیں

رہے گی، کوئی عورت تجھے آزاد کر دے گی، بس اس سے

زیادہ میں اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ صبا کا چہرہ فرط سرت

سے دمک اٹھا، اس نے فوراً ہی مجھے آگے بڑھا دیا میں

نے چپکچپ کر اپنا ہاتھ سامنے کیا تو کاہنہ چونک اٹھی، چند

لمحے وہ آنکھیں بند کئے زیر لب بڑبڑاتی رہی، پھر سرگوشی

میں بولی۔

”کون ہے تو، تو کون ہے، تیری لکیریں تیری

اپنی نہیں ہیں، ان لکیروں میں فرق ہے اور شاید تو ان کو

نہ دیکھ سکے، لیکن یہ دہری لکیریں ہیں، پہلے کچھ لکیریں

ابھر آتی ہیں پھر وہ گم ہو جاتی ہیں اور نئی لکیریں ابھر آتی

ہیں۔ ارے میں نے ایسا حیرت انگیز ہاتھ پہلے کبھی نہیں

”یقین کرو شہزادی، تم نے مجھے جو عزت اور اہمیت دی ہے، میں سمجھتی ہوں یہ میری بلند قسمتی کا ایک ثمر ہے اور میں تمہیں دیکھ کر خود بھی اندازہ لگاتی ہوں کہ تم واقعی ایک عجیب و غریب شخصیت ہو۔ کہیں سے سمجھ میں نہ آنے والی۔“

”چل چل آگے چل بیکار ہاتھیں مت کر“ میں نے اس سے کہا اور ہم فرات کا پل پار کر کے ایک نسبتاً ویران علاقے میں داخل ہو گئے، جہاں بولی۔

”سڑک کے درمیان چلو تار یک درازوں میں چور اور رہن اچانک دبوچ لیتے ہیں۔“

میں مسکرا کر خاموش ہو گئی، تیز تیز قدم رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے، میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کون سی جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔“

”اڑوبہ۔۔۔۔۔ اڑوبہ ہے اس جگہ کا نام، لیکن وہ

جگہ بہت خطرناک ہے، میں اپنے ساتھ عموماً کسی محافظ کو

لے کر وہاں جاتی تھی۔ یہ سامان مجھے جہاں پہنچاتا ہے وہ

بہت ہی عجیب جگہ ہے۔“ اس نے بازو میں لٹکی ہوئی

چھوٹی سی نوکری کو سنبھالتے ہوئے کہا، میں شروع ہی

سے حیران تھی کہ نجانے اس میں کیا رکھا ہے جو وہ اتنی

احتیاط سے اسے سنبھالے ہوئے ہے، وہ کہنے لگی۔

”اس سرائے میں طرح طرح کے لوگ جمع

رہتے تھے، فنکار پہلوان سپاہی، شمشیر اور خطرناک قسم

کے چور اور ڈاکو یہ سب کا اڑوبہ ہے، اڑوبہ میں اور بھی

بہت سے کام ہوتے ہیں وہاں کی ایک خاص عورت

بڑی اہمیت کی حامل ہے اور صحیح معنوں میں اسی کا نام

اڑوبہ ہے، آپ جانتی ہیں کہ حرم کی خواتین کے لئے

اپنی پردہ داری میں بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن ضروری

ہے، اور اڑوبہ آفت کی پرکال ہے، وہ خطرناک زہروں

اور تیر بہدف دواؤں کی بھی ماہر ہے اور آج بھی اسی

سلسلے میں جارہی ہوں۔“

ہم لوگ اڑوبہ پہنچ گئے اور میں نے اس عورت کو

دیکھا جو ایک بدروح ہی معلوم ہوتی تھی جسے دیکھ کر مجھے

خطرے کا احساس ہوا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے

یہاں آ کر غلطی کی ہے، اسی سرائے میں بابل کا مشہور شراب خانہ بھی تھا۔ پھانک سے اندر داخل ہوتے ہی قہقہوں کا شور و غلغلہ سنائی دینے لگا، صبا مجھے مختلف کمروں سے ایک درمیانے کمرے میں لے آئی جو کافی کشادہ تھا دیواروں میں تیل سے جلنے والے لمپ لگے ہوئے تھے، ہر سمت پچھلی ہوئی میزوں کے گرد رکھے ہوئے عجیب و غریب کوردانوں پر مختلف قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، شراب کا دور چل رہا تھا، کہیں شطرنج اور چوسر کا کھیل جاری تھا، کہیں پچھلی کا، صبا ان تمام باتوں سے بے پرواہ کمرے کے آخر میں رکھی ہوئی میز کے گرد بیٹھی اس عورت کے پاس جا بیٹھی جس کا نام اڑوبہ تھا۔

”بڑے سردار نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔“

اڑوبہ۔ ”صبا نے جھک کر اسے تعظیم دی اور میں نے بھی

اس کی تحفہ کی۔“

”بڑے سردار کو میرا بھی سلام کہنا اور یہ تو اپنے

ساتھ آج کسے لے آئی ہے۔“ اڑوبہ کی نگاہیں پوری

طرح میرے جسم پر گزرتی تھیں۔

”یہ نئی کینز ہے، بڑے سردار نے کہا ہے کہ اسے

یہاں کا راستہ دکھا دوں۔“

صبا نے بڑی احتیاط سے بند نوکری میری سمت

بڑھائی اور سرگوشی میں بولی۔ ”ڈھکن نہ کھولنا۔“ اور پھر

میں آگے بڑھی اور اڑوبہ کو وہ لوح دکھائی۔

”ہاں میں سب کچھ پہچانتی ہوں۔“ اڑوبہ ہنسا

مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”چل یہ جگہ دیکھ اور اس پر اپنا

نام لکھ دے اور یہ ہنڈ لے جا۔“ اس نے ایک موی تختی

بڑھائی جس پر صبا نے بمشکل اپنا نام لکھا اور وہ چمڑے کی

تختی اڑوبہ کے ہاتھ سے لے لی جسے اس نے اپنے

ہاتھ میں پکڑ کر اونچا اٹھایا ہوا تھا۔

”اب کچھ دیر بیٹھ کر آرام کر لے اور شراب سے

اپنی تھکن دور کر۔“ اڑوبہ بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری مہربانی ہے ہمیں جلد واپس

پہنچنا ہے ہمیں یہی ہدایت کی گئی ہے۔“ صبا نے وہ

چمڑے کی تھیلی اپنے لباس میں چھپاتے ہوئے کہا،
نجانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا چنانچہ میں نے اپنی
باطن کی نگاہیں اس تھیلی پر جمادیں اور مجھے پتہ چل گیا
کہ اس کے اندر ایک شیشی ہے جس میں ایک بہت ہی
خوفناک قسم کا زہر موجود ہے۔ بہر طور اثر دبا ٹھہر چکی گئی
اور صبا واپسی کے لئے مڑی تو میں نے صبا کا بازو پکڑ کر
اسے روکا اور کہا۔

”ڈرا کچھ وقت اور رک صبا، میں اس پر اسرار
جگہ کو ابھی اور دیکھنا چاہتی ہوں، اس نے میری صورت
دیکھی بہر طور میں اس وقت ایک شہزادی کا رتبہ رکھتی تھی
یہ اور بات ہے کہ میں نے کینروں کا حلیہ اختیار کر رکھا
تھا۔ وہ انکار نہ کر سکی اور ہم ایک کونے میں رکھی ہوئی میز
کے گرد بیٹھ گئیں۔ ایک خوب صورت سے نو عمر لڑکے نے
لکڑی کے پیالوں میں شراب لا کر ہمارے سامنے رکھ
دی، لیکن وہ اتنی تلخ تھی کہ میں بمشکل دو گھونٹ حلق سے
اتار سکی، میں نے خود کو لہارے میں اچھی طرح چھپا رکھا
تھا۔ ہمارے قریب ہی تین سپاہی ایک عورت کو لئے
بیٹھے تھے، شراب پینے کے ساتھ وہ جنگ کے متعلق
باتیں کر رہے تھے اور میں ان کی گفتگو سننا چاہتی تھی ان
میں سے ایک نے کہا۔

”میں نے کیرانی کی جنگ میں خود حصہ لیا تھا اور
میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سکندر کے سپاہی
سپہ گری میں ہم سے بہتر ہیں، ان کے نیزے
زمینوں کی مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے
سارے ہتھیار ہم سے بہتر ہیں، وہ شاندار ہتھیاروں
کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، تم چاہو تو اس سے تصدیق
کر لو یہ بھی میرے ساتھ تھا۔“ اس نے دوسرے سپاہی
کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے۔“ اس کے ساتھی نے
تصدیق کی۔ ”مقدونیوں کے نیزوں نے ہمارے بے
شمار سپاہیوں کا صفایا کر دیا تھا۔“

”کیا تم فضول باتیں کئے جا رہے ہو جب سے
واپس آئے ہو صرف جنگ کی باتیں کرتے ہو۔“ ان

کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت نے غصے سے چیخ کر کہا۔
”چپ رہ حرام زادی۔“ تیسرے سپاہی نے
عورت کو ڈانٹا ”میں بڑی دور سے آ کر شاہی فوج میں
بھرتی ہوا ہوں، مجھے بھی سکندر کی فوجوں سے جنگ کرنا
ہے اس لئے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا
ضروری ہیں، تو خاموشی سے بیٹھ اور شراب کے گھونٹ پی
کہ تیری یہی اوقات ہے۔“

وہ لوگ دوبارہ جنگ کے بارے میں باتیں
کرنے لگے۔ دونوں سپاہی جنگ میں سکندر اور اس کے
سپاہ کی دلیری کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کر رہے
تھے اور ان کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت جس کا کچھ اور
ہی مقصد تھا بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ آخر میں
اس سے خاموش نہ رہا گیا اور اس نے طنز یہ لہجے میں
کہا۔

”بہادر و! اگر تم سکندر کے اتنے ہی پرستار ہو تو
اس کی فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہو جاتے۔“ اس نے
اتنی زور سے یہ جملے کہے تھے کہ سب بے ساختہ اس کی
بات پر ہنس پڑے۔

”بازاری عورت!“ سپاہی نے غصے میں کہا۔
”دیکھتا جانتے ہیں کہ میں سکندر کو اپنے ہاتھوں دو ٹکڑے
کرنے کی آرزو رکھتا ہوں لیکن جو کچھ ہے اسے بیان
کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ
سچ ہے۔“

”گھبراؤ نہیں۔“ ایک کونے سے ایک سپاہی کی
آواز آئی۔ ”شاہ دارا اپنی عظیم فوج لے کر اس کی سرکوبی
کے لئے خود جا رہا ہے، سکندر کو اب اس کے اپنے گھر
میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔“

سپاہی نے اپنا مقصد بیان کیا تھا جو اس کی وطن
پرستی کی غمازی کرتا تھا، لیکن میرے کان برابر والی میز کی
گفتگو پر لگے ہوئے تھے، دو نوجوان مذہب پر بحث
کر رہے تھے۔

”تمہارے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے،
ہم باہل والوں کا مذہب سب سے پرانا ہے، ہمارے

عظیم دیوتاؤں کا مانی نہیں ہے۔

یہ الفاظ جس شخص نے کہے تھے وہ درمیانی عمر کا ایک بھاری بھر کم اور مضبوط شخص تھا اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہودی نوجوان کافی خوب صورت اور خوش مزاج تھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ نوجوان بڑا دل کو بھایا اور میں پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

”تمہاری باتیں بڑی دلکش ہیں اشورا، کیا سمجھے؟“

یہ لوگ جس زبان میں بات کر رہے تھے وہ ان دنوں فارس میں عام تھی، اس کے لہجے میں بڑی مٹھاس تھی، پھر اس نے کہا۔

”لیکن ہم یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مٹی سے خالق کیا اور خدا صرف ایک ہے اور تورات اس کی تخلیق سے ہی سب سے بزرگ و برتر ہے۔“

”کیا بڑا اس کر رہے ہو تم؟“ سپانی نے غصے سے کہا۔ ”اہم اہل بابل عظیم دیوتاؤں کے ماننے والے ہیں جن کے سامنے تمہارا خدا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہ نہ بھولو کہ تم یہودیوں نے بھی پہلے مردوق اور عشتار کے مندروں میں پناہ پائی تھی اور خود تمہارے پیغمبر ابراہیم کا تعلق بھی بابل سے ہی تھا۔“

سپانی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا جبکہ دوسرے شخص کے چہرے پر سکون تھا۔

”میرے دوست تم بھی یہ بھول گئے کہ تمہارے عظیم دیوتا دانیال کا تعلق بھی اہل یہود سے تھا اور تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انہیں شیر کے پنجرے میں ڈال کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”گندے کیزے تیری یہ مجال۔۔۔“ نوجوان فیض و غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اگر سائرس اعظم تیری قوم کو آزاد نہ کرتا تو تو بھی ہمارا نوکر ہوتا ذلیل کہتے۔“ اس شخص نے اچانک پنجرہ نکال کر دوسرے شخص پر حملہ کر دیا لیکن وہ

دوسرا نوجوان پھرتی سے سامنے سے ہٹ گیا اور حملہ کرنے والا سپانی تو ازن کھو کر ہماری میز پر گرا، لوگ قہقہے لگا رہے تھے اسی وقت صبا اور میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہم نے میز پر گرے ہوئے سپانی کو سہارا دے کر کھڑا کیا ایسا کرتے ہوئے میری پوشش سر سے سرک گئی اور ایک لمحے کے لئے میری نظریں نوجوان کی نیلی نگاہوں سے ٹکرائیں میں جیسے سکتے میں رہ گئی، اچانک ہی میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت اور مسرت سے پھیلے ہوئے دیکھا اور تب مجھے ہوش آیا کہ میرا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنی پوشش کو نیچے کیا لیکن دیر ہو چکی تھی۔

”دیوتاؤں کی قسم! یہ کینز تو حسن کی دیوی ہے۔“

ایک بھاری بھر کم شخص جس نے پہلوانوں کا سا لباس زیب تن کیا ہوا تھا بدست ہو کر چیخا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی پوشش بھی کھینچ لی، اب دوسرے لوگ بھی میری سمت بڑھنے لگے تھے لیکن ایک سپانی اچھل کر آگے بڑھا۔

”دیوتا بالی کی قسم کینز تو ہماری ملکہ سے زیادہ حسین ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑنا چاہی لیکن پہلوان نے اسے دھکا دے دیا۔

”دور ہو پہلے میں نے اسے دیکھا ہے اس لئے پہلا حق میرا ہے، بول لڑکی تیرا آقا کون ہے، میں تجھے اس سے منہ مانگے داموں پر خرید لوں گا۔“

”ہمارا آقا بڑا سردار ہے، شاہ فارس کا رئیس خوبہ سرا یاں۔“ صبا نے حقارت سے کہا پھر بولی۔ ”اور اس کی کینزیں فروخت کے لئے نہیں ہوتیں۔“

”آہ لیکن میں تجھے یوں نہیں جانے دوں گا۔“ پہلوان نے جھپٹ کر میری کلائی پکڑ لی اور پھر حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”حیرت ہے اس کینز کی کلائی پر کسی کا داغ نہیں ہے، بہت خوب یہ تو کوئی خاص کینز معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

”بول لڑکی سچ سچ بتا تو کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو صرف میرے لئے

آئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”سور ڈلیل کہنے میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے مارنا شروع کر دیا، لیکن اس کی آہنی گرفت نے مجھے بے بس کر دیا، اس نے میری آواز کو اپنے ہونٹوں سے بند کر دیا، میں اس وقت واقعی اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھی، ذیشان عالی! میرے بدن میں کسی ہاتھی سے زیادہ قوت ہے، لیکن اس وقت میں اپنی قوت کو استعمال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میں کوروتی نہیں اٹھا کیہ تھی۔ ایک اور آواز بولی۔

”اے جلدی کر تیرے بعد میری باری ہے۔“

سپاہی خوشی سے چیخا۔

”اور ہماری بھی۔“ دوسری آوازیں ابھریں اور میرے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اٹھا کیہ کے روپ سے نکل آؤں اور کوروتی کی طاقت استعمال کروں، تاہم میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اگر ایسا کرتی تو اب تک اس کی تمام کوششیں بیکار جاتیں، مجھے آج بھی اہلی گوس کا خوف تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا کیونکہ وہ علم والا تھا اور پراسرار علوم رکھتا تھا، بے شک میں نے اس سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ خاموش نہ ہوگا، جہاں تک عمروں کا تعلق ہے تو کم از کم میری تو وہی عمر تھی جو اس نے دیکھی تھی اب یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں ادھار کے بدن میں تھی۔

اچانک ہی میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھری اور میں نے پوری قوت سے اس وحشی کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا، اسی وقت صبا غضبناک شیرنی کی طرح گرجی۔

”کہنے کہتے تم نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے، تو نے موت کو دعوت دی ہے اے شخص۔“ یہ کہہ کر اس نے برق رفتاری کے ساتھ ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوکری سے دوسرے اس وحشی پہلوان پر بھرپور وار کئے اور جیسے کوئی جادو ہو گیا اس کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑنے

لگی پھر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ پسینے سے تر ہو گیا، اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں، وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، میں گھبرا کر پیچھے ہٹی، اب اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا، پھر اچانک وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

”جادوگرنی، جادوگرنی ساحرہ“ یہ کہہ کر کئے ہوئے درخت کی طرح وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ سرائے میں ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ اسی وقت اڑو بہ جو کسی وقت واپس اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئی تھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی اور اس نے پہلوان کی بغیر دیکھی پھر اس کی سرد آواز ابھری۔

”یہ تو مر گیا؟“

چاروں طرف بھینھٹا نہیں کونج انھی تھیں، اڑو بہ نے کہا۔ ”تم لوگ اسے دریا میں اٹھا کر پھینک دو، اگر شاہی دستہ گشت پر آ گیا تو مصیبت آ جائے گی پلاؤ جلدی کرو۔“

”آؤ.....“ صبا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے تھینے ہوئے کہا اور ہم دونوں تیر کی طرح باہر نکل آئے، لیکن ابھی میڑھیاں بھی نہ اترے تھے کہ اندر سے لوگ چلائے۔

”یہ جادوگرنی ہے، دونوں ساحرہ ہیں پکڑو انہیں قتل کر دو۔“ مجمع تیر کی طرح ہماری طرف لپکا لیکن وہی نوجوان اچھل کر درمیان میں آ گیا، اس نے ایک ہاتھ صبا کی طرف بڑھایا اور بولا۔

”جلدی کرو وہ سانپ والی ٹوکری مجھے دے دو۔“

صبا نے فوراً ہی ٹوکری اس کی سمت بڑھادی اور پھر اس سے پہلے کہ قتل پر آمادہ مشتعل ہجوم آگے بڑھتا نوجوان نے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر زہریلا سانپ باہر نکال لیا اور مجمع کو خوفزدہ کرنے کے لئے آگے بڑھ آیا، اس دوران صبا مجھے تھینتی ہوئی باہر لے آئی اور ہم نے جان بچانے کے لئے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

”وہ سانپ، وہ سانپ کہاں سے آ گیا صبا، اس

نے میری جان اور آبرو بچائی، میں تجھے انعام سے مالا مال کروں گی۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"میں تو کری میں سانپ لئے بغیر باہل سے کبھی باہر نہیں نکلتی، صبا نے کہا اور پھر بولی۔ "جلدی تیز بھاگئے شہزادی بھاگئے اور تیز۔"

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ہم فوراً تار کی میں چھپ گئے، چند ہی لمحے کے بعد ایک گھوڑا برق رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرا، چاندنی میں مجھے اس نوجوان کا چہرہ صاف نظر آ گیا تھا وہ گھوڑے کی گردن سے چمٹا ہوا تھا، اس کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"آؤ کتنا حسین ہے وہ کس قدر خوب صورت، صبا اب تو تو میری دوست بن چکی ہے، ہر قیمت پر اس یہودی نوجوان کو تلاش کرنا، میں اس کی دلیری کا انعام دوں گی۔" میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مجھے معاف کرنا ڈیٹان عالی، مجھے معاف کرنا وہ کوروتی نہیں بلکہ امنا کیہ جو سب کچھ ہونے کے باوجود ایک عام سی لڑکی تھی اور اس یہودی نوجوان کو جو بے حد خوب صورت تھا اپنا دل دے بیٹھی تھی، صبا تو بالکل نہیں جانتی تھی کہ میں اسے کیا انعام دینا چاہتی ہوں۔ دوسرے دن میں نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنا راز وار بناتے ہوئے رات کے تمام واقعات کی تفصیل سنائی، پھر صبا کو حکم دیا کہ وہ سرائے جا کر اس یہودی نوجوان کی خبر لے کر آئے، اس نے آ کر بتایا کہ نوجوان کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں ہے اور اسے پہلی بار ہی اس سرائے میں دیکھا گیا تھا، مجھے بے حد مایوسی ہوئی میں نے صبا سے کہا کہ شاید اس شخص کے متعلق کچھ پتہ چل سکے جس سے اس نوجوان کی لڑائی ہوئی تھی لیکن سب نے جواب دیا کہ اس وقت وہ سرائے میں موجود تھا، تمام لوگوں سے پوچھ گچھ کے باوجود کچھ پتہ نہیں چل سکا، حیرت کی بات ہے کہ کوئی بھی شخص اس یہودی نوجوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

میں بے قرار ہو گئی۔ صبا کو میں نے تاکید کی کہ

دوبارہ سرائے جا کر ہر قیمت پر اس کا پتہ چلائے کیونکہ مجھے اس وقت تک چھین نہیں آئے گا جب تک کہ میں اس کا شکر یہ ادا نہ کر لوں۔

ڈیٹان عالی! ہر دور میں انسان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے، تم اسے بالکل محسوس نہ کرنا، میں تو اس وقت صحیح معنوں میں کوروتی تھی ہی نہیں، بلکہ امنا کیہ کے روپ میں تھی اور اس کی سوچیں اپنائے ہوئے تھی، کیا تمہیں میری بات بری لگ رہی ہے؟

"نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے تم میری ملکیت تو نہیں ہو میری دوست ہو۔"

کوروتی جواب نہیں دے پائی تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "آخر کار دس دن گزر گئے اور اس نوجوان کا کوئی سراغ نہیں ملا وہ اس رات کے بعد اس سرائے میں واپس نہیں آیا۔ میں اندر سے سگ رہی تھی اس کی کنول جیسی آنکھیں اس کا خوب صورت چہرہ ہر لمحے میری نظروں میں رقص کرتا رہتا تھا۔ ایک انجانی سی بے قراری اور خلش مجھے ہر لمحے بے چین کئے دیتی تھی، میرا اتالیق مجھے اور میری چھوٹی بہن کو روزانہ باہل کی سیر کرانے لے جاتا اور میری نگاہیں ہر سمت اسی نوجوان کو تلاش کرتی رہتیں، لیکن افسوس وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تمام ملک سے آئے ہوئے سپہ داروں سے صلاح و مشورے کے لئے ہونے والی جنگی مجلس انتقام کو پہنچی تو شاہ فارس نے ایک بہت اعلیٰ پائے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس شاہی دعوت میں شرکت کے لئے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ صبا نے مجھے خوشبودار پانی سے غسل دیا۔ یہ افواہیں گردش کر رہی تھی کہ شاہ کو پھر کسی ملکہ کی تلاش ہے۔ ادھر صبا اور دوسری مشاطا میں میرا استغفار کر رہی تھیں تو میں نے کسی قدر الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے علم ہے کہ شاہ کے حرم میں پہلے ہی تین سو ساٹھ بیبیاں موجود ہیں پھر وہ کسی اور ملکہ کی تلاش میں کیوں دیوانہ ہو رہا ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں صبا نے ہنس

کر کہا۔ ”شہزادی! مردوں کی حرص عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے، بس سمجھ لو یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔“

خیر صبا اور دوسری کنیزوں نے مجھے دلہن کی طرح سجا دیا، باہلی انداز میں میری چونیاں گوندھی گئیں، پلکوں اور آنکھوں پر کا جل لگانے کے بعد رخساروں پر غارہ اور ہونٹوں پر سرخی لگائی گئی۔ مجھے زرد اور نیلے رنگ کی چولی پہنائی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، زرق برق رنگ کے باریک ریشمی لباس میں میرا حسن دکھ رہا تھا۔ گلے میں نیلم اور زمرہ کا بہت ہی خوب صورت ہار تھا، یہاں تک کہ میری جوتیوں میں بھی قیمتی سنگینے جڑے ہوئے تھے۔ صبا نے بتایا کہ دستور کے مطابق شاہ جس کو پسند کرے اس کو دربار خاص میں رخص کرنا لازم ہوتا ہے، اس لئے مجھے تیار ہو کر جانا چاہیے اور جب میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

ہمیں دیوان خاص میں پہنچایا گیا جہاں تخت شاہی تھا اور ہم سب شاہ فارس کی خدمت میں بازیابی کے منتظر کھڑے ہو گئے، امراء و سارسر در شاہی مہمان باری باری تعظیم کے لئے آگے بڑھ رہے تھے، ہر سمت خوبرو مردوں اور حسین عورتوں کا جھوم تھا، میری چھوٹی بہن نے جواب خوب جوان ہو چکی تھی مجھے ڈھوکہ مار کر شوفی کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔

”دیکھ رہی ہو تم انا کیہ ساری نگاہیں تم پر ہی مرکوز ہیں۔“

میں چونک پڑی، اس میں شک نہیں کہ مرد رشک بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے، لیکن عورتوں کی نگاہوں کا حسد صاف نمایاں تھا، جب میرے باپ کی باری آئی تو پہلے دوشہزادوں نے آگے بڑھ کر انہیں بوسہ دیا، یہ اعزاز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا تھا، جنہیں برابری کا درجہ مل جائے ورنہ باقی امراء اور سرداروں کو یہ شرف حاصل نہیں تھا، آخر کار شاہ فارس کی خدمت میں بازیابی کا موقع آیا ہم دونوں بہنیں اپنے

باپ سے دو قدم پیچھے کھڑی تھیں اور ہمارے درمیان ہماری ماں تھی، شاہ کا شاہی لباس ہیرے اور جواہرات سے جگمگا رہا تھا، وہ دراز قد چھریرے بدن کا خوب صورت شخص تھا، اس کے بال سیاہ تھے، داڑھی کھنکھریالی تھی اور رنگ کانسی کی طرح تھا، ناک خمیدہ اور آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں اس کا تخت سونے کا تھا جس کے دونوں جانب مقدس نیل کے سر بنے ہوئے تھے، اس کی عبا پر دو سنہرے عقاب کڑھے ہوئے تھے اور شانے پر ایک بہت بڑا ہیرا دمک رہا تھا، میرے باپ نے شاہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے تعظیم دی اور کہا۔

”شاہ شاہان آپ کا غلام قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔“

شاہ سوئم مسکرایا اور بولا۔ ”ہم نے تمہارا سلام قبول کر لیا اب ہماری خدمت میں وہ سب کچھ پیش کرو جس کے لئے تم یہاں تک آئے ہو۔“

میرا باپ ادب اور عقیدت کے ساتھ کھڑا ہوا اور اس نے ہم لوگوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”عالی جاہ یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بڑی بیٹی انا کیہ جو میری جانشین بھی ہے اور یہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔“

میں نے دیکھا کہ شاہ کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں، میں ان کی تاب نہ لا سکی اور جلدی سے نظریں جھکا لیں، شاہ نے کہا۔

”ہم تمہاری خواتین کی بازیابی سے بہت خوش ہوئے، ایسے حسین چہروں کو ہمارے دربار میں جگہ ملنی چاہئے۔ یہ ہمارے دربار میں ہمارے واسطے جانب جگہ پائیں گی۔“

”خداے برتر و عالی، عالی جان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔“ میرے باپ نے تعظیم پیش کی۔

خصیافت کے دوران ہمیں شاہ کے داہنی جانب جگہ ملی، اس کی کرسی ہم سب سے بلند تھی، شاہی خدام انواع و اقسام کے کھانے پیش کر رہے تھے۔ سونے کے ساغروں میں شراب کا دور چل رہا تھا۔ میرے برابر ایک

نوجوان ایرانی سردار بیٹھا ہوا تھا اس نے مجھے بتایا کہ شاہ کے بازو میں ملکہ سیطرہ بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن شاہ کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں اور میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے اپنے حرم کی زینت نہ بنالے۔ میں نے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں شاہ کی داشتہ بننے پر موت کو ترجیح دوں گی۔ کھانا ختم ہوا تو خادموں نے میز صاف کر کے اس پر مختلف قسم کی شراب اور مٹھائیاں لا کر چن دیں اور اس کے بعد محفل طرب کا آغاز ہوا۔ موسیقاروں کی ایک ٹولی نے سامنے آ کر شاہ کو تعظیم دے کر اجازت لی اور طرح پر موسیقی کا آغاز کیا، ساز بڑے دلکش اور نغمہ بے حد دل پذیر تھا۔ اس کے بعد فضا میں بانسری کی سریلی آواز ابھری اور اسی کے ساتھ ایک گلوکار نے محبت کا ایک دلگداز گیت شروع کر دیا جو یوں تھا۔

”اے سینہ تجھے کیا خبر کہ میں تیرے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں۔“

آواز میں اتنا درد تھا کہ میں ٹپ اٹھی اور میں نے گردن اٹھا کر گلوکار کی سمت دیکھا۔ بھی میرا دل خوشی سے اچھل پڑا، کچھ فاصلے پر کھڑا گلوکار میری ہی سمت دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی اور نہیں وہی یہودی نوجوان تھا جس نے میری جان بچائی تھی اور جس کی تلاش میں میری آنکھیں اتنے دنوں سے سرگرداں تھیں، وہ گاتار ہا اور میں گرد و پیش سے بے خبر اسے گھورتی رہی۔ زندگی میں ایسی مسرت کا احساس ہوا جو کبھی نہ ہوا تھا، میرا دل بے ساختہ اس کی سمت کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بال بکھرے ہوئے تھے، کنول جیسی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے گیت میں مجھ سے مخاطب ہے، اس کی آواز میرے ہوش و حوش پر چھاتی چلی جا رہی تھی اور میں محرزہ ہو کر اس آواز کے جادو سے موہوش ہو رہی تھی۔

نغمہ ختم ہوا تو تمام حاضرین نے زبردست داد دی اور شاہ نے خوش ہو کر اشرافیوں کی تھیلی نوجوان کو دی، اس نے جھک کر تعظیم دی۔

اچانک ہماری نگاہیں چار ہوئیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو انا کیہ میں نے تیری محبت کا نذرانہ قبول کر لیا ہے، وہ چلا گیا، لیکن میں محبت کے عالم میں گم سم بیٹھی رہی، تب ایرانی نوجوان نے بتایا کہ سردار نے اس گلوکار کو اپنے دربار کے شاہی فنکاروں میں شامل کر لیا ہے، میرے لئے یہ خبر ایک ناقابل بیان مسرت کا باعث تھی۔ اس کے بعد شراب کا دور اور رقص و سرور کی محفل اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ بیشتر لوگ نشے میں مدھوش ہو کر قہقہے لگانے لگے۔ خود شاہ کی آنکھیں شمار آلود ہو چکی تھیں۔

اچانک ہی اس نے پری پولیس کے ایک میر کی بیوی کو اشارہ کیا، دستور کے مطابق اب اسے بے حجابی کا رقص پیش کرنا تھا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس رقص کے لئے مجھے منتخب نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جیسے ساری محفل کو بے حجابی کی دعوت عام مل گئی، بدست مرد و عورت تمام آداب سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے، میرے قریب بیٹھے ہوئے ایرانی نوجوان نے بے تابی کے عالم میں مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

”آہ روئے زمین کی ملکہ حسن، میں کتنا خوش قسمت ہوں۔“ اس نے حد سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”تم دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو؟“ میں نے اسے دھکا دے کر غصے سے کہا۔

”پاکل نہ ہوا انا کیہ بابل میں تو اسی کو زندگی کہتے ہیں اور اس میں برائی بھی کیا ہے؟“

میں اسے دھکا دے کر دور ہٹ گئی، دوسری طرف میری بہن خود کو ایک دوسرے نوجوان کی دست درازیوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی، میری ماں نے پریشانی اور بے بسی کے عالم میں میرے باپ کی سمت دیکھا اور بولی۔

”ہماری آبرو خطرے میں ہے، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہاں سے فوراً نکل چلیں؟“

لیکن میرے باپ نے مایوسی سے جواب دیا۔

”نہیں جب تک بادشاہ رخصت نہ ہو جائے کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، ایسا کرنا شاہ کی توہین ہوتی ہے، کاش میں تم لوگوں کو بابل نہ لایا ہوتا۔ البتہ اسی لمحے بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ واپسی کے لئے مڑا تو ہماری آبرو بھی بال بال بچ گئی اور ہم واپس چلے آئے۔ غرضیکہ کچھ اور وقت گزرا یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہودی نو جوان جس کا نام بعد میں اولاش پتہ چلا تھا شاہی طائفے میں شامل ہے۔

صبا کو اپنا راز دار بنانا بہت ضروری تھا، ویسے بھی میں نے اس کنیز کو وفادار اور قابل اعتماد پایا تھا، اس لئے میں نے اس کو ہدایت کی کہ وہ یہودی نو جوان سے ملنے کی کوئی سہیل نکالے تو میں اسے مال مال کر دوں گی۔ وفا دار صبا شاید میرے دل کا راز جان گئی۔

دوسرے دن وہ خوشی خوشی واپس آئی اور مجھے بتایا کہ ملاقات کا سامان ہو گیا ہے، میرا ہاپ شاہی دربار میں جنگلی مجلس میں حاضری دینے گیا ہوا ہے اور ماں رات کی تسکین دور کر رہی ہے، چنانچہ میں نے بازار جا کر بابل کے پارچہ جات خریدنے کا بہانہ کر کے اجازت لے لی اور ساتھ ہی اپنی چھوٹی بہن کو لے لیا، صبا جب ہمیں لے کر بازار پہنچی تو اولاش ایک دکان کے سامنے ہمارا منتظر تھا، میرے چہرے پر چونکہ نقاب پڑی ہوئی تھی اس لئے مجھے نہ پہچان سکا، تب میں اس کے قریب پہنچی اور میں نے کہا۔

”میرا سلام قبول کرو اولاش۔“

وہ اچھل پڑا، خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”میرا بھی سلام قبول کرو احنا کیہ۔“ اس کی آواز میں بے پناہ مسرت تھی، اس نے پھر کہا۔ ”اور اس عزت افزائی کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔“

میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ اس نے میری جان بچائی تھی، اس کی آنکھوں میں جو تشکر تھا وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا، البتہ اس نے بازار میں گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا۔

”قریب ہی ایک باغ ہے اس میں بیٹھ کر

اطمینان سے بات کریں گے۔“ میں نے مڑ کر دیکھا میری چھوٹی بہن اور صبا کچھ فاصلے سے ہمارے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ آخر کار ہم ایک کنج میں جا کر بیٹھ گئے جو کھنٹی جھاڑیوں کی آڑ میں تھا، میں نے اپنی نقاب الٹ دی۔

”تم سے مل کر مجھے جو خوشی ہوئی ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکو گی۔“ اولاش نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”احنا کیہ جب میں نے سرائے میں پہلی بار تمہارا بے نقاب چہرہ دیکھا تو ہوش و حواس کھو بیٹھا، یقین جانو، تم نے بے مثال حسن پایا ہے جو ہر کسی کو دیوانہ بنا سکتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم جیسی اعلیٰ نسب خاتون بدنام جگہ پر کیا کر رہی تھی۔“

جواب میں، میں نے اسے تفصیل بتائی تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”تم واقعی بے حد دلیر اور مہم جو خاتون ہو۔ جب صبا نے یہ بتایا کہ تم کنیز ہو تو میں نے یہ قہقہہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر تم کو آزاد کرالوں گا، اس کے بعد سے ہر لمحہ تمہاری شکل آنکھوں میں کھوتی رہی، ایک لمحے کو قرار نہیں تھا، بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح تم کو ہمیشہ کے لئے اپنالوں۔“

”لیکن اولاش۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”ہاں بس کیا بتاؤں کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے، کہاں ایک اتنے بڑے سردار کی بیٹی اور کہاں ایک عام گویا۔“

”نہیں اولاش، میں نے صبا کو بھیج کر تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ہے تم بے تکلف ہو کر بات کرو۔“

اولاش نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”ہاں یہ میری خوش قسمتی ہے۔“ پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں حاصل کرنے کا تصور کیسے کر سکتا ہوں۔“

میں تڑپ اٹھی اور اس کی نگاہوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا، لیکن اس کی گہرائیوں میں بے کسی اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔

”تم مایوس کیوں ہوتے ہو اولاش، محبت چھوٹے بڑے کے امتیاز سے بے نیاز ہوتی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی حجاب نہیں محسوس ہوتا کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں۔“

”اوہ احسانا کیہ، میری زندگی میری آرزو۔۔۔“ اس نے بے تاب ہو کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا کہ ”میں کتنا خوش نصیب ہوں، میں کتنا خوش نصیب ہوں۔“

ہم دونوں گرد و پیش سے بے خبر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے، اولاش کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا، میں صبر و قرار کے بندھن توڑ چکی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو سورج ڈھل چکا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی اولاش اب مجھے جانا چاہیے۔“ ”ابھی نہیں میری زندگی، ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے، کچھ دیر اور ٹھہرو، لیکن یہ ممکن نہیں تھا میں نے اسے بتایا کہ ”یہاں سے کچھ فاصلے پر صبا اور میری بہن بیٹھی انتظار کر رہی ہیں اور محل میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا، بس بہت ہو چکا ہے۔“ میں نے بمشکل خود کو اس کے بازوؤں سے علیحدہ کیا۔

”ہم پھر ملیں گے اولاش اور تم یقین کرو میں اس ملاقات کے لئے ہر لمحہ بے قرار رہوں گی۔“ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، پھر میں نے دل بھری آواز میں کہا۔

”لیکن تم لو گے کہاں؟“

”میں دریا کے کنارے یہودیوں کی بستی میں رہوں گا، مجھے کسی ایسے قابل بھروسہ آدمی کی تلاش ہے جو بادشاہ کی عنایت کی ہوئی اشرفیاں یروشلم میں میرے والدین کو پہنچا دے۔“

”تم یروشلم کے رہنے والے ہو؟“

”ہاں آج سے اکیس برس پہلے میں وہیں پیدا ہوا تھا، تین سال پہلے موسیقاروں کے ایک طائفے کے ساتھ مصر گیا اور وہاں سے شاہ فارس کے ایک درباری نے میرا گانا رات کا پسند کیا کہ مجھے یہاں لے آیا اور میں

شاہی طائفے میں ملازم ہو گیا۔“

”میں اس درباری کی احسان مند ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میری زندگی ہمیشہ نامکمل رہتی۔“

”آہ ایسا نہ کہو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم اتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک آئی ہو۔ ورنہ میں محبت کے اس درس سے محفوظ رہتا جو میری زندگی کی انمول دولت ہے، لیکن افسوس کہ نو دن کے بعد ہم کو جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا، کیونکہ شاہ اس دن سکندر کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور شاہی طاقت فوج کے ساتھ جائے گا۔“

”صرف نو دن۔ نہیں ایسا نہ کہو تمہارے بغیر بابل میرے لئے ویران ہو جائے گا اولاش“ ہم جدائی کے اذیت ناک تصور دل میں چھپائے ہوئے جدا ہوئے، میرا دل چاہ رہا تھا کہ نو دنوں کا ایک ایک لمحہ اولاش کے بازوؤں میں گزاروں اور شاید میری یہ دعا سن لی گئی، کیونکہ دوسرے دن سے جنگی تیاریوں کے سلسلے میں میرے بابا اس قدر مصروف ہو گئے کہ رات گئے تک دربار شاہی میں رہتے اور اس طرح میرا بیشتر وقت اولاش کے ساتھ گزرنے لگا، ماں سے بابل کی سیر کا بہانہ کر کے میں، میری چھوٹی بہن اور صبا صبح بھر نکل جاتے اور شام تک باپ کے ویران کونے میں ہم دونوں محبت کے عہد و پیمان کرتے، کبھی کبھی وہ ہم سب کو ساتھ لے کر بابل کی سیر لے کر جاتا، اس دوران میں نے اپنی بہن کا تعارف بھی اس سے کرادیا تھا ایسے موقع پر صبا بھی ساتھ ہوتی تھی۔ اولاش نے ہمیں بابل کے مندر کی عالیشان عمارت دکھائی، مینار بابل کی سیر کروائی اور پھر ایک دن جب ہم تنہائی میں محبت کی لذتوں سے ہمکنار ہو کر باتیں کر رہے تھے وہ مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتانے لگا اس نے بتایا کہ موکی عقیدے کے ماننے والے کسی غیر مذہب کے لوگوں میں شادی نہیں کر سکتے، ان کے عقیدے کے مطابق یہ گناہ ہے، میں اس انکشاف پر چند لمحے کے لئے اداس ہو گئی۔

(جاری ہے)



عشق کے اسرار

سیدہ عطیہ زاہرہ - لاہور

اچانک نوجوان نے کنوئیں میں چھلا مگ لکادی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے کنویں میں پتھر برسائے شروع کر دیئے مگر اس کے باوجود نوجوان نعرہ عشق بلند کرتا رہا، وہ لہولہان ہو گیا تھا مگر پھر بھی

عشق کیا نہیں جانتا بلکہ عشق ہو جاتا ہے..... اس کے صداق سبق آموز کہانی

معمول کے خلاف کھڑے ہو کر اس نوجوان کی پذیرائی کی اور ذوق و شوق کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوئے۔ حافظ کی پیشانی پر بوسہ دے کر آپ نے کہا۔ ”کیوں نہ ہو میاں! عاشق ہوا!“ ان الفاظ میں عجیب تاثر تھی۔ کریم کے دل کی دنیا زبرد بر ہو گئی۔ وہ عشق و عاشقی سے یکسر نا آشنا تھا، لیکن اس نے سوچا۔ ”حضرت کہہ رہے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔“

وارث شاہ کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ ایک معتبر شخصیت جس نے تصوف کی بلند یوں کو چھوا، یہ کہانی ان بی کے ایک مرید جاں نثار عبد الکریم کی ہے۔ عبد الکریم ایک خوش جمال، خوش خصال، خوش رو، خوش خو، سترہ سال کے نوجوان تھے۔ وہ لکھنؤ کے ایک دینی مدرسے کے طالب علم اور حافظ قرآن بھی تھے۔ جب وہ پہلی بار وارث شاہ کے پاس آئے، تو آپ نے

Dar Digest 119 May 2015

وارث شاہ نے پہلی ہی درخواست پر اسے بیعت کر لیا۔

ایک سال بعد دیوہ میں وارث شاہ کے والد کا عرس منعقد ہوا۔ لکھنؤ سے کریم دیوہ پہنچا۔ اس دوران اس نے اپنے ایک رشتے کے چچا کے ہاں قیام کیا۔ دیوہ میں وہ وارث شاہ سے ملا، تو انہوں نے کریم کو دیکھتے ہی بڑے جوش سے کہا۔ ”عاشق آیا۔ عاشق آیا!“ اسی دوران انہوں نے عبدالکریم کو ایک کتاب دی اس کتاب میں حیرت انگیز قصہ درج تھا۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے۔

”ایک امیر کسی رئیس کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ وہ دن رات روتا اور لڑکی کے مکان کے چکر کاٹتا، کھانا پینا، سو جاگتا، سب کچھ بھول گیا تھا اس نے بے انتہا مصائب برداشت کئے۔ یہ کیفیت برسوں رہی۔ آخر ایک درویش سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ شخص درویش کے حکم پر ایک جگہ سکون سے بیٹھ گیا۔ اس نے فقیرانہ زندگی اختیار کر لی، اس کی محبوبہ کو معلوم ہوا تو وہ مضطرب ہو کے گھر سے نکلی اور اپنے چاہنے والے کے پاس پہنچ کر بولی۔ ”تم نے مجھے فراموش کیوں کر دیا ہے؟“

اس شخص نے لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ نہ جانے اس نے کیا کہا، کہ لڑکی بھی پاؤں توڑ کر اس کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی اور پھر وہ اپنے گھر بھی واپس نہیں گئی۔

وارث شاہ نے عبدالکریم کو کتاب دیتے ہوئے

کہا۔ ”میاں اسے روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔“

کریم بہت خوش ہوا۔ گھر پہنچ کے اس نے اپنی چچی سے ذکر کیا۔

”چچی جان آج تو مرشد نے کرم کی انتہا کر دی۔ انہوں نے مجھے یہ کتاب مرحمت فرمائی ہے اور کہا ہے کہ ”اسے روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔“

گھر کی تمام عورتوں کو کتاب کا قصہ سننے کا اشتیاق ہوا۔ ان کی فرمائش پر عبدالکریم نے نہایت ذوق و شوق سے داستان پڑھ کر انہیں سنائی۔ داستان سب کو بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔ عبدالکریم روزانہ گھر میں کتاب سنانے لگا۔ چچی کی لڑکیاں ان دنوں قرآن ناظرہ پڑھتی تھیں۔

ایک روز چچی نے اس سے کہا۔ ”بیٹا میری بچیاں اب بڑی ہو گئی ہیں۔ باہر کے کسی غیر آدمی سے پڑھوانا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، بچیوں کو قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔“

عبدالکریم راضی ہو گیا۔ وہ اس روز سے لڑکیوں کو قرآن پڑھانے لگا۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام پیاری تھا۔ وہ تیسرا پارہ پڑھتی تھی۔

عبدالکریم اسے پڑھاتا تو وہ عجیب انداز سے اس کی صورت دیکھتی، عبدالکریم کا چہرہ حیا سے سرخ ہو جاتا۔

پیاری کی آواز شیریں تھیں، اور لب و لہجہ نہایت دل فریب تھا۔ عبدالکریم اس کے لب و لہجے میں کھو جاتا! عرس کی تقریبات ختم ہونے کے بعد عبدالکریم کلیجے پر پتھر رکھ کے دیوہ سے اپنے گاؤں آ گیا، لیکن وہ اپنا دل دیوہ ہی میں پیاری کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہیں تھا، پیاری کی موتی صورت ہر وقت اس کی نظروں میں پھرتی! وہ کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر اس کے لئے روتا! اس کا کوئی مونس نہ تھا، کوئی غم گسار نہ تھا، دل کا راز کس سے کہتا؟

چند روز بعد اس کی بہن کی شادی تھی۔ شادی میں دور اور نزدیک کے تمام رشتہ دار جمع ہوئے، عبدالکریم کے چچا بھی اپنے تمام خاندان کے ساتھ آئے، پیاری بھی آئی تھی۔ وہ اور عبدالکریم ہاں نوٹ کر ملے جیسے صدیوں سے چھڑے ہوئے ہوں، تقریب ختم ہوئی، تو مہمانوں نے جانے کا قصد کیا، عبدالکریم کے والدین نے چچی اور ان کی لڑکیوں کو کچھ دنوں کے لئے روکنا چاہا۔

چچی نے کہا۔ ”میرا ٹھہرنا تو مشکل ہے۔ البتہ لڑکیوں کو چھوڑ سکتی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ کریم انہیں قرآن پڑھا دیا کرے۔“

عبدالکریم کی والدہ نے جواب دیا۔ ”بہن کریم تمہارا بیٹا ہے۔ بسر و چشم پڑھائے گا۔“

پیاری کی والدہ لڑکیوں کو عبدالکریم کے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ عبدالکریم نے انہیں نہایت جاں فشانی

سے پڑھایا اور بہت جلد پورا قرآن ختم کروادیا مگر اس کے دل میں محبت کی آگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پیاری کا خوب صورت چہرہ ہر وقت اس کے سامنے رہے اور وہ اسے پڑھاتا رہے۔

رفتہ رفتہ پڑوس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ عبدالکریم اور پیاری کے عشق کا چچا شروع ہو گیا۔ کسی نے پیاری کے والدین کو بھی خبر کر دی۔ چنانچہ ایک روز ایک کبار سواری لے کر دروازے پر آ گئے۔ پیاری اور اس کی بہنوں کو رخصت کرنے کے لئے ڈولیوں میں بیٹھا دیا گیا۔

عبدالکریم کی حالت نہایت ہی خراب تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور چہرہ فرقت کے جوش سے تپ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیاری کی حالت بھی خراب ہونے لگی۔ اندیشہ ہوا کہ لڑکی کا دم نہ نکل جائے، چنانچہ چند لمحوں کے لئے عبدالکریم اور پیاری کو از سر نو بات کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ پیاری نے عبدالکریم سے صرف اتنا پوچھا۔ ”آپ دیوہ کب آئیں گے؟“

عبدالکریم نے بے قراری سے جواب دیا۔ ”تم پہنچو، میں پیچھے پیچھے آتا ہوں۔“

عبدالکریم کا اپنے گھر میں وقت گزارنا عذاب ہو گیا، پھر علی الصباح اندھیرے ہی اس نے ہاتھ منہ دھوئے اور ناشتہ کئے بغیر بڑا گاؤں سے پیدل دیوہ روانہ ہو گیا۔ وہ گھنٹوں بھوکا پیاسا چلتا رہا۔ اس نے کہیں دم نہ لیا، آخر دوپہر کے وقت وہ اپنی چچی کے گھر پہنچ گیا۔

عبدالکریم نے پیاری کو رخصت کرتے وقت سمجھا دیا تھا کہ ”قرآن ختم ہونے کا ذکر اپنی والدہ سے نہ کرنا بلکہ کہنا“ ابھی کچھ سپارے باقی ہیں۔ ”لہذا پیاری نے اپنی ماں سے کہا۔“ اماں! حافظہ بھائی سے کہیے کہ جتنا قرآن باقی رہ گیا ہے، وہ ختم کرا دیں۔“

پاری کی والدہ بولیں۔ ”بیٹی یہ کیسے ممکن ہے۔ عبدالکریم کا ہمارے ہاں رہنا دشوار ہے، اور روزانہ بڑا گاؤں سے دیوہ آنا اس سے بھی زیادہ دشوار!“

عبدالکریم وہیں موجود تھا اس نے کہا۔ ”چچی

جان! آپ فکر نہ کیجئے۔ میں بڑا گاؤں سے روز آ کے پڑھا دیا کروں گا۔“

چچی کہنے لگیں۔ ”بیٹا! یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لوگوں کی زبانیں کون پکڑے گا؟“

عبدالکریم نے چچی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ”ہمیں لوگوں سے کیا مطلب ہے چچی جان! ہمارے دل اور ہماری فتمیں تو صاف ہیں۔“

عبدالکریم روزانہ عصر کے بعد بڑے گاؤں سے چلتا اور آٹھ نو بجے رات تک چچا کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ گھنٹے تک وہ پیاری کو قرآن پڑھاتا اور گیارہ بجے رات کو دیوہ سے چلتا اور صبح کی نماز بڑا گاؤں میں ادا کرتا۔ یہ سلسلہ دوڑھائی برس تک جاری رہا۔

رفتہ رفتہ دیوہ میں بھی اس کی آمد و رفت کے متعلق چہ گیوئیاں ہونے لگیں۔ آس پاس کی عورتوں نے پیاری کی والدہ سے کہا ”عبدالکریم روزانہ بلا ناغہ رات کے وقت تمہارے گھر آتا ہے، کیا تم لوگوں کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں؟“

پاری کے والد جہاں گیر آباد میں ملازم تھے۔ میٹروں نے ان کے کان بھر دیئے۔ وہ سخت طیش میں وہاں سے دیوہ آئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو نہایت برا بھلا کہا اور پھر کہا کہ ”خیر دار عبدالکریم اب اس گھر میں ہرگز نہ آئے۔ اگر وہ یہاں آیا تو سمجھ لینا، مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

عبدالکریم رات کے نو بجے وہاں پہنچا اس نے دستک دی، چچی دروازے پر آئیں، انہوں نے کریم سے صاف کہہ دیا ”میاں! تمہیں گھر میں آنے کی اجازت نہیں۔ فوراً چلے جاؤ اور آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا!“

عبدالکریم کہتے میں رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسی وقت پیاری ایک کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آ گئی۔ چچی نے اسے ڈانٹا، لیکن وہ رو کر کہنے لگی۔ ”حافظہ بھائی سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“ اس کی والدہ مکان میں چلی گئیں۔

پاری نے جہاں گیر آباد سے والد کی آمد کا ذکر

کیا اور بتایا۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ آئندہ تمہیں گھر میں نہ آنے دیا جائے۔“

چند لمحوں تک وہ حسرت سے اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر بولی۔ ”دیکھو میں تمہیں ایک تدبیر بتاتی ہوں۔ تم جانتے ہو۔ گھر کے سب لوگوں کا خیال ہے کہ اس بالا خانے پر جن رہتے ہیں۔ اگر تم آئندہ مجھے دیکھنا چاہو تو رات کے وقت جن بن کے آ جاؤ، مگر اس کام میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو شک ہو گیا تو میرے منہ میں خاک، تمہاری جان کی خیر نہیں ہے۔“

عبدالکریم نے کہا۔ ”پیاری! اب جان کی پروا کسے ہے؟ جان تو ہم جھٹلی پر لئے ہوئے ہیں۔“ مکان کے اندر سے چچی نے ڈانٹ کر پیاری کو بلایا۔

عبدالکریم نے اسے تسلی دی۔ اور کہا کہ ”تم غم نہ کرنا، میں سب انتظام کر کے دو تین روز میں آؤں گا۔“ محبوب کے کوچے سے وہ بھٹکی ہوئی آنکھوں اور چلتے ہوئے سینے کے ساتھ لوٹا، پیاری نے ملاقات کی بے مثال تدبیر بتائی تھی۔ اب کریم نے ٹھان لی تھی کہ جن ضرور بنوں گا۔ خواہ سچ سچ کے جنات مار ڈالیں، اور خواہ پیاری کے گھر والے ذلیل و خوار کریں۔

عبدالکریم وہاں سے چلا تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پیاری کی سورت مستقل نگاہ کے سامنے رہتی۔ اس پر کبھی حافظ کی جان سدھتے ہوئی، کبھی دل ٹار ہوتا۔ قلب کی گہرائی سے بار بار آواز آتی کہ حسن کی بارگاہ سے جو بھی فرمان صادر ہو، اس کی تعمیل عین فرض ہے۔ دیوہ سے نکل کر کریم بڑا کاؤں گیا، اس نے ضد یا حیلے کر کے اپنی والدہ سے کچھ روپے لئے اور لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ میں اس نے جن بننے کے لئے تمام ضروری سامان خریدا۔ مختلف قسم کے عطر، اگر بتیاں، شیرینی، کوئلے، دیا سلائی، لوہے کی سات آٹھ سلاخیں، دو دو ہاتھ لمبی اور موٹی، ایک پورا تھان خرید کے اس نے یہ چیزیں باندھ لیں۔ اور ایک لمبے بھی آرام نہیں کیا۔ لکھنؤ سے وہ سیدھا دیوہ پہنچا۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ قصبے کے در و دیوار پر

سناٹا تھا۔ پیاری کے مکان کی غنمی دیوار میں کریم نے سلاخیں گاڑ دیں اور ان کے ذریعے بالا خانے پر پہنچ گیا۔ اوپر جا کر اس نے کسی جگہ اگر بتی جلائی اور کسی جگہ لوہاں سلاکایا، کہیں چراغ روشن کیا، کہیں عطر اور گلاب کا عرق چھڑکا، بالا خانہ خوشبو سے مہک گیا۔ عشق نے اسے ایک اور تدبیر بھائی اگر وہ زینے سے مکان میں اترا تو کوئی اسے جن نہیں سمجھے گا، وہ کوٹھے سے دھم سے صحن میں کود گیا۔ کودنے کی بھیا تک آواز سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ عورتیں حواس باختہ ہو گئیں اور سمجھیں کہ آج حقیقت میں جن نازل ہو گیا۔ انہوں نے گھبرا گھبرا کر کہنا شروع کیا۔

”یا حاجی وارث! یا خواجہ معین الدین، یا شاہ منعم! یا شاہ رزاق ہماری مدد کیجئے۔“ پیاری کی والدہ کا دہشت سے برا حال تھا۔ انہوں نے جلدی سے پھونک مار کر چراغ گل کر دیا تاکہ جن کی صورت دیکھ کے لڑکیاں نہ ڈر جائیں۔ عبدالکریم نے دالان کے ایک گوشے میں جا کر ڈراؤنی آواز سے کہا۔

”بڑی بی! چراغ جلاؤ اور ہماری صورت دیکھو۔ تم روز کہتی تھی کہ ہم نے کبھی جن کی صورت نہیں دیکھی۔ لو آج ہم تمہاری آئینہ و پوری کئے دیتے ہیں۔“ پیاری کی والدہ کی کھانسی بندھ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کے بولیں۔ ”حضور ہماری خطا معاف کر دیجئے۔ ہم اس لائق کہاں کہ آپ کی صورت دیکھیں ہم غریبوں پر رحم کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے دل کر مر جائیں۔“

جن نے زبردست قہقہہ لگایا۔ ”بڑی بی! یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں آسانی سے چھوڑ دیں گے۔ ہمارے آنے کی وجہ سنو۔“ عبدالکریم یہاں آتا تھا۔ تمہاری لڑکی اس سے قرآن پڑھتی تھی۔ ہم بھی اس کی تلاوت شوق سے سنتے تھے۔ اب کیا وجہ ہے کہ تین دن ہو گئے، تلاوت کی آواز نہیں آئی؟“

پیاری کی والدہ نے جواب دیا۔ ”حضور! ہم نے عبدالکریم کو خود یہاں آنے سے روک دیا۔ اس کی آمد و رفت سے ہماری بچی رسوا ہو رہی تھی۔ اگر آپ

علاوت سننا چاہتے ہیں تو جس وقت کے لئے حکم دیجئے گا، بچی اسی وقت تلاوے کرے گی۔ ہم ہر طرح حاضر ہیں۔“

جن نے کہا۔ ”بڑی بی! ہمیں قرآن سننے سے مطلب ہے۔ عبدالکریم سے نہیں! ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور پیاری ہمیں قرآن سنائے گی۔ ہم مدت سے تمہارے بالا خانے پر رہتے ہیں۔“ پیاری کی والدہ نے یہ بات منظور کر لی۔

”عبدالکریم روزانہ اسی طریقے سے اگر بیاں اور لوہان چھت پر سلگاتا۔ چراغ روشن کرتا اور دھم سے صحن میں کوو پڑتا۔ لیکن چھت پر واپس جاتے۔ وقت وہ زینداستہ مال کرتا۔

ہوتے ہوتے بستی میں اس حیرت انگیز واقعے کی شہرت ہو گئی۔ بعض لوگوں نے وارث علی شاہ کو بھی بتایا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں ہاں، پڑھا جن ہے۔ پڑھا جن ہے۔“ ان الفاظ کا مطلب کوئی نہیں سمجھا۔ سب یہ ہی سمجھتے رہے کہ کوئی عالم و فاضل، تلاوت کا عاشق زبردست جن ہے۔

عبدالکریم کئی مہینوں تک جن بن کر پیاری کے گھر جاتا رہا۔ کبھی کبھی دن کے وقت وہ حافظ عبدالکریم کی صورت میں بھی جاتا۔ وہ جن بن کے پہلے سے کہہ دیتا تھا کہ فلاح مقام پر عرس ہے۔ ہم وہاں جا رہے ہیں۔ چند روز نہیں آسکیں گے۔

پیاری کی والدہ جانتی تھیں کہ عبدالکریم اور پیاری میں پاک و صاف محبت ہے۔ ہر طرح اطمینان کے قابل پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وارث شاہ ان کے مکان پر آئیں اور عبدالکریم کے بارے میں اپنی زبان سے کوئی اشارہ کریں تاکہ رہا سہا خدشہ بھی دور ہو جائے۔

ایک دن عبدالکریم اپنی چچی کے گھر پہنچا۔ انہوں نے کہا۔ ”بیٹا! حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرو کہ اگر مکان پر تشریف لائیں تو بڑا کرم ہوگا، سب دیدار کر لیں گے۔“

عبدالکریم نے وعدہ کر لیا کہ وہ وارث شاہ سے یہ درخواست کرے گا، لیکن وہ اپنی محبت کے باعث شرمندہ تھا۔ اس لئے مدت سے اس نے وارث شاہ کا سامنا نہیں کیا تھا۔ البتہ راہ چلتے جب بھی انہیں دیکھتا۔ نگاہ نیچی کر کے ادب سے سلام کر لیتا اور قدم بوس ہو جاتا۔ وارث شاہ، عبدالکریم پر ایک نگاہ ڈالتے اور متحسّم ہو کے کہتے! ”عبدالکریم تم کہاں ٹھہرے ہو خون، جگر کا معاملہ ہے۔“

بہر حال وہ چچی کے اصرار پر وارث شاہ کے پاس گیا۔ اس نے چچی کا پیغام انہیں سنا دیا۔ وارث شاہ بولے۔ ”اچھا سہ پہر کو چلیں گے۔“

عبدالکریم نے لوٹ کر اطلاع دی کہ وارث شاہ سہ پہر کو آئیں گے۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عورتوں نے مل جل کے مکان کی صفائی شروع کر دی۔ اور وارث شاہ کی نشست گاہ آراستہ و چہرستہ کی۔ سہ پہر کو عبدالکریم دوبارہ ان کے پاس گیا، وارث شاہ اس کے ساتھ پیاری کے گھر پہنچے اور استراحت کے لئے بستر پر لیٹ گئے۔

عبدالکریم کی چچی اور لڑکیاں وارث شاہ کے ہاتھ پاؤں دبانے لگیں۔ عبدالکریم کچھ فاصلے پر پوہار سے بیٹھ لگاے گردن جھکائے دم بخود بیٹھا تھا۔ اس کے دل کی حالت ناقابل بیان تھی۔

ایک ایک اس پر رقت طاری ہوئی، اس نے اونچی آواز سے رونا چاہا، مگر مال ضبط کیا اور چپکے چپکے آنسو بہاتا رہا، وارث شاہ نے کئی مرتبہ دریافت کیا۔ ”عبدالکریم کہاں گیا؟ عبدالکریم کہاں گیا؟“

پیاری کی والدہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے بیٹھا ہے۔ پیاری نے عبدالکریم کے پاس جا کے کہا۔ ”جاؤ تم بھی حضرت کے پاؤں دباؤ نا!“

یہ سنتے ہی عبدالکریم کی حالت خراب ہو گئی، اس کا جسم لرز نے لگا، ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں رہے، لیکن اسے پیاری کا حکم ماننے کی مجال نہ تھی، وہ آہستہ آہستہ وارث شاہ کے قریب پہنچا۔ وارث شاہ عبدالکریم کی یہ

حالت دیکھ کر مسکرائے۔ انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ پیاری بھی دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ جلد ہی یہ کیفیت ہوئی کہ کریم ان کے پاؤں دبانے لگا۔ پیاری بھی وارث شاہ کے پاؤں دباری تھی۔ وارث شاہ یہ تماشا دیکھ کر مسکراتے رہے، پھر یکا یک پیاری کی والدہ سے مخاطب ہوئے۔ ”پیری کی ماں!“ ہم نے بہت سیر کی ہے، اور تمام ملکوں میں پھرے ہیں۔ ہم ایک مقام پر پہنچے تو ہمیں ایک بات معلوم ہوئی۔ ایک شخص کسی لڑکی پر عاشق تھا اور اس کا عزیز تھا۔ لوگوں نے اس کی حالت دیکھ کر بدنامی کا خیال کیا۔ اور اسے آنے جانے کی مخالفت کرنے کے لئے مشورے ہونے لگے، طے پایا کہ وہ کسی کے کہنے سننے سے نہیں رکے گا۔ البتہ لڑکی اگر خود کہہ دے کہ میرے پاس نہ آیا کرو، تو مان جائے گا۔

لڑکی کے عزیزوں نے لڑکی کو سمجھایا بھجایا اور مجبور کیا کہ اسے آنے جانے سے منع کر دے، چنانچہ وہ آیا تو لڑکی نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”اب یہاں نہ آیا کرو۔“ عاشق نے کہا۔ ”کیا سچ کہتی ہو؟ میں نہ آیا کروں؟“ اس نے تین مرتبہ اس سوال کی تکرار کی۔ لڑکی نے کہا۔ ”ہاں نہ آیا کرو، نہ آیا کرو، نہ آیا کرو۔“

جیسے ہی تیسری مرتبہ لڑکی نے نہ آنے کے لئے کہا۔ عاشق کی روح اس کے قالب سے پرواز کر گئی۔ اور ادھر اس کی جان اُٹھی، ادھر لڑکی بھی جاں بحق تسلیم ہو گئی۔ یہ قصہ سنانے کے بعد انہوں نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر کہا۔ ”سنو پاک منشق میں خدا مدد کرتا ہے۔“

یہ کہہ کے وہ اٹھ بیٹھے، انہوں نے پہلے پیاری کی پیٹھ پر پھر کریم کی پیٹھ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ اس واقعے کے بعد چچی کی بدگمانی جاتی رہی۔ وہ کریم کی خاطر مہارت کرنے لگیں۔ کریم کی آمد و رفت دوبارہ کثرت سے شروع ہو گئی۔

لیکن جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے، لوگوں نے پھر طرح طرح کی افواہیں گرم کرنی شروع کر دیں، کریم نے احتیاطاً آنا جانا کم کر دیا، مگر وہ رات کو جن بن کر

روزانہ وہاں جاتا تھا۔ ایک رات جن کے بہرہ پ میں پیاری سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ”میں لکھنؤ جا رہا ہوں تمہیں کچھ منگوانا ہو تو بتا دو، لیتا آؤں گا۔“

پیری نے کہا۔ ”میرے لئے عتیق پتھر کی ایک تسبیح لیتے آنا۔“ کریم کا خیال تھا۔ گھر والے سو رہے ہیں، لیکن اس کی چچی جاگ رہی تھی۔ انہوں نے جن کی باتیں سن لیں اور یہ سمجھیں کہ کریم نے عمل وغیرہ پڑھ کے بالا خانے کے جن اپنے قبضے میں کر لئے ہیں اور ان کی مدد سے خود جن بن کر یہاں آتا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ ضرور کریم ہی ہے، مگر انہوں نے کریم سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔

کریم کو جن بن کر آتے تین چار مہینے گزر گئے تھے۔ ایک دن دوپہر کو عبدالکریم آیا۔ چچی نے اس سے پیاری کا پردہ کرایا اور اسے کسی طرح کریم کے سامنے نہیں آنے دیا۔ کریم نے گھر کے اندر سے پیاری کے رونے کی آواز سنی وہ مضطرب ہو گیا، یکا یک پیاری روٹی ہوئی آئی اور کریم کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی بڑی بہن نے کہا۔ ”پیری! اماں جان نے تمہیں باہر آنے سے منع کیا تھا۔ پھر تم کیوں آئیں؟“

پیری نے جواب دیا۔ ”اماں جان کی یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ کریم رشتے میں میرے بھائی ہیں اور انہوں نے مجھے قرآن شریف بھی پڑھایا ہے۔ تمام ہستی جانتی ہے کہ ان سے میرا پردہ کبھی نہیں تھا۔ اب اگر میں نے پردہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے، اس میں میری بدنامی ہے یا نہیں، میں پوچھتی ہوں آخر پردے کی وجہ کیا ہے؟“

لڑکیاں دم بخود رہ گئیں۔ کریم کو نہ جانے کیا خیال آیا وہ فوراً اٹھ گیا۔ اور جانے لگا۔ چچی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ وہ بہت بدحواس تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا، قدم پڑتا کہیں تھا، وہ بڑا گاؤں کی طرف روانہ ہوا، مگر آدھے راستے سے پلٹ کر پھر دیوہ آ گیا، اور پیاری کے گھر پہنچا۔ اندر سناٹا تھا۔ پیاری ایک طرف بیٹھی رو رہی تھی۔ کریم نے اس کی بہنوں سے

دریافت کیا۔ ”یہ کیوں رو رہی ہے؟“

انہوں نے بتایا ”آپ کے جانے کے بعد اماں نے اسے پردے سے باہر آنے کی وجہ سے خوب مارا۔ مگر وہ برابر یہی کہتی رہتی کہ ”میں کریم بھائی سے پردہ نہیں کروں گی۔“

اس واقعے نے کریم کی طبیعت پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ رات ہوئی تو وہ حسب معمول جن بن کر بالا خانے پر گیا اور صحن میں کود پڑا، پیاری کی والدہ کو سخت تعجب ہوا، کہ کل تو یہ کہہ گیا تھا کہ ہم خواجہ کے عرس میں اجیر شریف جا رہے ہیں، آج کیسے آگئے؟“ انہوں نے آواز دے کر کہا۔ ”حضور! کیا عرس میں تشریف نہیں لے گئے؟“

جن نے ڈپٹ کر کہا۔ ”بی بی! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کریم سے پیاری کا پردہ کیوں کرایا؟ اور پیاری کو مارا کیوں؟ ہمیں خبر ہوگئی ہے۔ اسی لئے ہم واپس آگئے ہیں۔ ہمیں تمہاری گستاخی سے بہت دکھ ہوا ہے۔ کریم ہم سے جو بھی خدمت لے گا، ہم اس کی بجا آوری کے لئے تیار ہیں۔“

پیاری کی والدہ متوحش سی ہو گئیں، وہ خطا معاف کروانے کے لئے جن کی فتیں کرنے لگیں، مگر جن نے ان کی ایک نہ سنی، اس نے کہا۔ ”ہم اس وقت تو جا رہے ہیں مگر بہت جلد تمہیں اس حرکت کا مزا ضرور چکھائیں گے۔“

دوسرے دن کریم دن کے وقت دیوہ آیا اور رشتے کے ایک ماموں کے ہاں ٹھہر گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پیاری کی والدہ کو خبر ہوئی، تو جنت کی ناراضی کے خیال سے وحشت ہونے لگی کہ کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے، ویسے بھی جن دھمکی دے کر گیا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کی ملازمہ کو کئی بار بھیجا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، وہ عبدالکریم کو لے آئے، لیکن کریم اس سے مس نہ ہوا۔

روزہ کھولنے کے لئے ممانی نے بھی کریم کے لئے افطاری تیار کی اور پیاری کی والدہ نے بھی بھیجی۔

کریم نے خیال کیا کہ چچی کی افطاری میں پیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے، اس نے وہی افطاری کھائی اور چچی کو پریشان کرنے کے لئے ممانی والی افطاری میں سے کچھ چیزیں اٹھا کر ان کی بھیجی ہوئی افطاری میں شامل کر دیں۔

چچی کے گھر کی ملازمہ برتن لینے آئی تو ساری چیزیں اسی طرح موجود تھیں۔ چچی یہ دیکھ کر اور حواس باختہ ہوئیں کہ کریم نے افطاری واپس کر دی۔

رات کو پھر چچی نے ملازمہ کو روانہ کیا، کہ کریم کو لے کر آؤ، مگر کریم نہیں گیا، آخر چچی خود آئیں اور زبردستی اسے ساتھ لے گئیں، انہوں نے پیاری کو بلانے کے کریم کے قریب بیٹھایا اور کہا۔ ”پیاری! کریم بھائی کو کھانا کھلاؤ۔“ پیاری ایک خوب صورت سنی میں کھانا لے آئی، کریم کھانے لگا، دفعتاً چچی کے حواس بگڑنے لگے۔ نہ جانے کیوں ان کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی، لکڑی، جوتا، ڈنڈا جو کچھ بھی ہاتھ میں آیا، اٹھا اٹھا کر وہ سب کو مارنے لگیں، لیکن کریم اور پیاری کو انہوں نے کچھ نہ کہا، پھر اسی وحشت کے عالم میں کنویں میں گرنے کے لئے وہ دوڑیں، سب نے مل کر انہیں پکڑ لیا، یہ کیفیت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی اور بارہ بجے رات تک قائم رہی۔

ماں کی یہ مجنونانہ حالت دیکھ کر پیاری کا برا حال تھا۔ وہ کریم کے پاؤں پکڑ کے کہنے لگی۔

”اماں پر تم نے تو کچھ نہیں کر دیا؟“

کریم نے جواب دیا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ شاید ان کے قلب کی حرارت سے ایسا ہوا ہے۔“ یہ کہہ کر کریم مردانے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پیاری کی بڑی بہن نے کریم کو بلا کے کہا۔ ”کریم بھائی ایک خط لکھ دو۔ ملازم کے ہاتھ خط بھیج کر جہاں گیر آباد سے ابو کو بلانا ہے۔“

کریم نے مردانے میں جا کر چچا کے نام خط تو لکھ دیا، مگر اسے خیال آیا کہ اگر ملازم یہ خط لے گیا تو چچا

فورا آ جائیں گے، پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئیں۔
کریم نے گھر کے ملازم عظمت کو بلایا اور الگ لے جا کر
اس سے کہا۔

”عظمت! تم بھی کچھ جانتے ہو کہ یہ کیا قصہ
ہے، اور ایسا کیوں ہوا؟“

عظمت نے جواب دیا۔ ”کریم میاں! مجھے
سب معلوم ہے آپ اپنی چچی سے ناراض ہو گئے ہیں۔
اس سبب سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ اب جب
تک وہ آپ کو منا نہیں لیں گی اسی آفت میں پھنسی رہیں
گی۔ آپ کے قبضے میں جن جن ہیں وہ جن انہیں پریشان
کئے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر کریم کو خوشی ہوئی، ”یہ آدمی بھی جنات کا
قائل تو نکلا۔“ کریم نے عظمت سے کہا۔ ”میں جنات کو
شام سے سمجھا رہا ہوں، مگر وہ میری ایک نہیں سنتے، اب
مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی ہے اور خوف ستارہا ہے کہ ادھر تم
خط لے کر جاؤ گے ادھر جنات تمہیں گھیر لیں گے۔“

عظمت کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ وہ گھبرا
کر بولا۔ ”نا میاں! نا! اب تو یہ لوگ لاکھوں کا لالچ بھی
دیں تو میں خط لے کر نہ جاؤں۔“

کریم نے کہا۔ ”اگر انکار کرو گے تو نوکری سے
انکار مل جائے گا۔“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے نوکری کی پروا نہیں
ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔“

کریم کہنے لگا۔ ”میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا
ہوں۔ اگر اس پر عمل کرو گے تو نوکری بھی سلامت رہے
گی اور تم جہاں گیر آباد جانے سے بھی بچ جاؤ گے۔“

عظمت نے کہا۔ ”میاں جلدی سے بتائیں،
میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔“

کریم نے کہا۔ ”تم ڈیوڑھی پر جا کے خط مانگ لو
اور پھر مکان کے پچھواڑے زمین پر گر کے چیخنے چلانے
اور قلابازیاں کھانے لگنا، سب یہ سمجھ لیں گے کہ خط لے
کر جا رہے تھے، جنات نے ہانکان پریشان کر دیا۔ اس
طرح میری تدبیر پر عمل کرو۔“

عظمت نے کہا۔ ”میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل
کرتا ہوں۔ وہ فوراً ڈیوڑھی پر پہنچا۔ اس نے پیاری کی
بڑی بہن سے خط لیا، اور روانہ ہو گیا، تھوڑی دور جا کر
اس نے اپنی پگڑی، لائٹھی اور جوتے سب کچھ پھینک دیا،
اور زمین پر گر کے مرغ بھل کی طرح تڑپنے لگا۔ بارہ
بچے رات کا وقت ہوگا۔ ایک میراثی پڑوس میں رہتا تھا۔
اس نے عظمت کا غل غبارہ سنا، تو اٹھ کے باہر نکلا۔
عظمت بہت برے حال میں زمین پر لوٹ رہا تھا۔
میراثی نے پوچھا۔

”ارے! عظمت! تمہیں کیا ہوا؟“

عظمت نے اٹھ کر اس کے گال پر زور سے ایک
ٹھانچہ رسید کیا۔ میراثی کا منہ چیخ کی طرح گھوم گیا۔ وہ
خوف زدہ ہو کر بھاگا، اور مکان پر پہنچ کر چیخنے چلانے لگا۔
کریم چادر اوڑھے ہوئے بستر پر لیٹا تھا، چچی
کی طبیعت سنبھالنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں
کر رہے تھے۔ میراثی کا شور سن کے وہ باہر نکلے۔ انہوں
نے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“ میراثی نے بھرائی ہوئی
آواز میں کہا۔ ”میاں! جلدی سے جا کر دیکھیے۔ عظمت
کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

وہ عظمت کے قریب پہنچے۔ دہشت سے ان کے
بھی روٹنے کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ”افسوس۔ گھر
میں صرف ایک مرد نوکر تھا، اس کی بھی یہ حالت ہو گئی۔
اندر مورتوں کی حالت الگ خراب ہے۔ یہ کریم کا بچہ
ابھی نہ جانے اور کیا کیا گل کھلائے گا، اسی نے گھر بھر کو
پریشان کر رکھا ہے۔“ وہ کریم کے پلنگ کے پاس گئے
اور اسے اٹھا کر بولے۔

”بھائی! ہماری خطائیں معاف کر دو! کیا تم
کوئی خون کروا کے جاؤ گے؟ عورتیں کیا بے پردہ
ہو جائیں؟ جب خوش ہو گے؟“

کریم نے کہا۔ ”جناب اب مجھے کیوں ملامت
کر رہے ہیں؟ میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ کہنے لگے۔ ”یہ سب آفتیں تمہاری وجہ سے
آئی ہیں۔“ اس نے عظمت نے ڈیوڑھی میں آکر آواز

دی۔ ”دیکھو میاں! اگر تم نے کریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہ ہوگا۔“

”پیاری کی والدہ کے حواس کچھ کچھ بحال ہو چکے تھے۔ عظمت کی آواز سن کر وہ لچاوت سے بولیں۔ ”کریم کی مرضی کے خلاف اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ جیسا کہیں گے کروں گی۔“

صبح کریم بڑا گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ رشتے کے ایک عزیز بھی اس کے ساتھ نکلے، راستے میں انہوں نے مشورہ دیا کہ ”کریم میاں! میں جہاں کیر آباد جا رہا ہوں۔ تم بھی میرے ہمراہ چلو، میں رات کے واقعے کا ذکر پیاری کے والد سے کروں گا، اور ان پر زور ڈالوں گا کہ وہ پیاری کی شادی تمہارے ساتھ کر دیں، ورنہ ان کی رسوائی تو ہوگی ہی، کسی کا خون بھی ہو جائے گا۔“

کریم بے چارہ شامت کا مارا ان کے ساتھ جہاں کیر آباد پہنچا۔ انہوں نے ساری داستان خوب نمک مرچ لگا کر پیاری کے والد کو سنائی اور آخر میں کہا۔ ”کریم کے قبضے میں دو جن ہیں۔ سوچ لیجئے۔ اگر آپ نے پیاری کا نکاح کریم سے نہ کیا تو وہ جن پورا گھر برباد کر کے رکھ دیں گے۔“

پیاری کے والد غیظ و غضب سے چلائے۔ ”خواہ کچھ ہو جائے گھر سلامت رہے یا اجڑے۔ میں پیاری کی شادی کریم سے ہرگز نہ کروں گا۔“ وہ ٹیش سے کریم کے قریب آ گئے۔ ”میاں! دو جن تم نے اپنے قبضے میں کیا کر لئے ہیں، خدائی پر قبضہ کر لیا ہے۔ سارے گھر کو رات سے پریشان کر رکھا ہے۔ میں اسی وقت دیوہ جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں، کہ تمہارے جن میرا کیا رنگاڑ لیں گے۔“

کریم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”جناب! آپ وہاں جانے کی زحمت کیوں کرتے ہیں؟ جن تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ جی چاہے تو ابھی تماشا دیکھ لیں۔“

ان عزیز کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جلدی سے کہنے لگے۔ ”کریم میاں! کیا یہاں بھی آبرو کے خواہاں ہو؟

کچھ تو ہوش سے کام لو۔“

کریم نے کہا۔ ”میری اس میں کیا خطا ہے؟ چچا جان خود جنوں کا مقابلہ کرتا چاہتے ہیں۔ جن اس وقت بھی میرے ساتھ ہیں۔ اور اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ میں نے انہیں بہت مشکل سے روک رکھا ہے۔“

ان عزیز نے کریم کے چچا سے کہا۔ ”بھائی جان آپ بھی غصہ تھوک دیجئے۔ کریم آپ کا بھتیجا ہے، کوئی غیر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ عرض کرے، اطمینان سے سن لیجئے۔“

چچا تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر کریم سے کہنے لگے۔ ”اس وقت مجھے معاف رکھو۔ غور و خوض کے لئے کچھ وقت دو۔ تین دن بعد مجھ سے ملنا۔“

کریم نے سلام کیا اور جہاں کیر آباد سے بڑا گاؤں آیا۔ تیسرے روز وہ وہاں پہنچا۔ چچا کا مکان رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ سب نے کریم کو دیکھا۔ مگر کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کریم نے مایوس واپسی کا قصد کیا۔ اتفاق سے پیاری کے پھوپھا بھی بڑے گاؤں جا رہے تھے۔ وہ کریم کے ہمراہ ہو لئے۔ جہاں کیر آباد سے نکل کر انہوں نے کہا۔ ”کریم میاں! بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے، کہ تمہاری وجہ سے ایک خون ہو جائے گا۔“

کریم نے وحشت سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں پھوپھا جان! کیسا خون؟“

انہوں نے کہا۔ ”پیاری کے والد اور چچا کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم دونوں طالب و مطلوب ہو۔ خود سوچو، شرفاء میں اس سے زیادہ قابل شرافت کون سی ہوتی؟ اسی وجہ سے پیاری کے والد نے عزیزوں کو جمع کیا تھا۔ سب نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ عزت بچانی ہے، تو پیاری کی جان لے لیں، اگر انہوں نے اسے مار ڈالا میاں! تو تمہیں بھی جان دے دیں چاہئے۔ تم اس کے بغیر زندہ رہ کر کیا کرو گے۔“

کریم کے ہاتھ پیروں سے جیسے جان نکل گئی۔

کھینچ لے کر حلق میں آنے لگا۔ وہ بے حد بدحواسی میں وہیں سے دیوہ کی طرف بھاگا۔ راستے بھر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر پیاری نہ رہی، تو زندگی بے کار ہے اسے بھی جان دے دینی چاہئے۔ اس نے سوچا کہ پیاری کے مکان میں ایک کنواں ہے۔ اس میں گر کر جان دینا بہتر ہوگا۔ یہ طے کر کے وہ دیوہ پہنچا۔

پیری کے مکان پر سناٹا تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی، مکان کا دروازہ بند تھا۔ اس بہت ناک سناٹے نے کریم کو یقین دلادیا کہ پیاری کے والد اور چچا قہقہے چکے ہیں اور انہوں نے پیاری کو مار ڈالا ہے۔

کریم مجنونانہ انداز میں مکان کا طواف کرنے لگا۔ پھر اس نے زور زور سے آوازیں دیں، لیکن نہ دروازہ کھلنا کھڑکی سے کوئی جھانکا۔ کریم پریشانی میں شاہ منعم کے سجادہ نشین کے پاس گیا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ انہوں نے خدام کو حکم دیا کہ "کریم کو اٹھا کر حمام میں لے جاؤ، اور اس کے جسم پر اچھی طرح پانی ڈالو۔"

خدام نے حکم کی تعمیل کی۔ کریم کو دیر تک نہلایا گیا۔ پھر کپڑے پہنائے گئے اور مہر لگا کے سجادہ نشین کے سامنے لے جایا گیا۔ کریم کو کسی پل چین نہ تھا۔ یک بارگی وہ محل کے پھر پیاری کے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ کریم روزے سے تھا۔ افطار میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ کریم پیاری کے مکان پر پہنچا۔ اب دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کریم نے ایک مستانہ غیر مارا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ جاتے ہی اس نے سر کے بل کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ اتفاق دیکھئے وہ کنویں میں کودا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے سنبھال لیا ہے۔ مگر اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹیں آئیں ایک ہاتھ کی ہڈی باہر نکلی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

پیری کی والدہ نے کریم کو کنویں میں کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان کے منہ سے چیخیں کل گئیں۔ پاس پرہس کے لوگ جمع ہو گئے۔ گھر والوں نے پیاری کو ایک

کوفری میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنویں میں ایشیں وغیرہ برسانی شروع کر دیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کسی نے سید معروف شاہ واری کو خبر پہنچادی کہ کریم نے کنویں میں چھلانگ لگا دی ہے اور گھر والے کنویں میں ہی پتھر برسا کے اسے ہلاک کر دینے کے درپے ہیں۔

معروف شاہ چند معززین کے ساتھ اسی وقت وہاں پہنچے۔ انہوں نے کنویں پر آ کر آواز دیں۔ "کریم! زندہ ہو۔ تو بولو۔" کنویں میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ اتنے میں پیاری کی چچ کریم کے کان میں پہنچی۔ پیاری اپنے گھر والوں سے رورو کے کہہ رہی تھی "آخر تم لوگوں نے کریم بھائی کی جان لے لی۔ اب تو دروازہ کھول دو۔"

کریم نے پیاری کی آواز سنی، تو اس کے قلب میں تقویت پیدا ہوئی اور جان میں جان آئی، اسے یقین ہو گیا کہ پیاری ابھی زندہ ہے، اس نے کنویں سے پکار کر کہا "میں زندہ ہوں میں زندہ ہوں، جلدی سے مجھے باہر نکالو۔"

معروف شاہ کے حکم پر ایک کھٹولاری سے باندھ کر کنویں میں لٹکایا گیا اس طرح کریم باہر نکلا، نکلتے ہی اس نے قلب و جگر کی تمام تر گہرائی سے نعرہ لگایا۔ "مزا ہے پیاری کا۔" یہی نعرہ لگاتے ہوئے وہ معروف شاہ کے ساتھ ان کے مکان پر آیا۔

خدام نے اسے پٹکری ڈال کے دودھ پلایا۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے لیکن یہ نعرہ اس نے بار بار جاری رکھا۔ "مزا ہے پیاری کا۔"

شاہ معروف نے کہا۔ "کریم! میں کہاروں کو بلواتا ہوں۔ وہ تمہیں پاکی میں بیٹھا کے بڑا گاؤں لے جائیں گے۔"

کریم بچوں کی طرح محل کر بولا۔ "حضرت

میں اب قیامت تک اپنے مکان پر نہیں جاؤں گا۔"

شاہ معروف نے کہا۔ "نہیں، نہیں تجھے جانا

ہوگا۔ کیا تو جانتا نہیں کہ پیاری کے والد اور دوسرے

عزیز تیری جان کے درپے ہیں۔ نجانے تیرے ساتھ کیا

سانحہ پیش آ جائے، لڑکی کی آبرو کا معاملہ ہے۔ ساری

بستی انہی کے ساتھ ہوگی۔“

کریم نے شاہ معروف کے پاؤں پکڑ کے کہا۔
”حضرت میں نے تو جان دے دی تھی۔ بے حیا ہوں
کہ اب تک زندہ ہوں۔ کیا کروں، مرنا میرے اختیار
میں نہیں ہے۔ درنہ میں جان دینے سے نہیں ڈرتا۔“

اس اثنا میں کریم کے ایک رشتے دار میاں نوروز
علی بھی وہاں آ گئے، اور اسے سمجھا بجھا کے اپنے گھر لے
گئے، اسی رات پیاری کے والد بھی جہاں گیر آباد سے
دیوہ پہنچے۔ گھر والوں نے ساری داستان سنائی، کریم
سے یہ بات غلط کہی گئی تھی کہ پیاری کے والد پیاری کو
ہلاک کرنے کے لئے دیوہ چار ہے ہیں۔ کریم نے
ساری رات یہ نعرہ لگا کے کافی کہ ”مزا ہے پیاری کا۔“
اسے نہ ہڈی ٹوٹنے کا احساس تھا، نہ کسی اور تکلیف کا۔

صبح معلوم ہوا کہ وارث شاہ دیوہ آرہے ہیں۔
کریم کا عجیب حال ہوا جو لوگ وارث شاہ کے پاس
جانے والے تھے، کریم ان کی طرح طرح سے خوشامد
کرنے لگا کہ ”ممکن ہے، حضرت دیوہ آ کر میرے
خلاف باتیں سن کر مجھے یہاں سے نکل جانے کا حکم دے
دیں، مجھے دیوہ سے نکلنے نہ دینا!“ لیکن جو سنا کانوں کو
باتھ لگاتا کہ ہماری کیا مجال کہ حضرت کی بات مانیں۔

کریم کو ان دنوں حضرت وارث پر صرف اتنا
اعتقاد تھا کہ وہ ایک بزرگ ہیں اور سب ان کے مطیع و
فرماں بردار ہیں۔ اگر انہوں نے حکم دے دیا کہ کریم کو
دیوہ سے نکال دیا جائے، تو پھر کوئی اسے یہاں نکلنے نہیں
دے گا۔

آٹھ بجے صبح سید معروف شاہ چند محرزین کے
ہمراہ وارث شاہ کے استقبال کے لئے گئے۔ وارث شاہ
نے ان کی طرف مبہم دیکھ کر کہا۔ ”کیوں کریم کنویں
میں کود پڑا، کیوں ایسا کیا جو وہ کود پڑا؟“ پھر معروف شاہ
کی طرف دیکھ کر بولے۔

”سنا محبت ایسی تو ہو جیسی کریم کو ہے۔“

معروف شاہ نے سارا واقعہ سنا کر کریم اور
پیاری کی کیفیت بیان کی۔

وارث شاہ نے کہا۔ ”ہاں دونوں طرف ہے
آگ برابر لگی ہوئی۔ پاک محبت ہے، پاک محبت ہے،
مگر دنیا کے لوگ نہیں مانیں گے، اور ان کی بدنامی ہوگی،
کریم عاشق ہے، وہ عاشق ہے۔“

کریم کے بارے میں وارث شاہ کی زبان سے
یہ الفاظ سن کر لوگوں نے اس کی حمایت شروع کر دی، اور
کہا کہ ”جی حضور کریم تو بہت اچھے آدمی ہیں۔“

وارث شاہ کے الفاظ کریم کے کانوں میں بھی
پڑے۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ رات کو وہ ان سے ملنے
کے لئے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ کریم نے دستک دی۔
وارث شاہ کو اطلاع دی گئی کہ کریم آیا ہے۔ انہوں نے
کہا۔ ”کریم مستان کریم مستان!“

کریم وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جو کنویں
میں چوٹ لگنے سے خون آلود ہو گئے تھے۔ وارث شاہ
نے دروازہ کھولا، کریم نے ان کے قدم چومتے۔

وارث شاہ بولے۔ ”کریم تم سے ضبط نہیں ہوا،
کنویں میں پھاند پڑے، کون سا ہاتھ ٹوٹا؟“ انہوں نے
دفعاً کریم کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی اسی
وقت جڑ گئی۔ وارث شاہ نے کہا۔ ”کریم! وہ لوگ
تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ آئندہ ان کے گھر نہ جانا!“
کریم نے دل میں کہا۔ وہاں تو ضرور جاؤں گا،
کیوں نہیں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔

یہ خیال اس کے دل میں آیا ہی تھا کہ وارث شاہ
نے پھر تنبیہ کی۔ ”دیکھو ہرگز نہ جانا، وہ لوگ تمہیں مار
ڈالیں گے۔“

کریم ان سے رخصت ہو کر گھر سے باہر آیا۔
عشق کا جن اس کے سر پر سوار تھا۔ کوئی بات ذہن میں نہ
آتی تھی۔ بس اسی وقت بے تاب ہو کر وہ پیاری کے
مکان تک آ گیا اور اندر گھس گیا۔ عورتوں اور مردوں نے
پکڑ کر اسے خوب مارا پیٹا اور بری طرح لہو لہان کر کے
باہر نکال دیا۔

کریم پاٹلوں کی طرح بستی کے گلی کوپوں میں
صدا لگاتا پھرا۔ ”مزا ہے پیاری کا، مزا ہے پیاری کا!“

خستہ حال، بھوکا پیاسا اور داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی، اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ پیاری کے والدین نے اپنے دروازے پر پہرا لگوادیا تاکہ کریم دوبارہ نہ آسکے۔ پیاری کی حفاظت کے لئے بھی عورتیں مقرر کردی گئیں۔

ایک روز کریم جذب میں یہ ہی صدا لگاتا ہوا مکان کے گرد پھر رہا تھا۔ پیاری کوٹھے پر چڑھ آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چند عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے پیاری کو پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ اسی وقت مکان کا وہ زینہ گرا دیا گیا۔

کریم کی زبان پر دن رات پیاری کے نام کی رت تھی۔ لڑکے ہالے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے، کوئی پتھر اور کوئی چپت رسید کر کے بھاگ جاتا، کسی کا جی چاہتا تو دوری سے پتھر پھینک مارتا، نوبت یہاں تک آگئی کہ کریم گلی گلی پٹنے لگا، ایک روز پیاری کے مکان کے گرد طوفان کرتے ہوئے وہ یہی صدا لگا رہا تھا۔ ”مزا ہے پیاری کا؟“ کہ پیاری کی والدہ اور دوسری عورتیں حضرت وارث شاہ کے پاس گئیں اور بولیں۔

”حضور کریم ہمیں بدنام کرتا ہوا پھرتا ہے اور ہماری بچی کا نام علی الاطلاق لیتا ہے۔“

وارث شاہ نے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو ہم اسے دیوہ سے نکال دیں گے۔“ انہوں نے اپنے خادم نور محمد شاہ سے کہا۔ ”جاؤ اور اسی وقت کریم کو پکڑ کر لاؤ۔“ نور محمد شاہ نے کریم سے مل کر سارا واقعہ بیان کیا۔ کریم ایک لمبا چھرا ہاتھ میں لے کر وارث کے دروازے پر جا بیٹھا، اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ اسے دیوہ سے نکل جانے کا حکم دیں گے تو وہ ان کے سامنے اپنے سینے پر چھرا گھونپ لے گا۔

وارث شاہ نے کریم کی یہ حالت دیکھ کر خاموشی اختیار کیا اور کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے کریم مایوس ہوتا۔

ایک روز کسی نے کریم سے مذاق میں کہہ دیا کہ ”میں اپنی لڑکی کو پیاری کے مکان کی چپت پر گرا دیا

کرو۔ پھر چنگ لینے کے بہانے مکان میں ٹھس چلایا کرو۔ شاید اسی بہانے تمہیں پیاری کا دیدار نصیب ہو جایا کرے۔“ کریم نے یہی کیا۔ وہ چنگ اڑا کر مکان میں گرا دیتا۔ پھر خود دوڑ کے اندر چلا جاتا کہ ”ہماری چنگ گری ہے، ہماری چنگ گری ہے۔ واپس دو۔“ لیکن وہاں سے وہ پٹ پٹا کر نکلتا، اسے دن میں کئی کئی مرتبہ اس طرح زد و کوب کیا جاتا۔

ایک دن وارث شاہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے کریم کو بلا کر کہا۔ ”تم اپنی چنگ ہمارے کوٹھے پر گرایا کرو۔“ کریم نے چنگ اڑائی ہی چھوڑ دی، مگر پیاری کا پیار روز بہ روز بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسے دنیا و بائیں کی خبر نہ رہی، تنہا برس اسی کیفیت میں گزر گئے، کبھی کبھی وارث شاہ اسے بلا کر اس کا حال دیکھ لیتے، اور سکرا دیتے!

ایک دن انہوں نے کہا۔ ”کریم تم ہماری صورت دیکھا کرو۔“

کریم نے کہا۔ ”حضور! دنیا میں پیاری سے زیادہ حسین کوئی ہے ہی نہیں، دیکھوں کسے؟ آپ اس سے زیادہ خوب صورت ہوتے تو آپ کو دیکھتا!“

وارث شاہ ہنس پڑے۔ انہوں نے کریم کو گلے لگا کر کہا۔ ”عاشق کے سوا کسی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی!“

ایک بار وارث شاہ فتح پور میں مستقیم شاہ کے مکان میں بیٹھے تھے۔ کریم بھی ان کے ساتھ تھا۔ فتح پور کے ایک بزرگ شاہ نذر علی وارث شاہ سے ملنے کے لئے آئے۔ وہ بہت دیر تک ٹھٹھکی باندھ کے کریم کی صورت دیکھتے رہے۔ وارث شاہ نے کریم سے کہا۔ ”کریم! آج دیوہ میں عجیب واقعہ ہوا! ماں بیٹی میں خوب ٹکرا رہی تھیں وہ لڑکی تمام گھر کو پریشان کئے ہوئے ہے۔“

کریم بے قرار ہو گیا۔ وارث شاہ دیوہ لوٹے، تو معلوم ہوا کہ پیاری کے سوا تمام گھر والے بیمار ہیں۔ ان کی واپسی کا علم ہوا، تو تمام گھر والوں نے ان سے مل کر انہیں پتا سنائی کہ بہت بری حالت ہے۔ وارث شاہ نے کریم کو بلا کر کہا۔ ”کریم! تم ان کے گھر جا کر صدا

مت لگایا کرو۔ ہاں بزرگوں کے درباروں پر جاؤ۔ تو
خوب صدا لگاؤ۔ دیوہ میں مت لگایا کرو۔ ان لوگوں کو
تکلیف ہوتی ہے۔“

کریم خاموشی سے چلا آیا۔ اس نے ایک مدت
تک صدا نہیں لگائی۔ اب وہ چپ چاپ اور بجھا بجھا سا
رہنے لگا تھا۔ ایک روز وارث شاہ نے کہا۔ ”کریم! میری
دعا ہے کہ خدا اور رسول تم کو ملیں، وہ لڑکی ملے یا نہ ملے۔“

☆.....☆.....☆

ایک روز مغرب کے بعد کریم کو خبر ہوئی کہ
پیاری اور اس کی والدہ وارث شاہ کی طرف گئی ہیں، کریم
بھی وہیں پہنچ گیا اور زنانے حصے کے قریب پہنچ کر صدا
لگاتے لگا۔ ”مزا ہے پیاری کا، مزا ہے پیاری کا!“
وارث شاہ نے جیسے ہی یہ صدا سنی! پیاری اور اس کی ماں
کو فوراً رخصت کر دیا۔

کریم دروازے پر مستانہ وار جھوم جھوم کر یہی
صدا لگا رہا تھا۔ پیاری کی والدہ یہ دیکھ کر رک گئیں۔
انہوں نے وارث شاہ کے ایک خادم سے کہا۔ ”کریم
دروازے پر کھڑا ہے، اسے دروازے سے ہٹا دو۔“
خادم نے کریم سے کہا۔ ”یہ زمانہ دروازہ ہے۔

یہاں کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ جا کر مردانہ دروازے پر
صدا لگاؤ۔ ادھر سے عورتیں حضرت کی قدم بوسی کے لئے
آتی ہیں۔“

کریم نے جواب دیا۔ ”میں زمانہ مردانہ کچھ
نہیں جانتا۔ جہاں جی چاہتا ہے صدا لگاتا ہوں۔ تم کون
ہو مجھے روکنے والے؟“

خادم نے کریم کو بہت برا بھلا کہا۔ اور یہ دھمکی
بھی دی کہ ”میں ابھی حضرت کو اطلاع کر کے تمہیں دیوہ
سے نکلواتا ہوں۔“

لیکن کریم نہ مانا، پھر پیاری خود باہر نکل آئی اور
ساتھ اس کی ماں بھی، دونوں اپنے گھر کی طرف روانہ
ہو گئیں۔

کریم کی شکایت حضرت وارث شاہ سے کر دی
گئی، انہوں نے کریم کو طلب کیا اور لطف و کرم کی نظر اس

پر ڈال کر بولے۔ ”نور محمد شاہ! جاؤ پیاری کی ماں سے
کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے ہاں نہ آیا کریں،
کریم عاشق ہیں، کسی روز انہوں نے پکڑ لیا تو قیامت
تک اس کا چھوڑنا مشکل ہے۔“

کریم پر وجد طاری ہو گیا۔ اس نے اپنا سر زمین
پر دے مارا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ پھر وارث شاہ کی
توجہ سے اس کی حالت درست ہوئی۔

ایک دن بستی کے ایک صاحب کریم کے پاس
آئے اور بولے۔ ”اگر تم ہمیں پانچ سو روپے دو، تو ہم
تمہیں پیاری سے ملوا دیں گے۔“

کریم بے چارے کے پاس پانچ سو روپے
کہاں سے آئے؟ یہ اس زمانے میں ایک فطیر رقم تھی۔
کریم خاموش ہو گیا۔ ان صاحب نے کہا۔ ”ان دنوں
تیورہ رئیس عبدالحمید صاحب حضرت کی زیارت کے لئے
آئے ہوئے ہیں ان کی جیب میں سونے کی ایک بیش
قیمت گھڑی ہے۔ اگر تم کسی تدبیر سے وہ گھڑی ہمیں
لا دو تو ہم تم سے پیاری کی ملاقات کروا دیں گے۔“

کوئی گیارہ بجے دن کا وقت تھا۔ کریم اس مکان
میں پہنچا۔ جس میں تیورہ کے رئیس عبدالحمید کا قیام تھا۔
وہ سیدھا کونٹھے پر جا کر ان کے کمرے میں گھس گیا۔ اس
نے ان کی موجودگی میں اچکن سے گھڑی نکال لی، اور
کونٹھے ہی سے کود پڑا، وہ چلائے کہ ”کریم گھڑی کہاں
لے جاتے ہو۔“ مگر دیوانہ کس کی سنتا ہے۔ عبدالحمید کا

چلا مان کر لوگوں نے کریم کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت
وارث شاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ پورا واقعہ سن کر وارث
شاہ بولے۔ ”کریم کو نکال دو، آئندہ یہ یہاں نہ آنے
پائے۔ نور علی سے بھی کہہ دو کہ انہیں اپنے مکان میں نہ
رہنے دیں، یہ ہم کو بدنام کرتے ہیں، لوگ کہیں گے کہ
چوری ہم کرواتے ہوں گے، ہماری بھی شرکت ہوگی۔“

کریم کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ صبح اس کو پتہ
چلا وارث شاہ قصبہ سہالی چلے گئے ہیں۔ کریم وہاں جا
پہنچا۔ دروازے پر جا کر اس نے صدا لگائی۔ ”مزا ہے
پیاری کا!“ وارث شاہ نے اس کی آواز سنتے ہی اسے

اندر بلا لیا۔ اور کہا کہ ”دیکھو کریم! اب تم دیوہ نہیں جاسکتے! ہماری بدنامی ہوتی ہے۔“

کریم نے دل میں کہا۔ حضرت کچھ بھی ہو جائے، جاؤں گا ضرور، وہ اسی وقت دیوہ کی جانب چل دیا، دیوہ میں وہ ادھر ادھر پھرتا رہتا، رات ہوتی تو بیماری کے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پڑا رہتا۔

ایک دن وہ سردھنسا ہوا باغ میں گھوم رہا تھا۔ اتفاق سے مشہور انگریز بیرسٹر کالون وہاں سیر کے لئے آیا، اس کی نظر کریم پر پڑی اس کا دل اس دیوانے کی طرف کھنچا، وہ اس کے قریب جا کر اس سے باتیں کرنے لگا، کریم نے اس کے سامنے اپنا حال بیان کر دیا، کالون نے دانتوں میں انگلی دبا کر اور بہت ہمدردی ظاہر کی۔ یہاں تک کہ وہ ٹم ٹم پر اسے بیٹھا کر اپنی کوٹھی لے آیا۔ اسے دو تین روز اپنا مہمان رکھا اور پھر کریم سے کہا۔ ”تم بارات لے کر بیماری کے دروازے پر پہنچ جانا اور وہاں باجا بجا دینا۔“

بارات میں دو تین لوگ ہی شامل ہوں بھلا پھر میں مقدمہ لڑوں گا اور یہ مقدمہ میں جیت کر تمہاری بیماری تمہیں دلاؤں گا۔“ اس کے علاوہ پانچ سو روپے نقد اسے دیئے۔

کریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پانچ سو روپے لے کر وہ دیوہ آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وارث شاہ آج کل رودلی میں قاضی مظہر الحق کے ہاں مقیم ہیں۔ اور بیماری کے گھر والوں نے منت مان رکھی ہے کہ اگر کریم کو دیوہ سے نکال دیا جائے تو وہ وارث شاہ ان کی دعوت کریں گے۔

کریم کی جان پر بن گئی، اسے خیال آیا کہ باجے بجانے سے پہلے ادولی جاؤں، اور حضرت کی قدم بوسی کر کے انہیں دعوت دوں، ممکن ہے، قسمت یاوری کرے، اور حضرت میری دعوت قبول کر لیں، وہ جب ادولی پہنچا تو آپ نے ملنے سے انکار کر دیا، پر دوسری دفعہ جب درخواست پہنچائی گئی تو آپ نے کہا۔ ”اچھا کریم کو بلاؤ۔“

خدام کریم کو ان کے سامنے لے گئے۔ وارث شاہ نے اس سے تمام حال پوچھا۔ اور کہا کہ ”کریم! اگر

کوئی تم سے یہ کہتا کہ وارث علی کی گردن مار دو۔ ہم تمہیں پیاری سے ملوادیں گے۔ تو تم کیا کرتے؟“

کریم نے بے ساختہ کہا۔ ”حضور! میرا بس چلتا تو اس کام میں بھی ذرا تامل نہ کرتا!“

وارث شاہ ہنس دیئے۔ انہوں نے اٹھ کر کریم کو گلے لگا لیا۔ ”جاؤ، ہم دیوہ میں تمہاری دعوت ضرور کھائیں گے۔“

کریم نے ان کے قدم چوم لئے، اور چلا آیا، قمری مہینے کی بانیں تاریخ تھیں، وارث شاہ دیوہ لوٹے، بیماری کے گھر والوں کی طرف سے دعوت کا اہتمام ہوا، اور احترام کا جلوس اٹھا۔ کریم بھی اسی وقت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے صدا لگائی۔ ”مزا ہے بیماری کا!“ شیرینی وارث شاہ کو پیش ہوئی، کریم یہ سوچ کر جھومنے لگا کہ اس شیرینی میں بیماری کے ہاتھ ضرور لگے ہوں گے، کاش مجھے بھی ملے مگر عجیب بات ہوئی، خادم نے شیرینی سب کو دی، مگر کریم کو نہ دی۔

ایک ایک وارث شاہ نے کریم کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ”کریم! تم کو حصہ نہیں ملا؟“

کریم زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ وارث شاہ نے اسے اپنے ہاتھ سے مٹھائی دی۔ تھوڑی دیر بعد بیماری کے گھر سے کھانا آیا۔ اس میں سے بھی کریم کو اس کا حصہ دیا گیا۔

چند روز بعد کریم نے دعوت کا اہتمام کیا اور بیماری کے مکان کا طواف کرنے لگا، وہ جو کھانا لے کر آیا۔ اس میں سے کچھ بیماری کے گھر بھجوا دیا۔ کچھ مدت بعد لوگوں نے وارث شاہ سے پھر کریم کی شکایتیں کیں۔ وارث شاہ نے اسے دیوہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ چالیس دن تک بستی سے باہر سر پھوڑتا رہا۔ شب ہاشی قبرستان میں کرتا تھا۔

ایک روز مجبور ہو کر وہ دیوہ آ گیا۔ اس نے حلوائی کی دکان سے حلوہ لیا، اور وارث شاہ کے دروازے پر پہنچ کے خدام سے اطلاع کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کریم بے اختیار جو کھٹ

سے سر پھوڑنے لگا۔ آخر ایک نو وارد کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے اندر جا کے اطلاع دی کہ کوئی عاشق آیا ہے۔ وارث شاہ نے کہا۔ ”عاشق کو کون روک سکتا ہے؟ آئے دو۔“

کریم کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔ اس نے حلوہ پیش کیا۔ وارث شاہ بولے۔ ”یہ سارا حلوہ پیاری کے مکان پر پہنچ دو۔“

اتفاق سے ان دنوں پیاری کے رشتے کے ایک چچا وہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کریم کو بلوایا۔ کریم خوش خوش ان کے پاس پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں چولہا گرم ہو رہا تھا، انہوں نے کریم کو سمجھایا کہ پیاری کا نام لیتا چھوڑ دو، اور دیوہ سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ۔ کریم نے جوش میں آ کر نعرہ لگایا۔ ”مرہ ہے پیاری کا!“ نعرہ سن کر وہ بہت تھلائے۔ انہوں نے کریم کو پکڑ لیا اور گھر کی عورتوں سے کہا کہ دست پناہ گرم کر کے لاؤ، تھوڑی دیر بعد وہ دست پناہ سرخ کر کے لایا گیا، انہوں نے کریم کو اس سے داغنا شروع کر دیا۔ ایک شخص نے کریم کو مکان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندر سے اس نے چیخیں سنیں تو دوڑ کر وارث شاہ کو اطلاع کی کہ ”حضرت! لیجئے، فیصلہ ہو گیا۔ آج کریم ان کے گھر میں بند ہے، مارڈالا ہو گا، اے!“

وارث شاہ نے ایک جذب سے کہا۔ ”عاشق کو مارڈالنا دل لگی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دروازے پر گئے۔ انہوں نے خدام کو حکم دیا کہ ”ابھی وہاں جاؤ اور کریم کو ساتھ لے کر آؤ۔“

اس وقت کریم پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ داغنے اور پٹنے سے کرتا پھٹ گیا تھا۔ کرتا پٹنے کا اسے سخت رنج تھا۔ داغنے اور پٹنے سے کرتا پھٹ گیا تھا۔ وہ وارث شاہ کے سامنے پہنچا۔ تو انہوں نے کہا۔ ”بھلا اس کو مارنے سے کیا فائدہ؟ ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا!“

بات آئی گئی ہو گئی۔ کریم اسی حالت میں مستانہ وار نعرہ لگاتا ہوا زندگی کے دن کاٹنے لگا، برسات کے موسم میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وارث شاہ فتح

پور سہورہ میں تھے۔ کریم کوہ میں طلب کر کے انہوں نے حکم دیا کہ ”تم بہرائچ جاؤ، اور کل آ کے ہم سے پتھے پور میں ملنا۔“ کریم اسی وقت پایادہ لہرائچ پہنچا، اور سید سالار کے مزار پر جا کے بیٹھ گیا۔ اس پر غفلت طاری ہونے لگی۔ اسی حالت میں اس نے دیکھا کہ وہ بڑا گاڈاں اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ وارث شاہ آئے اور بولے۔

”کریم! اگر تم ہماری دعوت کرو، تو تمہیں پیاری مل جائے گی، دن پیر اور تاریخ گیارہ ہوگی۔ اب ہم دیوہ جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

خواب ہی میں وہ دیوہ پہنچا۔ وہاں شاہ منعم کی درگاہ میں گیا، مزار کا تعویذ غائب تھا۔ اور شاہ منعم اپنے مزار کے باہر بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے۔ جیسے ہی کریم پر ان کی نظر پڑی انہوں نے قرآن بند کر کے کریم کی طرف توجہ کی۔ کریم نے ان کا ہاتھ تھام کے اشتیاق سے پوچھا۔ ”حضور! یہ فرمائیے کہ مجھے پیاری کب ملے گی؟“

شاہ منعم نے کہا۔ ”جب ہمارے مزار پر چادر تپے جاؤ گے۔“ یہ کہہ کے انہوں نے کریم کو رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔ اور قرآن کھول کے دوبارہ تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ کریم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خود کو سید سالار کے مزار پر پایا۔

وہ اٹھ کر باہر آیا۔ ایک اجنبی شخص آگے بڑھا اس نے کریم کے ہاتھ میں ایک تسلی دی اور یہ کہہ کے چلا گیا کہ ”اس میں تین سو روپے ہیں۔“

بعد میں کریم نے اس اجنبی کو بہت تلاش کیا۔ مگر اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ وہاں سے کریم پیدل روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز پتھے پور پہنچا، چاند رات تھی۔ اس نے حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ پڑ رہی تھی۔ وہ وارث شاہ کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ”حضرت! گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت ہے۔“

وارث شاہ بولے۔ ”جمعہ کو کر دینا!“ کریم نے کہا۔ ”حضور نے خود پیر کا دن مقرر

فرمایا تھا۔

”اچھا، پیر ہی تھی!“

ان سے دن تاریخ طے کر کے وہ دیوہ پہنچا اور شاہ منعم کے سجادہ نشین سے اپنے خواب کا ذکر کرنے لگا، اس نے شاہ منعم کی شبیہ کی تفصیل سنائی تو سجادہ نشین نے اٹھ کر اسے سینے سے چمٹالیا، اور رونے لگے۔

”کریم! بے شک شاہ صاحب بالکل ایسے ہی تھے۔“

گیارہ تاریخ آئی۔ وارث شاہ بھی دیوہ آ گئے۔ کریم نے ان کے پاس پہنچ کر انہیں سلام کیا۔ وارث شاہ بولے۔

”کریم! بے شک شاہ صاحب بالکل ایسے ہی تھے۔“

وارث شاہ بولے۔ ”کریم! شاہ منعم کے مزار پر یاد رکھ چڑھاؤ گے؟“

کریم نے جواب دیا۔ ”حضرت! ابھی جا کر چڑھاتا ہوں۔“ وہ اسی وقت چادر لے کر شاہ منعم کے مزار پر گیا۔ اس نے چادر چڑھائی اور مزار سے باہر آیا۔ ایک اس کا دل پھٹنے لگا کہ آج گھر میں کس کر بیماری کو پکڑ لائے گا جو ہوگا دیکھا جائے گا، اسی مستانہ حالت میں وہ کریم شیرازی کا مطلع سنسکتا ہوا دریا کی طرف چلا یا۔

راستے میں وارث شاہ کی قیام گاہ تھی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے سوچا کہ پہلے حضرت کی قدم بوسی کر لوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے جھجک اندر چلا گیا۔ وہاں اسے وارث شاہ دکھائی نہیں دیئے البتہ ایک اور ہوش رہا جلوہ نظر آیا۔ کریم کے قدم سوسوکنے کے ہو گئے۔ روح صحنہ کر دل میں آ گئی۔ وہ آسنے کے مانند حیرت زدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی نقشہ ہے، وہی رنگ ہے، وہی روئے زیبا ہے جس پر ہزار جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے وہی بیماری ہے۔ گلے میں چندن ہار اور سر پر گلابی دوپٹہ اوڑھے ہوئے بعد ناز واداسکرار ہی تھی۔

کریم بے اختیار سر ہنجو د ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جلوہ جہاں آرا پھر دیکھنے کے لئے اس نے سر اٹھایا مگر نہ وہ بیماری تھی نہ وہ موہنی صورت بلکہ وارث شاہ بیٹھے ہوئے

تھے۔ بیماری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کریم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ آگے بڑھ کر مرشد کے قدموں پہ چہرہ رگڑنے لگا۔ ”حضور! یہ کیا تماشا تھا؟“

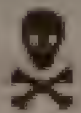
مرشد نے کہا۔ ”کریم! یہی صورت ہے، اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہے۔ جہاں کہیں دیکھو گے یہی صورت دیکھو گے۔“

ان الفاظ سے کریم کے دل کی دنیا پلٹ گئی۔ گزشتہ خیالات اور تصورات اس طرح فنا ہو گئے۔ جیسے کبھی تھے ہی نہیں اس کے قلب پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جو کچھ ہیں۔ یہی ہیں اور یہ ہی صورت ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کریم نے دل کی مراد پائی، اور وارث شاہ کی شکل میں وہی صورت دیکھی، جس نے دونوں عالم سے بے گانہ اور اپنا دیوانہ کر رکھا تھا۔ ماسوا کا ہر نقش اس کے دل سے مٹ گیا۔ اب وہی عالم افروز حسن اس کے پیش نظر تھا۔

کریم کو لوگ کریم پیاری کہنے لگے تھے۔ کریم نے یہ آخری منظر دیکھنے کے بعد پھر بھی پیاری کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ مرتے وقت تک نہ کبھی اس کا ذکر کیا نہ اس کی فکر کی، ہاں زبان پر یہ صدا ہمیشہ رہی ”مزا ہے پیاری کا!“

وارث شاہ کے انتقال کے بعد کریم پیاری برسوں زندہ رہے، وہ سال میں دو مرتبہ ان کے مزار پر نہایت اہتمام سے چادر چڑھاتے۔

اس موقع پر کریم کی حالت دل سوز منظر پیش کرتی تھی۔ سر پر چادر کی سنی رکھی ہوتی، قوالی ہوتی جاتی۔ آنکھیں حیرت زدہ کھلی ہوئی ہوتیں۔ تمام جسم غیر متحرک رہتا، دود و آدی سنبھالتے تھے، بالکل سناٹے اور ہیبت کا عالم ہوتا تھا۔ اسی کیفیت میں وہ مرشد کے مزار پر پہنچتے اور چادر وغیرہ چڑھا کر اسی حالت میں واپس مڑتے، مردے کی سی شکل ہو جاتی تھی، لوگ انہیں ہوا دیتے اور عرق گلاب چھڑکتے، انہوں نے عشق کی پراسرار منزلیں طے کر لی تھیں!



آدم خور پودے

ساجدہ رلیج۔ ہندواں سرگودھا

حواس باختہ بوڑھا دندناتے ہوئے کمرے سے نکلا اور باہر کی جانب بھاگا، طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جو کہ بوڑھے کے لئے جان لیوا ہو سکتی تھیں مگر وہ بوڑھا اس سے بھی لاپرواہ کہ پھر اچانک.....

خوشی میں اکثر حواس کھو دینے والے..... ناقابلِ غمان نقصان سے دوچار ہوتے ہیں

بجلی کی کڑک بادلوں کی گرج اور چمک مل کر ماحول کو اتنا خوفناک اور پراسرار بنا رہے تھے کہ دل لرز لرز جاتا۔ بارش اور ہوا کا شور اتنا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔
بوڑھا میک بھی اپنے فارم ہاؤس میں رضائی میں دبکا پڑا تھا۔ آتش دان میں آگ بھی روشن تھی، کمرہ معمول سے زیادہ گرم تھا اس کے باوجود بوڑھے میک کو شدت سے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بوڑھا تھا اور بوڑھے لوگ ذرا سی بھی ٹھنڈ برداشت نہیں کر پاتے، وہ تو پھر خوف سے معمور ٹھنڈ تھی، جس نے میک جیسے بہادر کو بھی رضائی میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آتش دان میں آگ دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ بوڑھے میک نے ذرا سی رضائی اوپر کر کے آتش دان کو دھیمہ ہوتے دیکھا اور پھر رضائی تان لی۔ اس میں اٹھ کر آتش دان میں دوبارہ لکڑی ڈالنے کی ہمت نہیں تھی لیکن کب تک.....؟
ٹھنڈ کی شدت نے اسے رضائی کے اندر کاپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجبوراً اسے بستر سے نکلنا پڑا، اس کے جسم میں پھریری دوڑ گئی وہ کانپتا ہوا آتش دان تک آیا اور کچھ لکڑیاں آگ میں ڈال دیں۔ دھیمی پڑتی آگ نے پھر سے شدت پکڑ لی۔ آگ کی حدت نے سردی کی شدت کو کچھ کم کیا۔ میک نے کچھ دیر آگ تاپی پھر اٹھ کر بستر کی طرف آ گیا۔

اتنی شدت سے طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں گویا ہر چیز کو نہیں نہیں کر دیں گی۔ ان کی شائیں شائیں کی آواز جیسے کسی اور ہی دنیا کی آوازیں لگ رہی تھیں، جب یہی آواز چھتوں سے ٹکراتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے چھت کو ہوا اپنے ساتھ ہی اڑا کر لے جا رہی ہو۔ شدید سردی کا موسم نہیں آیا تھا لیکن اس طوفان کی وجہ سے یا کچھ خوف کی بدولت جسم کی کپکپی رکسنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بادل اتنی زور سے گر جا تو یوں لگا کہ آسمان نوٹ کر گر پڑا ہو۔

بجلی کی چمک آنکھوں کی پینائی اچک لے جائے گی اور کڑک گویا سب کے دل بند کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خود کو طاقتور سمجھنے والے اس رات کے خوف کے زیر اثر آ گئے تھے۔

رضائی میں دبکے ہونے کے باوجود بھی کپکپی نے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اور ٹھنڈ گویا پٹیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈ اور خوف جب مل جائیں تو یہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اور پھر بادل شدت سے گر جا اور زوردار دھماکے سے بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی شدت اتنی تھی کہ اس نے چند ہی لمحوں میں ہر چیز کو جل تھل کر دیا تھا اور ساتھ ہی ہوا کے شور میں اصاف ہو گیا۔

بارش کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ رات آدمی ڈھل چکی تھی۔ میک بوڑھا آدمی تھا اس کے باوجود اسے نیند ٹوٹ کر آتی، روز صبح اسے یہی شکایت ہوتی کہ رات اتنی جلدی کیوں گزر جاتی ہے کیونکہ وہ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا تھا اور جب بوڑھا آدمی تھک ہار کر بستر پر گرتا تو پھر صبح کی خبر لاتا، لیکن آج کی رات بات کچھ اور تھی۔

طوفان نے رات کو اتنا خوفناک بنا دیا تھا کہ وہ دعا کر رہا تھا کہ رات جلد گزر جائے لیکن اسے لگ رہا تھا جس طرح بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح رات کی طوالت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ایسا بالکل نہیں تھا وقت کا کام ہے گزرنا سو وہ گزر رہا تھا لیکن رات اسے اپنی خوفناکی کی وجہ سے ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی کیونکہ جب ایک ایک سیکنڈ گن کر گزرے تو یونہی لمحات بہت طویل دکھائی دیتے ہیں۔

اور میک کو اپنی نئی فصل کی بھی بہت فکر تھی جو ابھی ابھی زمین سے سر نکال رہی تھی۔ ”اتنی طوفانی بارش میں تو فصل تباہ ہو جائے گی۔“ میک نے سوچا۔

”خداوند رحم کر۔“ اس نے دعا کی اور اپنی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہوا جو کچھ دیر تھی تھی پھر شدت سے چلنے لگی۔ بجلی کی کڑک اتنی دل دہلا دینے والی تھی کہ میک کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ ہوا اس کے فارم ہاؤس سے یوں ٹکراتی تھی کہ میک نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اسے لگا چھت اب گری کہ تب۔۔۔! دور کہیں زور دار دھماکے سے بجلی گری اور ادھر بوڑھے میک کا دل سہا۔۔۔!

”یقیناً کل کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔“ میک خود کلاہی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”اٹھ کر کھڑکی کھولتا ہوں پتہ نہیں فصل کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اٹھ کر کھڑکی سے دیکھ لوں گا کہ کچھ دل کو تسلی ہو۔“ فصل کھڑکی کھولنے پر واضح نظر آتی تھی۔ میک دل پر پتھر رکھ کر بستر سے اتر آیا حالانکہ اترنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

کھڑکی کے قریب آیا اور ڈرتے ڈرتے کھڑکی

کھولی۔ بجلی اتنی زور سے چمکی کہ میک کو لگا کہ وہ شاید اندھا ہو چکا ہے اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ فصل دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میک کی بیٹائی ٹھیک ہوئی تو اس نے شکر ادا کیا اور جلدی سے بستر میں دبک گیا۔

”خداوند رحم۔۔۔“ اس نے لرزتے دل سے کہا اور رضائی میں مزید سمٹ گیا۔

دو تین گھنٹے یہی صورتحال رہی پھر آہستہ آہستہ صورتحال نارمل ہوتی گئی۔ بارش رک گئی۔ ہوائیں گویا تھک کر اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئیں۔ بجلی نے تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹنا شروع کر دیا بادل بلبلا کر تھک گئے تو یوں چپ سادھ لی گویا اب ہمیشہ کے لئے بات چیت بند۔ بادل سمٹنا شروع ہو گئے تھے اور تاروں نے زمین کو اپنی پیاری شکل دکھانی شروع کر دی۔ سب مخلوق نے اس عذاب کے ٹل جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

میک کے لرزتے دل کو بھی خاصی حد تک قرار آیا تو نیند جو کب سے روٹھی ہوئی لگ رہی تھی، اس نے آن واحد میں اسے اپنی پیٹ میں لے لیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔!!!

دن چڑھے تک سوتا رہا پھر اٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنی فصل دیکھنے چلا آیا اور پھر اک خوشی اس کی منتظر تھی کہ اس کی فصل تباہ ہونے سے بچ گئی تھی کچھ پودے گر بڑے تھے لیکن میک کو امید تھی کہ دو تین دن تک میں یہ جز نکڑ لیں گے، اور ایک نئے پودے کو اس نے اپنی فصل میں دیکھا، بہت خوب صورت لیکن عجیب ساخت کا۔۔۔ حالانکہ پہلے اس نے اپنی فصل میں اس پودے کو نہیں دیکھا تھا۔ ”ہو سکتا ہے دیکھا ہو لیکن غور نہ کیا ہو۔“ میک بڑبڑایا۔ لیکن اس کی بڑبڑاہٹ اسی تک محدود رہی۔۔۔!!!

پھر وہ اس پودے کے قریب گیا ابھی وہ کچھ دور ہی تھا کہ پودا ہلنے لگا جیسے ہوا سے ہلا ہو۔ میک نے کوئی توجہ نہ دی وہ پودے کے قریب بیٹھ گیا اور اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔

کیا کرے؟

”میرے خیال میں تو ان پودوں کو تلف کر دینا

چاہئے.....؟“

وہ پودے کھیت میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا.....

اور پریشان ہوتا رہا وہ جس پودے کے پاس سے گزرتا اسے پودا اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوتا..... وہ کچھ خوف زدہ ہوا اور پھر فس پڑا۔ ”میں بھی کتنا شہیا گیا ہوں.....؟ اب تو لگتا ہے میں واقعی بوڑھا ہو رہا ہوں۔“

دوسرے دن ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ اپنے کھیت کی طرف آیا، پودے ہوا سے جھوم رہے تھے اور صرف وہی جو کافی بڑے اور خوب صورت ہو چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی کافی عجیب ساخت کے تھے۔ کئی بار میک نے انہیں جڑ سے اکھاڑنے کا سوچا لیکن پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا ارادہ ٹال دیا۔

اس کا دل اتنے خوب صورت پودوں کو تلف کرنے کو نہیں چاہتا تھا یا پھر نہ جانے کیوں وہ رک جاتا۔ وہ پودے دن بدن بڑھنے کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت ہوتے جا رہے تھے اور میک جب بھی انہیں دیکھتا اس کا دل خوش ہو جاتا۔ اس کا دل ان پودوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنی فصل کی تباہی پر بھی کوئی دکھ نہ ہوا۔ فصل کے پودے اسی جگہ پہ تھے نہ سوکھ رہے تھے نہ بڑھ رہے تھے لیکن اب میک کو ان کی پرواہ نہ رہی وہ ان پودوں کو دیکھ کر ہی خوش ہوتا رہتا اس نے کبھی بھی کہیں بھی اس ساخت کے پودے نہ دیکھے تھے سبز تھے اور ٹھیلے رنگ کے پتوں نے اس پودے کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا اور پھر اس کے کمان نما پتے اتنے دلکش کہ میک انہیں چھونے سے گریز کرتا کہ کہیں وہ خراب نہ ہو جائیں۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ میک انہیں آج تک چھو نہ پایا تھا وہ نہ جانے کیوں ان پودوں کے بارے میں جنونی سا ہوتا جا رہا تھا۔ صبح کے وقت جب وہ ان پودوں کے پاس آیا تو حیران کن طور پر بہت سے کینڑے مکوڑے اور چٹھے مرے پڑے تھے۔

میک نے پہلے کبھی اتنا غور نہیں کیا تھا ہو سکتا ہے پہلے سے یہ سلسلہ جاری ہو۔ بہر حال میک کی طبیعت کو وہ

لیکن جب اس نے پودے کھیت میں نگاہ دوڑائی تو جا بجا کچھ پودے نظر آئے۔ ”یہ تو مقدار میں زیادہ ہیں انہیں تلف کرنے کا مطلب فصل تباہ کرنا ہے۔“ اور پھر وہ اٹھا اور پودے کھیت کے گرد چکر لگایا جب وہ کسی ایسے پودے کے قریب سے گزرتا تو پودا یوں لہرانے لگتا جیسے ہوا کے زور پر لہراتا ہے، میک نے کوئی توجہ نہ دی۔

وہ کافی دیر کھیت میں گھومتا رہا اور پھر واپس فارم ہاؤس لوٹ آیا دو پہر کو تھوڑا بہت کھاپی کے وہ نئے کھیت کو تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے دن وہ کھیتوں میں آیا تو حیران رہ گیا۔ وہ پودے جو فصل کے علاوہ اگے تھے ان کی لمبائی میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا تھا ان کے پتے کمان کی مانند ہوتے جا رہے تھے، عجیب نیلی رنگت کے، میک حیران سا ان کے قریب پہنچا۔ پودے پھر لہرانے لگے۔ میک نے آس پاس نگاہ دوڑائی ہوا سا کن تھی اور باقی سب پودے بھی لیکن جس پودے کے پاس وہ موجود تھا صرف وہی مل رہا تھا اس نے پھر بھی خاص توجہ نہ دی۔

کچھ دن گزرے لیکن اس کی فصل کی وہی حالت تھی جو بارش والی رات کے بعد ہوئی تھی۔ جو پودے گرے ہوئے تھے وہ بونئی گرے پڑے تھے اور جو سیدھے کھڑے تھے ان کی لمبائی عام تھی ہاں۔ وہ نئی ساخت کے پودے خوب بڑھ رہے تھے، دن بدن ان کی لمبائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میک حیران اور اپنی عقل کی حالت پر بہت پریشان تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے قریب پہنچنے پر پودے اس کی طرف کیوں لپکتے تھے۔ نہ جانے کیوں اس نے ابھی تک ان پودوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا وہ پودوں کی اتنی بڑھوتری پر حیران تھا۔

وہ پودے اور روشت لے ہو چکے تھے لیکن اس کی فصل ابھی تک وہیں کی وہیں تھی۔ حالانکہ وہ پودے تعداد میں چھ یا سات ہی تھے لیکن وہ اس کی فصل کو تباہ کئے دے رہے تھے۔ میک سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ وہ کرے تو

کافی ناگوار گزرا وہ صفائی پسند تھا لیکن ان پودوں کے معاملے کو تو بہت زیادہ ہو گیا۔ اسے ان کے قریب ذرا بھی گندگی گوارہ نہیں تھی، اب جو اتنی تعداد میں کیڑے مکوڑوں کا ڈھیر دیکھا تو بہت بد مزہ ہوا۔ ”میں ابھی یہاں کی صفائی کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کام میں جست گیا لیکن وہ پودوں سے اور۔۔۔ رہ کر صفائی کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ قریب ہونے لگتا پودے لہراتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگتے اور میک پیچھے ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

اگر وہ ان پودوں کی سفاکیت کے بارے میں جان پاتا تو کبھی ان کے قریب نہ جاتا۔

پھر ان بدن اس کی حالت جنونی ہوتی گئی وہ ان پودوں کے معاملے میں اتنا حساس تھا کہ ہر وقت وہ بیٹھا نہیں دیکھتا رہتا۔ ہوائیں لہراتے جھومتے جھامتے وہ پودے گویا اس کی تسکین کا سامان تھے، نہ جانے کیوں لیکن میک کو کبھی کبھار احساس ہوتا جیسے وہ پودے اس کے قریب آنے کے منتظر ہیں ان کے لہرانے کا انداز یوں ہوتا جیسے وہ کسی چیز کے لئے بے تاب ہوں لیکن وہ چیز ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور ہو۔

میک فارم ہاؤس میں جا کر بھی کھڑکی کھولے رکھتا اور ان پودوں کو دیکھتا رہتا اور جیسے ہی فارم ہاؤس سے کام ختم ہوتا وہ فوراً کھیتوں کی جانب دوڑتا۔

اس نے بھی ان پودوں کو پانی لگانے کی زحمت نہیں کی تھی اس کے باوجود وہ پودے کبھی سر جھائے نہیں بلکہ دن بدن ان کی لمبائی چوڑائی اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا رہا۔ کوئی بھی دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہتا اور قدرت کی دلکشی پر حیران ہوتا اگر میک ان پودوں پر قنڈا تھا تو یہ انہونی بات نہیں تھی۔ انہونی صرف یہ تھی کہ وہ ان پودوں کے لئے جنونی تھا۔ ذرا سی تیز ہوا چلتی تو وہ فکر مند ہو جاتا کہ کہیں وہ پودے ٹوٹ نہ جائیں، روز مرے ہوئے کیڑے مکوڑے کو اٹھا کر پھینکتا اور پودوں سے باتیں کرتا رہتا کوئی بھی اسے دیکھ کر پاگل سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہوتا!

اور پھر انہونی ہو گئی اس رات بادل بہت گہرے۔

آئے۔ شام کے وقت بھی گھپ اندھیرا آدھی رات کا سماں پیدا کر رہا تھا بارش برسے کو بے تاب تھی اور ہوا کے تیز جھونکے کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھے۔ میک بہت پریشان تھا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ پودوں کے لئے، بقول اس کے آندھی ان پودوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتی تھی اور وہ یہ بالکل برداشت نہ کرتا۔

بادل گر جا، بجلی چمکی اور تیز ہوائے آندھی کی شکل اختیار کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی، ہلکی ہلکی بوندا باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا۔ میک کھڑکی کھولے پودوں کو ہی دیکھ رہا تھا جو تیز ہوا سے ادھر ادھر جھوم رہے، گویا کسی چیز کو پکڑنے کو بے تاب۔

ادھر میک ان کے لئے بے تاب۔ جب تیز آندھی آئی اور میک کو لگا کہ پودے اب ٹوٹنے کے تھیں وہ بجلی کی آڑک، بادلوں کی گرج، تیز بارش اور آندھی کی پرواہ کئے بغیر اندھا دھند باہر دوڑا۔ ساتھ میں وہ زور زور سے بڑا تا جا رہا تھا۔

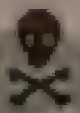
وہ کھیت کے قریب پہنچا تو ہوا کا زور بڑھا اور اس سے پہلے کہ پودا جڑ سے اکھڑتا وہ پودے سے لپٹ گیا، پودے نے اسے یوں سمیٹا گویا اسی کا منتظر ہو اس کی کمان نما پتے میک کے جسم میں پیوست ہو گئے۔

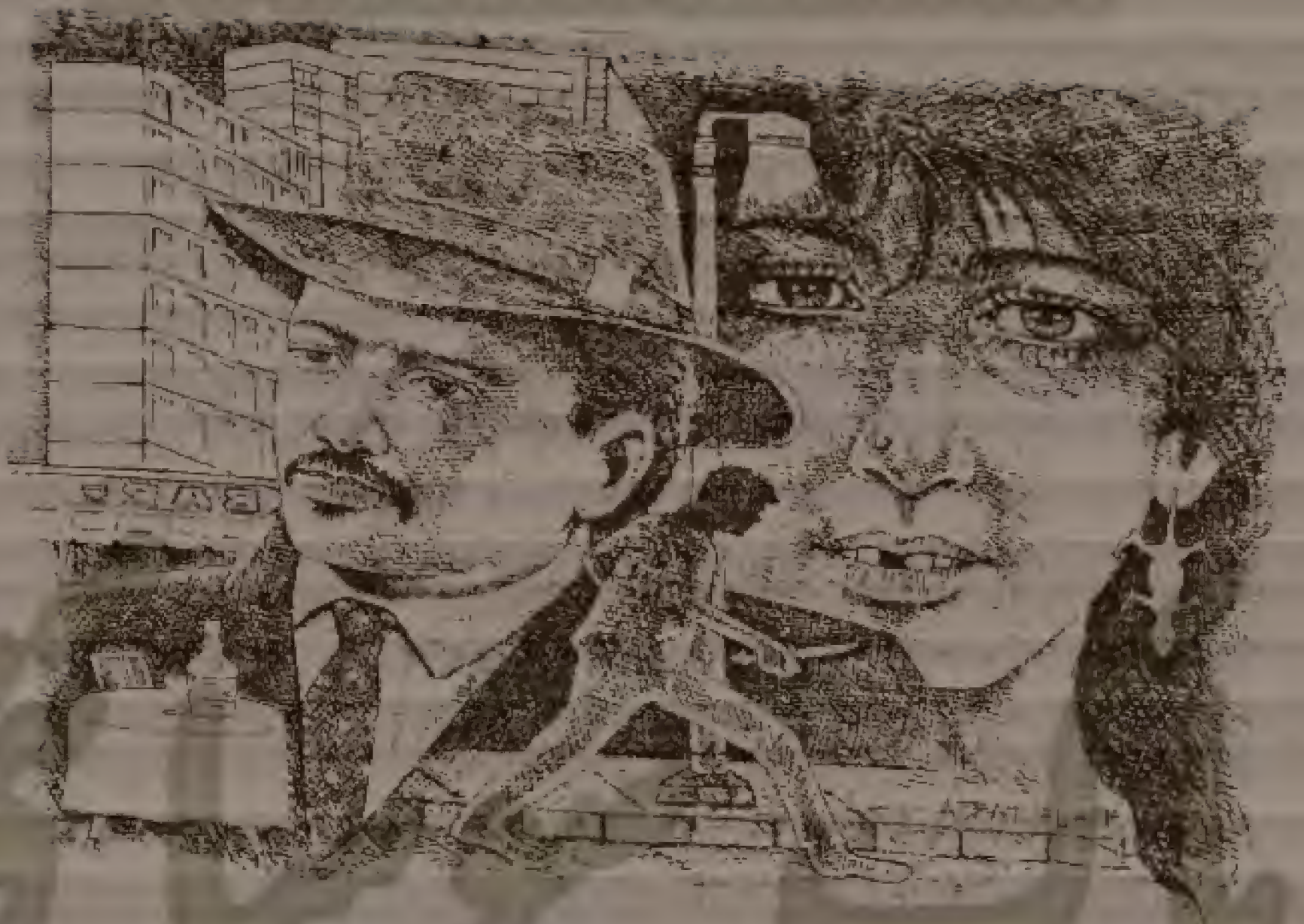
میک کی آنکھیں پھیل گئیں، اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن پودے کی شاخ نے اس کے منہ میں داخل ہو کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

”آدم خور پودے۔“

آخری خیال میک کے دل میں آیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور پھر ہوا کی شدت میں کمی آتی گئی، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کم پڑتی گئی۔

بارش کی شدت کم ہو گئی اور میک کی خوفناک اش پودے سے الگ ہوئی اور بارش کے پانی میں گر گئی اور پودے کے پتوں کا رنگ نیلے سے سرخ رنگ میں تبدیل ہو گیا۔





مہنگی پیاس

ایس حبیب خان - کراچی

خوبصورت حسینہ کی آنکھوں سے جنگاریاں نکلیں اور سامنے
موجود نوجوان بے سدھ ہو گیا تو حسینہ نے اس کا سینہ چاک
کیا اور اندر سے نوجوان کا دل نکال کر بڑی رغبت سے کھانے
لگی کہ اتنے میں ایک دلخیز منظر رونما ہوا

لفظ لفظ سے خوف پکٹتا اور جسم و جاں کے رہ گئے کھڑے کرتی حقیقی سبق آموز اور شاہکار کہانی

پر ڈالا اور ساس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ”رنگولی بنالی تھی
بہو؟“ اس کی ساس گائتری نے پوچھا۔
”جی ماں جی! وہ تو اُسی سے بنالی تھی۔“ نرملا
نے سر جھکا کر کہا۔

”اچھا ایسا کر میری تھالی پر دے۔“ اور پھر
گائتری چلتی ہوئی رسوئی گھر کے ساتھ تخت پر جا کر بیٹھ
گئی۔ نرملا نے رسوئی گھر میں جا کر جلدی سے تھالی نکالی

”نرملا! اری اور نرملا!“ گائتری دیوئی نے
آواز دی تو نرملا چونک کر خیالوں سے باہر آ گئی وہ وہ
چیزی ہاتھ میں لئے رادھا کو یاد کر رہی تھی، اس کی
آنکھوں میں پچھلا منظر گھومتے لگا۔

نرملا نے آئینہ کے آگے کھڑے ہو کر ماتھے پر
بندیا لگائی، مانگ میں سندور بھرا اور پھر اپنے کی ایک
طرف کمر میں چھری بٹائی اور اس کو پیشی ہوئی پلو شائے

Dar Digest 139 May 2015

اور اس میں کٹوریاں رکھیں، دال، بھاتی، چپاتی اور ابلے چاول پر دس دیئے، گائتری دیوی نے نوالہ منہ میں رکھا اور مسکراتے ہوئے نرملا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بھو، تیرے ہاتھ میں بھگوان نے بہت سوا د رکھا ہے۔ بھوجن بہت ہی سوادش ہے۔“ اور دوسرا نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

نرملا دھیرے سے مسکرائی اور اٹھ کر گائے کو چارہ ڈالنے چلی گئی۔

گائتری کے پتی مائیک چند کالکڑیوں کا کاروبار تھا مائیک چند اور گائتری کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا موہن اور چھوٹا بیٹا موہن، بڑا بیٹا موہن شادی شدہ تھا اس کی پتی نرملا تھی۔ نرملا بہت ہی سکھڑ تھی۔ اپنی ساس کو تو وہ ہلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ ساس، سر کی سیوا کرنا پتی اور دیور کی ضرورتوں کا خیال سب اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے ان کا پر یوار سکھی جیون بسر کر رہا تھا۔

رات کو بھوجن کر کے سب صحن میں جمع تھے ایک چنگ پر گائتری اور نرملا بیٹھے تھے اور دوسرے چنگ پر مائیک چند کے بیٹے تھے ایک دیر دہا رہا تھا، دوسرا کندھے دہا رہا تھا۔ ”سنئے ہو جی!“ گائتری نے پتی مائیک چند کو مخاطب کیا۔ ”ہوں!“ مائیک چند نے آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔

”میرے دچار میں اب خیر سے موہن اس قابل ہو گیا ہے کہ میں اپنی دوسری بہو لے آؤں۔“ گائتری کی بات پر سب خوش ہو گئے۔

اگلے ہی روز گائتری دیوی نے کجری مائی رشتے کرانے والی کو بلوا کر موہن کے لئے اچھی لڑکی دکھانے کا کہا۔ چند روز ہی گزرے تھے کہ کجری مائی گائتری کے درشن کرنے آ پہنچی۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ”گائتری! سب سے پہلے میرا منہ منھا کرا تیرے لئے خوشخبری لے کر آئی ہوں۔“ اس نے کہا تو گائتری نے نرملا کو جل پان کا بندوبست کرنے کا کہا۔

”برابر والے گاؤں میں، میرے ایک جاننے والے کشور داس رہتے ہیں، بہت ہی بھلے منٹش ہیں ان کی پتی کا دیہانت ابھی تھوڑے سے پہلے ہی ہوا ہے،

خود وہ بھی بیمار رہتے ہیں۔ وہ اپنی اکلوتی پتری رادھا کو اپنے جیون میں ہی اپنے گھر کا کرنا چاہتے ہیں۔ رشتہ بہت اچھا ہے لڑکی اکلوتی اور سندر ہونے کے ساتھ ساری جائیداد کی اکلوتی وارث بھی ہے۔“

”کجری مائی! لڑکی سندر اور سوشل ہونی چاہئے باقی کی ہمیں کوئی اچھا نہیں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس، ہم چل کر لڑکی دیکھ آئیں گے۔“ گائتری بولی۔

پھر ان کی ملاقات ہوئی تو کشور داس اور مائیک چند دونوں کو ایک دوسرے کے پر یوار بھاگئے۔ کشور داس کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی جو شریف ہوں۔ اس طرح موہن اور رادھا کا رشتہ طے ہو گیا۔ بیاہ میں سے تھا اس لئے گائتری کی اچھا پر سکائی کی رسم کر لی گئی۔

خوشیوں نے تو جیسے گائتری دیوی کی چوکھٹ کو تھام لیا تھا۔ موہن اور نرملا کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے مگر ان کی کوئی سنتان نہ تھی مگر رادھا اور موہن کی سکائی کے اگلے ہی روز نرملا کو یہ خوشخبری ملی کہ پانچ برس بعد نرملا کے آنگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ پھر نرملا کے گھر ایک گول منول بانک نے جنم لیا۔

گائتری کے تو خوشی سے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پورے گاؤں میں منٹھائی بانٹی گئی۔ منٹھائی صرف پوتے کی خوشی کی نہیں تھی بلکہ اگلے ماہ موہن کا بیاہ تھا۔ موہن کے دوستوں نے اس کا پیچھا گھیر لیا کہ کہیں گھوٹنے کا پروگرام بنائے کیونکہ بقول ان سب کے شادی کے بعد موہن مشکل سے ہی ہاتھ لگے گا اور پھر موہن نے ان کے آگے ہار مان لی اور وہ سب دوست یار مل کر سیر کے لئے نکل گئے۔ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے وہ لوگ موہن کے دوست جو گیندر کی موسی کے گھر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ سب دوست گھومتے گھومتے تھک گئے تھے۔

گر میوں کا جاتا موسم تھا ان لوگوں نے مچھت پر سونے کا کہا اور وہاں لیٹ گئے۔ ”یارا تھکن تو اپنی جگہ مگر مزہ بہت آ رہا ہے۔“ دوستوں میں سے شیشک بولا۔ ”بس کل کا دن ہے یہاں گھوم پھر کر واپس چلتے ہیں۔“ جو گیندر بولا۔

”مگر جو گیندر بھیا! یہاں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے کھو منے کی۔“ جو گیندر کی موسیٰ کا لڑکا ٹھنڈے شربت کے گلاس رکھتے ہوئے بولا۔

”راجو بیٹا وہ یہاں کسی محل کے کھنڈرات بھی ہیں ناں سنا تو بہت تھا مگر دیکھا نہیں اب تک، ہاں یاد آیا، مہاراجا لکشمن کے قلعے کے کھنڈرات“ جو گیندر بولا۔

”آپ لوگ وہاں نہ جائیں! سب کہتے ہیں ان کھنڈرات میں اثر ہے۔“ راجو نے خوفزدہ انداز سے کہا۔ اس کی بات سن کر وہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔ پھر ششکھر بولا۔ ”اب تو بیٹا ہم وہاں ضرور جائیں گے۔“ پھر وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے سو گئے۔

دو گھنٹے سونے کے بعد جب وہ اٹھے تو شام ہونے والی تھی۔ وہ لوگ نیچے آئے نہائے دھوئے تو موسیٰ نے گرم گرم گوہی کے پرائے، لسی اور کھیران لوگوں کے آگے رکھ دی۔ ان لوگوں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور باہر کا چکر لگانے کا کہہ کر گھر سے نکل گئے۔ باہر کھڑے راجو سے انہوں نے چلنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر موہن بولا۔ ”اچھا یار راجو تو ساتھ چل نہیں رہا، کم از کم راستہ تو بتا دے۔“

راجو نے انہیں راستہ سمجھایا اور ساتھ ایک بار پھر خبردار کیا مگر وہ بعض نہ آئے اور آگے چل پڑے۔ تھوڑی دور چل کر انہیں ایک نیل گاڑی دکھائی دی۔ انہوں نے اس سے ”مہاراجا لکشمن کے قلعے“ جانے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جو گیندر بولا۔ ”تاہی اہم یہاں مہمان ہیں ہماری سہائتا کرو، اچھا قلعہ تک نہیں تو تھوڑی دور تک چھوڑ دو، ہاں پیسوں کی چٹنا مت کرو۔“

اس کی بات سن کر وہ بولا۔ ”باؤ جی ہمارے ہاں مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے۔ مجھے آپ کو چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر جہاں جانے کا کہہ رہے ہو، وہاں نہ جاؤ! بڑے بوڑھے کہتے ہیں وہ جگہ جو ان پرش اور ناری دونوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔“

مگر وہ لوگ نہ مانے اور پھر مجبوراً نیل گاڑی والے نے انہیں قلعے سے دور اتار دیا اور گاڑی واپس

موزت سے اک بار پھر بولا۔ ”سوچ لو باؤ! میں واپس لئے چلتا ہوں۔“

مگر وہ لوگ نہ مانے اور پھر نیل گاڑی والا گردن ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ قلعہ دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ چلتے ہوئے قلعے کے نزدیک پہنچے تو اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ”یار غلطی ہو گئی ہمیں دن میں آنا چاہئے تھا، اندھیرے میں ہمیں کچھ دکھائی تھوڑی دے گا۔“ موہن کا اتنا کہنا تھا کہ پورے قلعہ میں دیے جل اٹھے، قلعہ بہت بلند تھا اس کی بلندی آسمان کو چھو رہی تھی، وقت نے اس کی خوبصورتی کو کم ضرور کر دیا تھا مگر ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے دور میں یہ کتنا عالیشان رہا ہوگا۔“ ارے یہاں تو قلعے کے رکھوالے بھی ہیں جب ہی تو دیے روشن ہوئے ہیں۔“ ششکھر بولا۔

”پھر تو کافی لوگ ہو گئے یہاں کیونکہ اتنے سارے دیے روشن ہوئے ہیں۔“ جو گیندر بولا۔ پھر وہ لوگ قلعہ میں داخل ہو کر گھومنے لگے، پھر تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ”یار کچھ بتا تو سہی اس جگہ کے بارے میں۔“ موہن بولا۔ تو جو گیندر نے بتانا شروع کیا۔

”یہ قلعہ مہاراجا لکشمن نے تعمیر کروایا تھا اس قلعہ میں وہ اپنی دھرم پتی کے ساتھ رہتا تھا۔ مہارانی کے بارے میں سنا ہے کہ بہت ہی سندر اور کم سن تھی۔ پھر ایک روز وہ محل میں موجود تھی مگر کسی کی جرأت نہ تھی کہ مہاراجا لکشمن سے کوئی اس بارے میں پرش کرتا۔ اس کے بعد مہاراجا لکشمن کی مرتیو ایک بودھ میں ہو گئی، مہاراجا کی کوئی سنتان نہیں تھی جو اس کاوش آگے بڑھتا اور یوں سے گزرنے کے ساتھ یہ قلعہ دیران ہوتا چلا گیا۔“ جو گیندر خاموش ہو گیا۔

وہ آگے بڑھے تو قلعے کی پچھلی طرف انہیں ایک بہت بڑا ویران کنواں نظر آیا۔ موہن نے کنویں کی منڈیر پر چڑھ کر رسی کو کھینچا تو پانی سے بھرا ڈول اوپر آ گیا۔ موہن نے چلو بھر کر پانی پیا اور بولا۔ ”واہ کیسا ٹھنڈا پانی ہے۔ میری تو پیاس بجھ گئی، کاش میں اس سے مہاراجا ہوتا تو اس حسین اسپر کا پتی ہوتا۔ وہ اور میں اس قلعہ

میں جیون بتاتے۔

”ارے او! پریم دیوانے تیرا بیاہ ہونے جا رہا ہے اور تو ہے کہ یہاں اس گزری ہوئی مہارانی کے ساتھ اپنی خیالی پریم کتھا بنا رہا ہے۔“ ششکھر نے جو گیندر کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے کہا اور سب ہنستے ہوئے موہن کی جانب مڑے تو ایک دم ان کی ہنسی رک گئی۔ موہن کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر گرے۔ دونوں بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ پھر ششکھر نے دوڑ کر اسے سنبھالا۔ موہن نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ جو گیندر نے بوتل نکال کر اسے پانی پلایا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ ”ارے بھیا! یہ تو پریم روگی ہو گیا ہے۔“ جی بھی تو برداشت نہیں کر پایا اس سندری کی جدائی۔“ ششکھر نے موہن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

موہن پر کچھ سی طاری ہو رہی تھی۔ ششکھر اور جو گیندر نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر وہ لوگ قلعہ سے باہر آ گئے۔ سورج نکلنے ہی والا تھا۔ ”یار یہاں تو کوئی تیل گاڑی نہیں ملے گی ہمت کر کے تھوڑا چل۔“ جو گیندر بولا اور پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھول گئے کہ سورج کی پہلی کرن نکلتے ہی دیوں سے دشمن پورا قلعہ اندھیرے میں گم ہو گیا اور نہ ہی ان لوگوں نے دھیان دیا کہ پورا قلعہ گھونسنے کے باوجود انہیں کوئی رکھوالا نظر نہ آیا۔ آگے چل کر انہیں ایک تیل گاڑی ملی گئی تو اس پر سوار ہو کر موسیٰ کے گھر گئے اور کچھ دیر رک کر واپس گھر کے لئے چل پڑے۔

موہن پر نقابہت طاری تھی اس کو اس کے دوست بڑی مشکل سے گھر چھوڑ کر آئے اور موہن کے گھر والوں سے اصل بات چھپائی کر کے وہ قلعہ گئے تھے، تنہا کا بتایا اور چلے گئے۔

☆...☆...☆

گاں! گاں! گاں! صبح صبح گاؤں ماتا نے شور شروع کر دیا نرملہ کی آنکھ آواز سے کھل گئی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ وہ بستر سے نکلی ساڑھی درست کی اور باہر

نکل آئی۔ گاؤں ماتا زمین کی طرف سر کر کے گول گول چکر لگا رہی تھی اور ساتھ گاں! گاں! کی آواز نکال رہی تھی۔ اس کا انداز بے چینی ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے پہلے نرملہ نے گاؤں ماتا کو ایسا کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نرملہ نے اس کے آگے چارہ ڈالا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ دیر شانت ہو گئی مگر اس نے چارے کو منہ تک نہیں لگایا نرملہ نے اپنے کام کرنے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد وہ ہالٹی لے کر گاؤں ماتا کے پاس آئی اور دودھ دینے لگی۔ گاؤں ماتا کے انداز میں اب بھی بے چینی تھی۔ نرملہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

نرملہ نے پوجا کی اور گلاس میں دودھ نکال کر موہن کو دینے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ ”موہن بھیا! اٹھیے دودھ پی لیجئے۔“ موہن نے آنکھیں کھولیں جو کہ سرخ ہو رہی تھیں۔ نرملہ نے گلاس میز پر رکھا اور موہن کو سہارا دے کر اٹھایا، تکیہ کو سر ہانے لگایا اور موہن کو فیک لگا کر بٹھا دیا۔ پھر اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کو دیا۔ جب موہن نے دودھ کا گلاس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

نرملہ نے آگے بڑھ کر موہن کا ہاتھ تھام لیا اس کا ہاتھ برف کی مانند سخت ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ نرملہ نے اسے دودھ پی کر آرام کرنے کا کہا اور چلی گئی۔

گاؤں ماتا زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنا منہ پیٹ پر رکھا ہوا تھا اس نے نہ ہی چارے کو منہ لگایا تھا اور نہ ہی پانی کا ایک قطرہ منہ میں ڈالا تھا۔ سارے لوگ پریشان ہو گئے۔ بھولو کو بلایا گیا وہ گائے بھینسوں کا علاج کرتا تھا اس نے گاؤں ماتا کو دیکھا وہ بالکل ٹھیک تھی پھر بھی اس نے ہاضمہ درست کرنے کی دوا دی تاکہ اسے بھوک لگ جائے۔ چارے میں دوا ملا کر موہن نے زبردستی ہاتھوں سے گاؤں ماتا کو منہ میں کھلا دیا۔ ”بھگوان کی کرپا سے شام تک یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ موہن نے ہاتھ دھوئے ہوئے کہا۔ مگر گاؤں ماتا نے کسی چیز کو منہ تک نہ لگایا۔

اگلی صبح جب نرملہ اٹھی تو سب سے پہلے گاؤں ماتا کو

اسلامی معلومات

س: قرآن پاک نے سب سے پہلا پیغمبر کس کو کہا ہے؟

ج: حضرت آدم علیہ السلام کو۔

س: نماز کے لئے سب سے پہلے اذان کی تجویز کس نے دی؟

ج: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے۔

س: وضو کا حکم کب اتر آیا؟

ج: 5 ہجری میں۔

س: اسلام میں پہلی اذان کب ہوئی اور مؤذن کون تھے؟

ج: فتح مکہ 8 ہجری میں اور مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز کیلئے اذان دی۔

س: زمین پر پہلا درخت کون سا تھا؟

ج: کھجور کا۔

(محمد اسحاق انجم: کنکرن پور)

تھا۔ اس نے ساڑھی کا پلو سر پر لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی، گلاس اٹھائے وہ رسولی گھر میں گئی اور سٹکے سے گلاس میں پانی اٹھیلنے لگی۔

نرملہ کانی بہادر تھی ورنہ گاؤں والی بات کے بعد رات کو اکیلے دکھنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ جیسے ہی اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ اچانک کوئی چیز لہراتی ہوئی اس کے ہاتھ پر آگئی، گلاس ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کوئی "نرم چیز" تھی۔ اس نے مڑ کر سوال کیا کون ہے؟ اور رسولی گھر سے باہر آگئی۔ مگر

دیکھنے لگی مگر وہاں جا کر اس کی چیخیں نکل پڑیں۔ وہاں گاؤں والوں کی جگہ اس کی باقیات پڑی تھیں۔ "کھر سے اوپر تک کا ایک پیر جس کی کھال غائب تھی، خون میں لت پت، گاؤں والوں کا سر جس میں سے بھیجا غائب تھا اور اس کی اذیت میں ڈوبی پتھرائی آنکھیں، نرملہ سے یہ سب دیکھنا نہ گیا گھر والوں کے ساتھ پورا محلہ جمع ہو گیا۔ سب سمجھے کوئی خطرناک جانور علاقے میں آگیا ہے اور اسی نے گاؤں والوں کا شکار کیا ہے۔

نرملہ کا رورور کرنا برا حال تھا سب سے زیادہ خیال نرملہ ہی رکھتی تھی اس کا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے یہ تو بس شروعات تھی جس سے بے خبر سب لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

ہلدی کی رسم میں جب موہن کو لا کر بیٹھا گیا تو سب رشتے دار ملنے والے اسے دیکھ کر چونک گئے۔ موہن کا سرخ و سفید رنگ تھالی میں نئی ہلدی ابٹن جیسا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ خاموشی سے سر جھکائے پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ دو ایک نے تو گاتری سے کہہ بھی دیا کہ "اگر موہن ٹھیک نہیں تھا تو ابھی بیاہ کیوں کر رہی ہے؟"

گاتری نے بتایا کہ "راوہا کے پتا کی طبیعت اوجھٹ نہیں ہے اور ان ہی کے اصرار پر بیاہ کی تاریخ آگے نہیں کی ہم نے ورنہ ہمارا بھی یہ ہی ماننا تھا کہ تاریخ تھوڑی آگے کر دیں۔"

پھر رسمیں شروع ہو گئیں نرملہ ایک پیر پر راج رہی تھی کبھی اپنے بچے کو لے کر بیٹھنا پڑتا، کبھی کسی کو کوئی چیز دینی ہوتی، وہ ہر آواز پر دوڑتی گھن چکر بن گئی تھی۔ رسمیں ختم ہو گئیں تو تمام کام سمیٹ کر وہ بستر پر تنکھن سے چور لیٹی تو فوراً آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سوئی معلوم نہیں مگر اس کی آنکھ ننھے منیش کی رونے کی آواز سے کھل گئی۔ نرملہ نیند میں دھت اٹھی اور منیش کو جھولے سے نکال کر پلنگ پر پالتی مار کر بیٹھ کر ہلانے لگی۔ منیش سو گیا۔ نرملہ نے اسے لٹایا اور پانی پینے کے لئے گلاس اٹھایا تو وہ خالی

جواب میں صرف ہوا زور سے گزرتی نرملا کے جسم میں خوف سے سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ تیز قدم اٹھاتی کمرے میں آگئی اور دروازہ بند کر لیا اور بستر پر دیک کر لیٹ گئی۔

نرملا کو ابھی تک اپنے ہاتھ پر اس چیز کا لمس یاد تھا۔ وہ جو چیز بھی تھی زندگی کی حرارت سے بھرپور تھی۔ "آخر کیا چیز تھی وہ؟" یہ سوچتے سوچتے نرملا نیند کی دایوں میں کم ہو گئی۔

صبح کا اجالا پھیلا، سورج دیوتا کے ساتھ نرملا بھی باہر نکلی۔ اس کے سانس سر بھی جاگے ہوئے تھے۔ نرملا نے اٹھان کے بعد تھکی مہیا کی پوجا کی اور رسوئی گھر میں ناشتہ بنانے لگی۔ موہن، موہن کو سہارا دے کر لے آیا۔ منیش کا تری دیوی کی گود میں تھا۔ نرملا نے سب کی تھالیوں میں گرم گرم پوریاں پر دس دیں۔ ناشتے کے بعد سب کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ شام کو بارات جانا تھی۔ مگر موہن کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ اس نوجوان کی آج شادی ہے۔ وہ بت بنا خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری طرف منڈپ سجا ہوا تھا اور لڑکے والوں کے سوا مکت کے لئے لڑکی والے منتظر تھے۔ بارات پہنچی تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ سب منڈپ کے گرد جمع ہو گئے۔ دولہا دلہن کے آتے ہی رکیمیں شروع ہو گئیں۔ دولہا، دلہن کو پھیر دوں کے لئے کھڑا کیا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگئی کے گرد پھیرے شروع کرتے۔ "کوئی بوجھ موہن پر آگرا، موہن لڑکھڑا کر کر پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے سیدھا ہوا مگر اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔"

"شما چاہتا ہوں جھانکی جی! میری ضد کی کارن بیاہ آگے نہ کیا گیا۔ آپ کی طبیعت تو مجھے ابھی تک صحیح نہیں لگتی۔" کشور داس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں! نہیں! پتا جی وہ وہ بس میں اپنا سنتو لن کھو گیا تھا، اب ٹھیک ہوں۔" موہن نے شرمسار کشور داس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

پنڈت جی نے پھر منتر پڑھنا شروع کر دیے اور

پھیرے شروع کر دیے۔ موہن کو ایک قدم اٹھانا بھی دشوار لگ رہا تھا اس کے اوپر بے انتہا بوجھ تھا۔ ساتویں اور آخری پھیرے کو پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ موہن کے قدموں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ پھیرے ختم کر کے اس نے آئینہ دیکھنے کے بجائے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ سب موہن کے پاس دوڑ کر آ گئے۔ جب موہن کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو رادھا کی بدالی کر دی گئی۔

نرملا اور موہن پہلے ہی چلے گئے تھے۔ تاکہ نرملا رادھا کے گھر پر دلہن کی تیاریاں کر لے۔ بارات دلہن لے کر گھر آگئی۔ نرملا نے آرتی کی تھالی سجا لی اور دروازے پر آگئی، نرملا نے دولہا دلہن کی آرتی کی۔ پھر چاول سے بھرا کٹش گھر کی دیلیر پر رکھ دیا۔ رادھا نے پیر سے کٹش گرایا اور اندر رکھی تھالی میں پیر رکھے۔ اس کے رنگ میں ذہبے پیر کے نشان زمین پر بھی چادر پر چھپنے لگے۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔ نرملا چادر اٹھانے کے لئے جھکی تو چونک کر رہ گئی۔ "رادھا کے قدموں کے نشان کے اوپر ایک ہلکا سا نشان چھپا ہوا تھا۔ وہ پیر جیسا ہی نشان تھا مگر الٹا تھا۔" اس سے پہلے کہ نرملا کچھ سوچتی۔ کانٹری کی آواز آئی۔ تو اس نے جلدی سے چادر اٹھا کر الماری میں رکھ دی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آواز کی سمت چلی گئی۔

موہن کمرے میں آیا، رادھا بستر پر گھونٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ موہن نے دروازہ بند کیا اور بات کرنا تو دور رادھا کی اور دیکھے بغیر بستر پر لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سو گیا۔ رادھا کافی دیر انتظار کرتی رہی، بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھنے لگی تو اس نے جھپکتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے گھونٹ اٹھایا اور ترچھی نظروں سے موہن کو دیکھا۔ موہن آنکھوں پر ہاتھ رکھے ست لینا تھا۔ رادھا نے اپنے گہنے اتارے اور سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"شادی کی پہلی رات ہے اور میرے پتی نے تو میری طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا! کہیں موہن جی کسی اور سے پریم تو نہیں کرتے اور پر یو والوں کے کہنے پر مجھ سے بیاہ کر لیا ہو؟" وہ دل میں جانے کیا کیا چار لئے سو گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جب لگا۔ نرملا سر جھکائے وہاں سے چلی گئی اور جھکتے ہوئے موہن کے کمرے پر دستک دی۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس نے رک کر دوبارہ دستک دی مگر دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ نرملا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ نو بیاہتا جوڑا تھا شاید دیر تک سو رہے ہوں۔

دوسری طرف گائتری کا غصہ۔ اس نے دھیرے سے آواز دی۔ ”دیور جی!“ مگر جواب میں خاموشی تھی۔

نرملا رسوئی گھر میں جا کر ناشتہ بنانے لگی۔ جب وہ ناشتہ پروسنے لگی تو گائتری نے اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا تو گائتری سر ہلا کر رہ گئی اور وہ چاروں ناشتہ کرنے لگے۔ دن کے بارہ بج گئے۔ اب تو گائتری دیوی خود گئیں اور دروازہ بجایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا کافی دیر آوازیں دینے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو وہ لوگ پریشان ہو گئے۔

موہن نے زوردار دھکے مار مار کر دروازہ توڑ دیا۔ اندر موہن بستر پر دراز تھا جبکہ رادھا بستر کے بجائے کمرے کے کونے میں زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے دہن والی ساڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے گردن جھکائے ہوئے تھی۔ ”رادھا!“ نرملا نے آگے بڑھ کر رادھا کو بلایا۔ مگر وہ پتھر کی سورت بنی رہی۔ نرملا نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو ”رادھا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔“

ادھر موہن نے موہن کو بلایا مگر وہ اس سے مس نہ ہوا اس کی سانس چل رہی تھیں مگر دونوں کہتے میں تھے۔ پہلے دید جی پھر شہر سے بڑے ڈاکٹر کو بلایا گیا تو پتہ چلا دونوں کو سکتہ ہو گیا ہے۔ رات ان دونوں کے ساتھ کمرے میں کیا ہوا کسی کو نہ معلوم تھا، رادھا کے پتا یہ خبر برداشت نہ کر پائے اور پر لوک سدھار گئے۔

گائتری دیوی کے گھر میں تو مانو قیامت آگئی تھی۔ جوان بیٹا اور بہو سکتے میں تھے۔ کب یہ سکنا ٹوٹا کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ دونوں برابر بستر پر لیٹے رہے اور گائتری اور نرملا دونوں کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔

نرملا اپنے بستر پر سوئی ہوئی تھی، موہن دوسری

رات کا جانے کون سا پہر تھا رادھا نے کڑوٹ بدلی تو چونک گئی اس نے ہاتھوں سے ٹٹولا تو ہاتھ ٹھنڈے فرش پر لگے تو وہ نیگے تار کو چھونے کی مانند اٹھی تو وہ اپنے بستر کے بجائے فرش پر پڑی تھی۔ ”موہن جی کو میرا ایک بستر پر سونا بھی برداشت نہیں!“ اس نے سوچا اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور بستر کی جانب بڑھتی مگر بستر کی جانب دیکھ کر اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔ ”موہن بائیں کڑوٹ لیٹے سو رہا تھا اور اس کی کمر سے چپکا ہوا ایک بے انتہا سیاہ وجود بستر پر پڑا تھا۔“ پھر تراخ کی زوردار آواز کے ساتھ ایک زوردار طمانچہ رادھا کے کال پر پڑا اور وہ چکرا کر زمین پر جا پڑی اس کی بانجھوں سے خون جاری ہو گیا جس کا پتہ رادھا کو اپنے ہونٹوں پر محسوس ہونے والے ذائقے سے چلا۔ اس کی ساڑی بھی زمین پر بکھر گئی۔ وہ اٹھی اور ساڑی کو لپیٹا۔ اس نے موہن کے پاس جانے کے لئے چہرہ اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے گدی کے پاس سے اس کی چوٹی کو کس کر جکڑ لیا۔ تکلیف سے رادھا کی چیخ نکل گئی۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے ایک سیاہ چادر تن گئی اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پھر پلک جھپکتے ہی اس کی نگاہوں کے آگے دو انگارے آ گئے ساتھ ہی رادھا زور سے فضا میں اچھلی اور ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا گری۔ اب کی بار رادھا نے جو سر اوپر اٹھایا تو ”اس کی نگاہوں کے سامنے دو بے حد سیاہ پیر تھے جن کے ناخن لمبے اور مڑے ہوئے تھے۔ پھر پیروں کے اوپر جو سیاہ وجود نیچے ہوتا چلا گیا، رادھا کی آنکھیں خوف سے پھٹتی چلی گئیں پھر اس وجود کے سیاہ ہاتھ رادھا کے منہ کی طرف بڑھنے لگے۔“

☆.....☆.....☆

سورج دیوتا کے نکلنے ہی نرملا بستر سے نکل آئی۔ اشنان اور تلخی ماما کی پوجا کرنے کے بعد وہ بلی تو سامنے گائتری دیوی کھڑی تھیں۔ نرملا نے ان کے چہرے چھو کر آئینہ دیکھا۔ ”نرملا! آج رادھا کا سسرال میں پہلا دن ہے۔ اس کو پوجا میں شامل ہونا چاہیے تھا آخر کو وہ گھر کی لکشمی ہے۔“ گائتری کو رادھا کا پوجا میں نہ آنا

کروٹ لئے سو رہا تھا جبکہ منیش پالنے میں سو رہا تھا۔ نرملا کو نیند میں اپنے چہرے پر کسی گرم چیز کا احساس ہوا جیسے کوئی چیز رینگ رہی ہو۔ اس نے نیند میں ہی ہاتھ سے اسے پرے کر دیا۔ مگر پھر وہی احساس اسے اپنی گردن پر ہوا۔ نرملا نے پھر اسے ہاتھ سے ہٹایا۔ تو وہ چیز رینگتی ہوئی گردن سے سینے پر آ گئی۔ سینے سے ہوتی ہوئی پیٹ سے رینگنے لگی نرملا کسمسائی، پھر پیٹ سے ہوتی ہوئی وہ چیز پیروں میں آ گئی اور پنڈلیوں پر رینگنے لگی۔ نرملا نے نیند میں دونوں پیروں کو آپس میں رگڑا وہ احساس ختم ہو گیا تو وہ پھر گہری نیند میں چلی گئی۔

لحہ نہ گزرا تھا کہ نرملا کے کمرے کے پیر کے کمرے میں کسی نے اس زور سے گدگدی کی کہ نرملا اچھل پڑی کہیں کوئی سناپ وغیرہ تو نہیں آ گیا، کمرے میں! اس خیال سے وہ تیر کی طرح بستر سے نکلی اور منیش کے پالنے کے پاس آئی۔ منیش دائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ نرملا اسے سوتا دیکھ کر اطمینان سے پلٹ کر بستر کی جانب چل دی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ چڑ، چڑ کی آواز آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے مگر اسے سمجھ کچھ نہیں آیا۔ جب اس نے رک کر کان لگائے تو آواز منیش کے پالنے سے آرہی تھی۔ اس نے پھرتی سے جا کر منیش کی اوڑھنی ہٹائی تو ساکت رہ گئی۔

”پالنے میں لینے منیش کے منہ میں ایک لمبی رپٹی سیاہ چیز تھی، جسے وہ بے تابی سے چوس رہا تھا۔“ نرملا کو لگا کہ وہ سانپ کی دم ہے۔ وہ چیز پالنے سے بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ نرملا نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو وہ شے پالنے سے لٹکی نیچے زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ حلق میں آئے تھوک کو اس نے بڑی مشکل سے نگلا۔ ”وہ چیز جس کی دم تھی، وہ ایک آدمی کی قامت والا بے حد بڑا سیاہ لنگور تھا۔“ اس سے پہلے کہ نرملا کچھ کرتی۔ وہ سیاہ لنگور، جھپٹ کر نرملا سے چمٹ گیا اور اپنے نیچے سے نرملا کا منہ بند کر دیا۔ نرملا نے زور لگا کر اس کا سیاہ گلجا سا پنجہ اپنے منہ سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

لنگور اسے گھسیٹ کر محسن میں لگے درخت کے

پاس لے آیا اور نرملا کو نوچنا شروع کر دیا۔ اس کے ٹانگوں نے نرملا کے بدن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔ کھینچا تانی میں نرملا کی چوٹی بھی پھٹ گئی تھی جس میں سے اس کا بدن جھٹک رہا تھا۔ آخر اس لنگور کا کیا ارادہ، اس کی سمجھ نرملا کو نہ آرہی تھی۔ پھر اس لنگور نے نرملا کو نیچے زمین پر گر ادیا اور اس کی گردن، سینے اور پیٹ پر اپنے نوکیلے دانت گاڑ کر بھنجوز نے لگا، تکلیف نے نرملا کو جھنجھنا دیا۔ اس نے پورے شری کی طاقت جمع کر کے سیاہ لنگور کو دھکا دیا اور اٹھ کر دوڑی۔ لنگور نے اس کا پلو پکڑا تو نرملا کی ساڑی کھل گئی مگر وہ رکی نہیں اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ دروازے سے لگی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اس کا سینہ انجن کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ پھر نرملا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے موہت کی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر نرملا کے پاس آیا۔

نرملا اتنا حواس باختہ تھی کہ موہت کو لنگور سمجھی اور ہاتھ چلانے لگی اور چیختی۔ ”دور رہ مجھ سے دشت، پانی، درندے!“ اس کو موہت نے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”نرملا! میں ہوں موہت۔“ تو نرملا رک کر اس کو دیکھنے لگی اور ایک دم اس سے لپٹ گئی، وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

موہت نے اسے چکارا پھر نرملا نے موہت کو ساری بات بتائی۔ موہت نے اسے بستر پر بیٹھایا اور خود دروازہ کھول کر باہر آیا مگر سارا محسن خالی تھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد نرملا کو آ کر بتایا۔ مگر نرملا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ موہت نے گانتری دیوی کو بلایا۔ انہوں نے جب نرملا کی حالت دیکھی تو وہ خوفزدہ ہو گئیں۔ نرملا کے سینے، گردن، پیٹ اور شری کے اور حصوں پر کٹ کھنے لنگور کے دانتوں کے نشانات واضح تھے۔ اور نرملا کی ساڑی بھی محسن میں بکھری پڑی تھی۔ انہوں نے نرملا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ”چنانہ کر بہو! ایسے بے شرم لنگور ہوتے ہیں جو آوارہ پھرتے ہیں اور تارنی کو دیکھ کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ میرے لڑکپن میں ایک بار جب میں اپنی موسیٰ کے ساتھ جہرنے پر گئی تو میری موسیٰ پر بھی ایک آوارہ لنگور نے

دہشتناک، دہشتناک، حیرتناک، تحیر انگیز اور خوف
دہراں کے لبادہ میں لپٹی ہوئی دلفریب اور

خوفناک کہانیاں

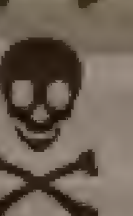
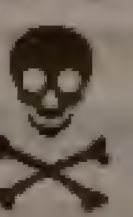
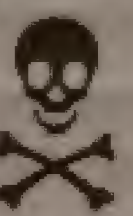
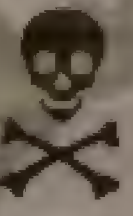
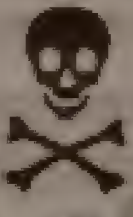
کفارہ

طلسم کدہ

خوفناک عفریت

زندہ آتما

آتما شکتی



پھاڑی کے جن

واصل جہنم

بے چین روح

خونی سفر

دہشت ناک

قیمت - 60/- روپے

ہر ناول مکمل

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

دُعا بک کارنر منشی محلہ گلی نمبر 5 فیصل آباد
امین پور بازار

PH:041,2640013

حالا کر دیا تھا۔ پھر گاؤں کے لوگوں نے اسے مار کر بھگا دیا تھا۔ انہوں نے نرملا کو شانت کیا اور اس کے زخموں پر مرہم لگا کر اسے سلا دیا۔

☆.....☆.....☆

ماٹک چند اپنے کمرے سے نکلے اور چھت پر بنے کمرے میں آ گئے۔ رات کا بھوجن کرنے کے بعد یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ انہوں نے پان کی گھوری من میں رکھی اور ریڈیو پر گانے لگا کر لیٹ گئے۔ ایک دم ریڈیو بجتے بجتے بند ہو گیا۔ ماٹک چند نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے سرگھما کر ریڈیو کی طرف دیکھا مگر ریڈیو اپنی جگہ سے غائب تھا۔ وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھے اور کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مگر کمرے میں سناٹا تھا پھر ایک دم گانے کی آواز آئی مگر وہ آواز کمرے کے باہر سے آرہی تھی۔ ماٹک چند نے بستر سے اتر کر پاؤں میں جوتیاں پہنیں اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ریڈیو سامنے بنی چھت کی منڈیر پر رکھا ہوا تھا۔ ماٹک چند ٹپکپاتے ہوئے آتے ہوئے اس سے پہلے کہ وہ ریڈیو اٹھاتے۔ کسی نے ان کا گرتا پیٹھ سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ چیخے مڑے تو وہاں ایک سیاہ لنگور کھڑا تھا اور ساتھ منڈیر پر ایک عورت کھڑی اپنے پیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی چڑی کا گھونگھٹ نکالا ہوا وہ ٹانگیں آگے پیچھے ہلاتی تھی۔

”کون ہے؟“ ماٹک چند نے پوچھا۔

”بڑی جوانی چڑھی ہے تجھے جو گانوں سے دل بہلا رہا ہے۔“ اس عورت نے بے ہودہ انداز سے کہا۔

”چلو نکلو یہاں سے تم ضرور رگھو کے گھر سے آئی ہو گی وہی ایسے یہودہ لوگوں سے ملتا ہے۔“ ماٹک چند نے اپنے محلے کے ایک بے کار آدمی کا نام لیا۔

”تو ہٹائے گا ہمیں یہاں سے۔“ وہ عورت کو د کر نیچا تر آئی۔

”اور یہ اپنا پالتو بندر بھی لیتی جا!“ ماٹک چند سمجھا وہ عورت جارہی ہے۔ اس عورت نے قریب آ کر جو اپنا گھونگھٹ اٹھایا تو ماٹک چند کا خون جھنے لگا۔ اتنی

خونناک شکل اس نے اپنے پورے جیون میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر اس عورت نے ماٹک چند کو دھکا دیا اور ان کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ماٹک چند کی آواز ان کے منہ سے باہر نہ نکل سکی ان کے ہونٹ آپس میں چپک گئے تھے۔ بوجھ بڑھتا گیا اور ماٹک چند ٹھنڈا ہو گئے۔ اس عورت نے ماٹک چند کا سینہ چیرا اور دل نکال کر چبانے لگی، پھر اس نے ماٹک چند کا کلیجہ نکالا اور اسے چبانے لگی۔

سیاہ لنگور بے چینی سے ادھر ادھر کو رہا تھا کہ کب اس کی باری آئے گی۔ پھر وہ عورت ہٹی اور اپنی مڑی ہوئی انگلیاں چاٹنے لگی۔ سیاہ لنگور اس کے ہٹتے ہی دھپ سے کودا اور لاش کو نوچ کر کھانا شروع کر دیا۔ پوری لاش چٹ کر کے لنگور بے تابی سے زمین پر گئے خون کو زبان سے چاٹنے لگا۔ اس نے ہڈیاں تک اپنے پیٹ میں اتار لی تھیں۔ ”بڑا ہی بھوکا ہے تو ایک پرش سے تیرا پیٹ نہیں بھرا؟ ہاں بھرے گا کیسے تیری بھوک۔“ ماری کے نرم ماس سے مٹی ہے ناں۔“ اس عورت نے کہا تو لنگور اپنے دانت نکالنے لگا۔

☆.....☆.....☆

گائتری نے نرملا سے پوچھا۔ ”ہو! تمہارے سر جی آگئے نیچے؟“

”نہیں ماں جی! آج تو باؤ جی کو کافی سے لگ گیا ہے نیچے آنے میں۔“ اتنے میں موہت بھی آ گیا تو گائتری دیوی نے اسے ماٹک چند کو بلانے اوپر بھیجا۔ اوپر کمرہ خالی تھا اور ریڈیو بج رہا تھا۔ موہت نے اسے بند کیا اور نیچے آ کر ماں کو بتایا۔ گائتری اور نرملا حیران تھیں کیونکہ دروازے کا کنڈا اندر سے چڑھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے ماٹک چند باہر نہیں گئے تو آخر کہاں غائب ہو گئے۔ پورا گھر چھان مارا پھر سارے پاس بڑوس، جاننے والوں، دوستوں، گاہکوں سے معلوم کیا مگر کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ ماٹک چند کہاں گئے؟ سب پریشان تھے مگر کچھ کرنے پائے۔

موہت اکیلا سارے جھیلے دیکھنے کے ساتھ گھر

رشتے

مخلص رشتے اللہ کی نعمت ہوتے ہیں انہیں کبھی مت ضائع ہونے دینا چاہئے جیسی بھی مجبوری ہو کیونکہ مجبوری تو ختم ہو جائے گی لیکن رشتے دوبارہ نہیں ملتے۔

(ثروت عزیز گوشتی: کوٹھا کلاں)

رادھا کی آنکھیں بند تھیں۔ جو اس نے ہٹ کر کھول دیں اس کے ذیلے سفید تھے اور پتلی غائب، رادھا نے عجیب سی خوفناک آواز نکال کر رونا شروع کر دیا۔ "گائتری" رادھا سے خوفزدہ ہو گئیں۔ پھر رادھا نے اپنے ہاتھ کو منہ کے قریب لے جا کر اشارہ کیا اور اپنا منہ کھول دیا۔ اب جو گائتری کی نظر رادھا کے منہ پر پڑی وہ لڑکھڑائی۔ "رادھا کے کھلے منہ میں خون بھرا ہوا تھا۔ جو بانچھوں سے بے لگا تھا اور اندر سب خالی تھا رادھا کی زبان غائب تھی۔

ایک دم گائتری کی ساڑی کسی نے پیچھے سے کھینچی، گائتری کا سنتولن بگڑا اور وہ لڑھکتی ہوئی میزروں سے نیچے آ پڑیں، ان کا سر زمین سے ٹکرایا تو ان کی آنکھوں میں تارے تارے ناچ گئے۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گئیں، ان کا سر ابھی تک کھوم رہا تھا۔

گائتری کو پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا وہ کسی کے ہاتھ تھے جنہوں نے سینے پر دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گائتری نے گردن موڑی تو "پیچھے ایک خوفناک سیاہ لنگور اپنے بڑے بڑے دانت نکالے تھیں، تھیں کر رہا تھا، گائتری کی جان نکل گئی اس لنگور نے گائتری کے سینے پر اپنے ناخن چھوئے شروع کر دیئے اور پھر ایک دم اپنے نوکیلے دانت گائتری کے گال میں پھوست کر دیئے۔ گائتری کو لگا کسی نے گرم سلاخیں ان کے چہرے میں کھسادی ہوں۔ اس لنگور نے گائتری کے گال کا گوشت دانتوں سے کاٹ کر الگ کر دیا۔

گائتری سر سے ہڈی تک جھین جھینا گئیں اور اپنے

والوں کو سنبھال رہا تھا۔ نرملا کے سونے کے بعد اسے نیند نہیں آرہی۔ وہ باہر صحن میں کھنولے پر آ کر لیٹ گیا وہ سارے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا، ٹھنڈی ہوا چلی تو موہت کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ موہت کو اپنی کلائی پر کسی کی گرفت کا احساس ہوا اس نے نیند بھری آنکھ کھولی تو کوئی بیٹھا اس کی کلائی تھا اسے ہوئے تھا۔ موہت کو وہ نرملا لگی۔ موہت نے نیند میں کہا۔ "سو جا بھائی کوان! سب ٹھیک ہو جائے گا، پتا چلی آ جائیں گے تو فکر مند نہ ہو؟"

"اب کیا چتا سے واپس اٹھ کر آئے گا تیرا باپ؟" اس عورت نے گرج کر کہا تو موہت کی نیند اڑ گئی۔ "موہت کو کرنٹ لگا اور ایک دم اٹھ کر بھاگا اور کمرے کے بجائے گھر میں بنے مندر کے اندر گھس گیا۔ سامنے سارا صحن خالی تھا موہت وہیں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ سویرے گائتری اور نرملا نے آ کر اسے جگایا۔ موہت نے اٹھ کر بتایا۔ "رات صحن میں کوئی عورت تھی! عورت؟"

"مگر بیٹا یہاں تو عورت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب ہم آئے، تیرا وہم ہو گا تو ویسے بھی پریشان جو ہے۔" گائتری دیوی کی بات پر موہت سر ہلا کر رہ گیا۔

گائتری دیوی گہری نیند میں تھیں جب انہیں کسی نے آواز دی۔ "ماں جی!" گائتری انہیں تو انہیں دروازے سے نکلتا ہوا کوئی دکھا اور پلو لہرایا۔ گائتری سمجھیں کہ نرملا کسی کام سے آئی تھی اور مجھے سوتا پا کر واپس چلی گئی۔ مگر جب گائتری نے دقت دیکھا تو رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ "نرملا اس دقت! کہیں کوئی چتا کی بات تو نہیں ہے؟" یہ سوچ کر گائتری تیر کی طرح بستر سے نکلیں اور کمرے سے صحن میں آئیں مگر وہاں نرملا کے بجائے رادھا سامنے چھت پر جاتی میزروں پر جڑھتی نظر آئی۔ "اے! رادھا تو سکتے میں تھی یہ ٹھیک ہو گئی؟ یہ تو خوشی کی بات ہے۔" گائتری کو خوشی ہوئی۔ وہ تیزی سے رادھا کے پیچھے میزریاں چڑھنے لگیں اور رادھا تک پہنچ کر انہوں نے رادھا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف موڑا۔

رادھا کے مڑتے ہی گائتری کی خوشی ہوا ہو گئی۔

نانک پیچھے موڑ کر بھرپور طاقت سے لات لنگور کے پیٹ میں ماری، لنگور کی گرفت چھٹی تو گائتری نے دوڑ کر باہر جانے کا دروازہ کھولا اور گھر سے نکل آئیں، اس وقت انہیں کچھ نہیں سوچ رہا تھا، لنگور بھی چھلانگیں مارتا ان کے پیچھے آرہا تھا، گائتری بھاگتے بھاگتے تھکنے لگیں، وہ شیطانی سیاہ لنگور تھا اس کا فاصلہ گائتری سے کم ہو گیا تھا اس سے پہلے کہ گائتری کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ لنگور انہیں دیوچ لیتا۔

سامنے مندر کی سیڑھیاں گائتری کو نظر آئیں۔ وہ بے تحاشہ دوڑتی ہوئی مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اوپر مندر میں پہنچ کر انہوں نے نیچے دیکھا تو وہ شیطانی سیاہ لنگور غصہناک انداز سے اچھل رہا تھا وہ مندر کی سیڑھی کے پاس آتا اور ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ جاتا، کافی دیر ایسا ہوتا رہا پھر وہ وہاں سے پلٹ گیا۔ گائتری وہیں مندر میں ڈھیر ہو گئیں۔

گائتری کی آنکھ کھلی تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا وہ مندر ہی میں تھیں۔ سامنے ہی کچھ دور ایک بہت عمر رسیدہ منٹھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گائتری ایک دم انہیں اور نیچے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔
”وہ! وہ! نیچے ٹنگ۔۔۔“ مگر الفاظ ان کا ساتھ نہ دے سکے اور انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ ان بابا نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بولے۔ ”شانت ہو جا پتری، تو بھگوان کی شرمن میں ہے، چننا کا ہے کرتی ہے؟ ادھر آ ہمارے پاس۔“

گائتری ان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں، ان کے گال کا ماس غائب تھا، ان بابا نے اپنا داہنا ہاتھ گائتری کے گال پر پھیرا تو ان کا زخم فوراً بھر گیا۔ گائتری کو اپنے اندر ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہونے لگی۔ گائتری نے روتے ہوئے رات کے اس سے اپنے مندر میں ہونے کا کارن بتایا تو ان بابا نے آنکھیں بند کر لیں۔ پل بھر میں انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو ان کے ماتھے پر چننا کی ٹکیریں صاف دکھ رہی تھیں۔ ”تیرے پر یوار پر ایک بہت پرانی جڑیل کا سایہ پڑ گیا ہے، وہ تیرے

پورے پر یوار کو ختم کر دے گی اور سب سے چننا کی بات یہ ہے کہ اس نے تیرے پتر کے ساتھ پھیرے لے کر اسے اپنا پتی مان لیا ہے اور یہ نوتا اسے تیرے پتر نے خود دیا تھا۔ تیرے پر یوار کو ختم کرنے کے بعد وہ تیرے پتر کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ ابھی اسے شکتی پراپت کرنی ہے اور اس کار میں اس کا پیلا شیطانی بدروح بھی شامل ہے جس نے ایک سیاہ لنگور کے شریر میں پراولیش کیا ہوا ہے۔“ وہ بابا جی خاموش ہو گئے، اتنے میں مندر کے اندر سے ایک داسی انہیں بلانے آئی۔ ”تو یہیں ٹھہر ہم ابھی آتے ہیں اور داسی کو گائتری کے پاس ٹھہرنے کا آولیش دے کر اندر چلے گئے۔

”یہ کون ہیں؟“ گائتری نے داس سے پرسن پوچھا۔
”آدر سے نام لے مورکھا جانتی ہے، کس کے بارے میں بات کر رہی ہے؟“ داسی نے ترش لہجے میں کہا۔
”شما چاہتی ہوں! مندر کے پجاری جی کو ہم جانتے ہیں مگر ان کو پہلی بار دیکھا ہے۔“ گائتری بولیں۔
”بھاگیہ شالی ہے! جو تھے آج پنڈت گو سواہی دے مہاراج کا دیدار کرنے کو ملا اور انہوں نے تھے اتنا سے دے دیا وہ بھی بنا کسی انتظار کے۔ ورنہ ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کو لاکھوں لوگ پیدل چل کر ان کے پاس جاتے ہیں اور کئی دنوں بعد ان کا دیدار کر پاتے ہیں۔ اتنی لمبی قطاریں ہوتی ہیں ان کے بھگتوں کی۔ آج اس مندر میں گو سواہی مہاراج چالیس ورشوں بعد پدھارے ہیں۔“ داسی نے بتایا۔

اتنے میں گو سواہی مہاراج آگئے تو داسی ہاتھ جوڑے نکا ہیں نیچے کئے ایک طرف ہو گئی۔

گائتری گو سواہی مہاراج کے چہنوں میں گر گئیں اور بولیں۔ ”میری سہانیا کیجئے مہاراج۔“

انہوں نے گائتری کو شانوں سے تھام کر اوپر اٹھایا اور بولے۔ ”ہم اوشیہ تیری سہانیا کریں گے۔ سنگٹ میں کسی کی سہانیا کرنا تو ہر منیش کا کرتویہ ہے اور پہننے کا کام بھی۔“

”سواہی مہاراج! وہ جڑیل میرے بیٹے کے

پیچھے کیسے لگ گئی؟“ کاٹری نے سوال کیا۔

”اسے تیرے پتر نے خود بخود دیا تھا، وہ جس مہاراجا کے قلعہ گیا تھا، وہ جڑیل وہاں سے اس کے ساتھ آئی ہے۔ وہ بہت پرانی ہے۔ یہ اس سے کی بات ہے جب مہاراجا لکشمن اس قلعہ میں اپنی ماں یعنی راج ماتا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جب راج ماتا بہت بیمار ہو گئیں اور بستر سے جاٹکیں تو انہوں نے مرتیو سے پہلے اپنی اتم اچھا مہاراجا لکشمن کے سامنے رکھی کہ وہ مہاراجا لکشمن کے ونش کو آگے بڑھانے کے لئے، اپنے سامنے اس کا وواہ کرنا چاہتی ہیں۔ مہاراجا لکشمن کے لئے راج ماتا کا آدیش پتھر پر لکیر تھا۔ اس کے قریبی ساتھیوں اور وفادار یوں نے بہت سی راجکمار یوں کے بارے میں مہاراجا لکشمن کو بتایا مگر مہاراجا لکشمن کے در بھاگیے نے اس کو عجیب حالات سے دوچار کر دیا۔

مہاراجا لکشمن اپنے ستر شمشیر تلخ کے بلاوے پر اس کی جاگیر گیا اور اس کی ملاقات راستے میں ایک کم سن، سندھ، کنواری کنیا سے ہوئی۔ مہاراجا لکشمن کو وہ فوراً بھاگئی اور بنا کسی جان کاری کے مہاراجا لکشمن نے اس سے وواہ کر لیا اور راج ماتا کے سامنے لا کر پیش کر دیا۔

راج ماتا اتنی بیمار تھیں کہ بشکل انہوں نے دونوں کو آ شیر باد دیا اور اس وواہ کے دو روز بعد ہی راج ماتا پر لوک سدھار گئیں۔

مہارانی پدمنی کی سندرتا نے مہاراجا لکشمن کو بری طرح اپنے جال میں لپیٹ لیا تھا اور اسی سندرتا کے کارن اس نے پدمنی کو اپنی دھرم پتی بنایا تھا۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ مہاراج لکشمن کو کچھ خبر نہ تھی۔ بس پدمنی نے اتنا بتایا تھا کہ اس کا اس سنسار میں کوئی نہیں ہے۔

پھر مہاراجا لکشمن کی جاگیر میں جوان پرش اور ناریوں کا غائب ہونا معمول بن گیا۔ ایسا کوئی دن نہ جاتا جب کوئی غائب نہ ہوتا ہو۔ مہاراجا لکشمن نے اپنے گیت کارندوں اور سینا پتی کو اس کی کھوج لگانے کا آدیش دیا مگر اس سے کوئی سہلچا نہ ملی اور مرتیو ہونے کا سلسلہ نہ ختم سکا، پھر ظلم کا یہ سلسلہ بھگوان کی کرنی سے مل ہوا۔

ایک رات مہاراجا لکشمن کی آنکھ خود بخود کھلی اس نے اپنی برابر سوتی مہارانی پدمنی کو دیکھا تو اس کا بستر خالی تھا۔ کافی سے انتظار کرنے پر بھی جب وہ نہ آئی تو مہاراجا لکشمن اٹھ کر باہر جانے لگا پھر جانے اس کے من میں کیا آئی اس نے اپنی تلوار بھی اٹھالی اور باہر آ گیا۔ باہر کھڑے پہرے داروں سے اس نے مہارانی کا پوچھا مگر انہوں نے کہا ”مہارانی تو کمرے سے نکلی ہی نہیں۔“ اس بات نے مہاراجا لکشمن کو حیرت کے سمندر میں ڈال دیا اس نے پہرے داروں سے تو کچھ نہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔ چلتے ہوئے اسے کہیں بھی مہارانی پدمنی دکھائی نہ دی۔ پھر مہاراجا لکشمن قلعے کی دوسری طرف گیا اس جگہ کافی اندھیرا تھا۔

مہاراج نے قلعہ کی دیوار سے لگی ایک مشعل لی اور آگے بڑھ گیا۔ ایک دم اس کے سر میں کچھ الجھا۔ مہاراجا نے اسے اٹھایا تو وہ کوئی کپڑا تھا جو کہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر مشعل کی روشنی میں دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ دراصل ساڑی تھی۔ مہاراجا لکشمن اسے پدمنی کی ساڑی سمجھا اور کسی خطرے کے پیش نظر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مگر آگے پہنچ کر جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا، اس نے مہاراجا کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔

”سامنے مہارانی پدمنی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ مہاراجا لکشمن کی طرف تھی، مہارانی سے تھوڑی دوری پر ایک چھوٹا، گنجا، سیاہ پرش موجود تھا جو کہ زمین پر پڑی ایک عورت کے گلے پر جھکا ہوا تھا۔ عورت کے گلے سے خرخر کی آواز آرہی تھی اور وہ بری طرح پھڑک رہی تھی۔ عورت کے جسم پر ساڑی موجود نہ تھی۔ مہارانی کچھ کر رہی تھی وہ دونوں اتنے گمن تھے کہ انہیں مہاراجا لکشمن کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔

مہاراجا آگے بڑھا تو اس کو مہارانی کا چہرہ نظر آیا، اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کلچہ تھا، جسے وہ بے صبری سے چبا رہی تھی پھر وہ زمین پر چاروں ہاتھوں سے پیروں سے جانوروں کی طرح چلتی لاش کے پاس پہنچی اور دانتوں سے اڑھڑنے لگی۔

مہاراجا لکشمین نے سے ضائع کئے بغیر میان سے کموار نکالی اور دونوں کے سران کے شریر سے الگ کر ڈالے۔ وہ اتنے گمن تھے کہ کچھ نہ کر پائے۔ مہاراجا جانے اپنے وفاداروں سے دونوں کی لاشوں کو قلعہ میں موجود کنویں میں ڈلوادیا۔

مہاراجا جانے ان کے شریر تو نشٹ کر دیئے مگر ان کی آتماؤں کو نہ مارا اور وہ اس کنویں میں بھٹکنے لگیں۔ وہ چڑیل جو ان رہنے کے لئے جوان پرشوں کے کلیجے چبائی اور اس کا پانی کا رتہ جوان ناریوں کا شکار کر کے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔

تیرے پتر کے بلاوے پر وہ چڑیل کی آتما اس پر آگئی اور اپنے ساتھ اپنے کارندے کو بھی لے آئی۔

تیری بہو رادھا اور اس نے ایک ہی سے پھیرے لئے تھے اس لئے وہ بھی اس چڑیل سے بندہ گئی تھی۔ اسی کارن اس چڑیل نے اسے اس سے نہیں مارا۔ مگر اس چڑیل نے رادھا کی زبان کھینچ کر باہر نکال لی اور کھا گئی۔ مگر آج اس نے اتنی شکتی پراپت کر لی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو رادھا سے آزاد کر لیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ تیرا پتی بھی اسی کا شکار بنا، اتنا ہی نہیں وہ تیرے بیٹے کے راستے نیا شریر حاصل کرے گی اور پوری شکتی پانے کے بعد تیرے پتر کا پران لے کر پھر سے خونی کھیل رچانے لگے گی۔ "ان کی بات سن کر گائتری لرزنے لگیں۔

پھر انہوں نے گائتری کو ایک پالی سے بھر لکشمین دیا اور بولے۔ "تیرا چھوٹا بیٹا جسے وہ اپنے ساتھ لے جا چکی ہے اور اسے اس سے روکنا ضروری ہے۔ تو یہ پانی لے اور اسے اپنے آگے چھڑکتی گھر جا اور اپنے دوسرے بیٹے اور بہو کو لے کر باہر آ اور پھر گھر کا دروازہ بند کر کے تالا ڈالنے کے بعد یہ پانی اس تالے پر ڈال دے۔ اس سے وہ چڑیل دوبارہ گھر میں داخل نہ ہو پائے گی اور اپنے بیٹے اور بہو کو لے کر مہاراجا لکشمین کے قلعہ میں پہنچ، ہم بھی وہیں آ جائیں گے۔ ابھی وہ چڑیل اسے غائب کر کے نہیں لے جا سکتی اسی لئے ہم

بھی سے پر پہنچ جائیں گے جا جلدی کر۔" انہوں نے زور سے کہا تو گائتری بجلی کی سی رفتار سے بھاگنے لگیں۔ گائتری، موہت اور نرملا جب مہاراجا لکشمین کے قلعہ میں پہنچے تو سورج دیوتا سونے جا رہے تھے۔ گائتری کے پاس وہ پانی کا گھٹیا اب بھی موجود تھا مگر وہ کبھی سورج کی طرف دیکھتی تو کبھی آنے والے راستے کی طرف، انہیں گوسوامی مہاراج کا انتظار تھا۔ ایک دم کسی نے گائتری کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

گائتری سمجھی موہت ہے، مگر جب وہ مڑی تو اچھل پڑی وہ گوسوامی مہاراج تھے۔ "مہاراج آپ!" "میں تو کب سے راستے پر نگاہیں جمائے آپ کی راہ تک رہی تھی۔"

تو گوسوامی جی مسکرا دیئے۔ گوسوامی جی نے اپنی مٹھی میں بند قلعہ کے بند دروازے پر کچھ دانے بکھیر دیئے۔ سورج ڈوبتے ہی وہ دانے انگاروں کی طرح سلگ اٹھے اور جل کر چنچنے لگے اور قلعے کا دروازہ دھڑ دھڑانے لگا اور اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اب ٹوٹ کر گرا۔ گوسوامی مہاراج نے قلعے کے دروازے پر قدم رکھا تو دروازہ ایک دم رک کر شانت ہو گیا اور زمین پر بکھرے ہوئے دانے خود بخود ٹھنڈے ہو گئے۔ پھر ایک دم قلعے کا دروازہ کھل گیا، گوسوامی مہاراج اندر گئے اور گائتری، موہت اور نرملا ان کے پیچھے چل پڑے۔ پھر وہ سب قلعہ میں موجود کنویں کے پاس پہنچ گئے۔ مگر وہاں موہن کا کچھ پتہ نہ تھا۔ گوسوامی مہاراج نے آنکھیں بند کیں اور چونک گئے۔

"بہت چنٹ ہے! ہمارے آنے سے پہلے موہن کو کنویں میں لے گئی۔" پھر انہوں نے آنکھیں دوبارہ بند کیں تو ان کے ہونٹ جلدی جلدی حرکت کرنے لگے اور پھر انہوں نے ایک بار پھر اپنی مٹھی ہوا میں اٹھائی اور پھر اس میں موجود دانوں کو کنویں میں پھینک دیا۔

کنویں کے اندر سے فوراً موہن کے چنچنے کی آواز آنے لگی۔ پھر وہ آوازیں غلیظ قسم کی گالیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر گوسوامی مہاراج نے کنویں کی

طرف پھونک ماری تو کنویں کے اندر سے موہن باہر نکل کر ہوا میں معلق ہو گیا اور اس کے گرد گوسوامی مہاراج کے پھینکے ہوئے دانے ہوا میں معلق موہن کے گرد گھوم رہے تھے۔

پھر گوسوامی مہاراج نے آنکھیں کھول کر ان دانوں پر نگاہیں جمائیں۔ تو وہ سنگ اٹھے۔ موہن نے حلق پھار کر چیخا شروع کر دیا۔ اس کی حالت بہت اذیت ناک ہو رہی تھی۔

گائتری کا من مٹھی میں بھنچا جا رہا تھا اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اس حالت میں دیکھ کر وہ آگے بڑھنے لگیں مگر نرملا نے انہیں جکڑ کر روک لیا۔ پھر ان تینوں کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس سے وہ لوگ اپنی جگہ پر جم گئے۔ ان سلگتے ہوئے دانوں نے ایک بھنور کی شکل اختیار کر لی تھی۔ موہن کنویں کے اندر جاتا کبھی باہر آ جاتا وہ نوں طرف سے ٹھنکی کا زور نظر آ رہا تھا پھر وہ بھنور کنویں سے باہر آ کر ہوا میں ٹھونسنے لگا۔ اور پھر ایک دم موہن دھب سے زمین پر گر گیا۔ اس سلگتے دانوں کے بھنور میں اب ایک خوفناک چیخ سنائی دے رہی تھی۔

وہ آواز ایک سیاہ بے حد سیاہ عورت کی تھی اس کی کمال انتہائی بوسیدہ مٹی جس کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور ہاتھوں پیروں کی انگلیاں مڑی ہوئی تھیں جن پر آگے ہوئے ناخن بھی لمبے لمبے مڑے ہوئے تھے۔

پھر گوسوامی مہاراج پڑھتے پڑھتے چونک پڑے۔ انہوں نے وہ بارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک کنویں کے برابر لگے درخت میں سے لنگور کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر گوسوامی مہاراج نے اسی درخت پر نگاہ جمائی اور پل بھر میں اس درخت میں آگ بھڑک اٹھی اور دھڑ دھڑ چلنے لگا۔ آگ کے ٹپتے ہی درخت سے ایک سیاہ لنگور دھب سے زمین پر آن گرا اور ایک دم اٹھ کر بھاگنے لگا۔ مگر کسی نے اسے دم سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا، کس نے لٹکایا وہ نظر نہ آ رہا تھا۔ سیاہ لنگور ہوا میں لٹکا چپے مار مار کر کچھ دیر میں لنگور دھب سے

زمین پر آ کر اور ہوا میں ایک سیاہ وجود معلق ہو گیا۔ سیاہ اور بے انتہا خوفناک لمبے لمبے دانت اور سرخ خون میں ڈوبی بڑی بڑی گول آنکھیں سرگنجا پھر اس کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ دونوں چلتے ہوئے چیخیں مار رہے تھے اور فضا میں غلیظ بورج گئی تھی پھر ان بھیاں تک آتماؤں کی چیخیں مدھم ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ دونوں جل کر ختم ہو گئے اور فضا میں بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔

”اب تو سب ٹھیک ہے ناں گوسوامی مہاراج!“ گائتری نے بے تابی سے پوچھا۔

گوسوامی مہاراج دھیرے سے سر اٹھا کر بولے۔ ”دیکھ! گائتری! ہونی کو کوئی چاہ کر بھی نہیں روک سکتا۔ وہ پانی تو اپنے انجام کو پہنچ گئے مگر جاتے ہوئے وہ چڑیل اپنا وار کر گئی۔ ہمارے آنے کی خبر اس چڑیل کو ہو گئی تھی، اس نے اپنی ہٹ دھرمی سے تیرے چتر کی پران لے لی۔“

گائتری دوڑ کر نیچے گرے ہوئے موہن کے پاس گئیں اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

موہت اور نرملا بھی آنکھوں میں آنسو لئے گائتری کو دلا سے اپنے گئے۔ پھر وہ لوگ موہن کی لاش کو گھر لے آئے۔ پھر اس کا اتم سنسکار کر دیا گیا۔ گائتری کو صبر نہیں آ رہا تھا اس کے پر یوار کے لوگ ایک ایک کر کے اسے چھوڑ گئے تھے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ نرملا خیالوں سے نکل آئی کیونکہ اس کی ننھی پالنے میں روئے لگی تھی۔ اس نے چتری واپس الماری میں رکھی اور ننھی بسلا کو اٹھایا۔ اسے میں ننھا میٹھی بھی دوڑتا ہوا آ گیا۔ نرملا دونوں کو لے کر بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی کیونکہ شام کو موہت اور گائتری واپس آنے والے تھے، وہ یا تو اپر گئے ہوئے تھے اور ساتھ گوسوامی مہاراج سے ان کے آشرم میں ملنے بھی گئے تھے۔



عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر: 20

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کھانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

شکر ناتھ نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ اس نے نہ صرف آکاش کی پرچھائیں اپنے قبضے میں کر لی تھیں اور دوسری طرف امرتا رانی کو بے بس کر دیا تھا۔ امرتا رانی کو چوں کہ آکاش کی زندگی اور محبت عزیز تھی اس لئے شکر ناتھ جیسے اس کی کمزوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ ایک نمبری کینہ، فریبی، مکار ہی نہیں بلکہ شقی القلوب، درندہ صفت بھی تھا۔ اس نے نہ جانے کتنی ہی کلیوں اور پھولوں کو ایک بھونرے کی طرح تباہ کیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے حریفوں اور دشمنوں کو زیر کیا اور صفحہ ہستی سے مٹا یا تھا۔ اس پر کوئی بھی قابو نہ پا سکا۔ اس کا ہال تک بیکانہ ہوتا تھا۔ اس لئے اسے بڑا زعم اور گھمنڈ تھا کہ ایک امرتا رانی کیا اس بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اس لئے اس کے بھدے اور بدنما ہونٹوں پر ایک مکروہ فاتحانہ مسکراہٹ رہنے لگی اور آنکھوں میں وحشانہ چمک کونڈ گئی۔

وہ خوش فہمی اور خود فریبی سے اکتا رہا تھا۔ امرتا رانی بے بس ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی ساری توقع خاک میں مل گئی۔ امرتا رانی نے اچانک اور غیر متوقع طور پر دکھائی ہوئی وہ سرخ سلاخ کسی چاقو اور نیزے کی مانند شکر ناتھ کی پسلیوں کو نشانہ بنا کر اس سمت پھینکا جو بجلی کی سی

سرعت سے کوندا بن کر لپکی۔ شکر ناتھ غافل اور بے پروا نہ تھا اس نے جھک کر سرخ سلاخ سے بچنے کی کوشش کی اور سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا۔ لیکن اس سلاخ نے اچانک حیرت انگیز طور پر رخ بدل کر کسی نیزے کی طرح اس کے نیم برہنہ پیٹ میں جا گئی تو اس نے ایک کریمہ چیخ ماری اور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور پیچھے الٹ گیا۔

حالات کسی سنسنی خیز اور ڈراؤنی اور بھیانک انگریز فلم کی طرح پے در پے مناظر بدل رہے تھے کہ آکاش بھونچکا سا ہو گیا اور وہ اپنی جگہ ساکت و صامت رہ گیا۔ شکر ناتھ کے زمین پر گرتے ہی امرتا رانی نے آکاش سے کہا۔

”تم غار ہی میں ٹھہرے رہنا باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔“

پھر امرتا رانی نے فوراً ہی بغیر کسی تاخیر کے انگلی کے اشارے سے آنکھیں سلاخ کو پراسرار طریقے سے شکر ناتھ کے بدن میں اس طرح کھمانے لگی جیسے اس میں ڈرل کر رہی ہو اور اس لئے امرتا رانی کے چہرے پر سخا کی سرخی ابھر آئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوب صورتی کے بجائے نفرت اور انتقام کی سرخی

Dar Digest 154 May 2015



بھرنی تھی۔

وہ امرتارانی کا لہجہ بے تابی سے انتظار کرنے

لگا۔ ہر لمحہ اس پر کسی صدی کی طرح بھاری ہونے لگا تھا۔

لیکن خاصی دیر گزرنے کے باوجود وہ واپس نہ آئی۔

اس نے باہر کی جانب کان لگا دیئے۔ اسے کسی قسم کی

آواز یا آہٹ سنائی نہ دے رہی تھی۔۔۔۔۔ پھر اس کے دل

کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اسے طلب

کر لے لیکن اس نے اپنے آپ کو اس خیال سے باز رکھا

کہ وہ نجانے اس وقت اس خبیث اور بوڑھے اور کہنے

شکر ناتھ سے مقابلے کے کس مرحلے سے دو چار ہو۔

شاید ان کے درمیان زبردست مقابلہ ہو رہا ہو یا پھر شکر

ناتھ اپنی کسی پراسرار طاقت سے مقابلہ کر رہا ہو۔ اس

لئے اس نے مزید انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ گو کہ یہ

انتظار کی کیفیت بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا جو کرب تھا

اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

وہ ان خیالات میں گم تھا کہ اس نے محسوس کیا

کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ اس وقت وہ

بڑی بے تابی اور اضطرابی کیفیت میں امرتارانی کے

انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہ تو

اپنے سچوں پر کھڑا ہو سکے اور نہ ہی ایک قدم چل بھی

سکے گا۔ اگر وہ ایک دم سے غار کے فرش پر نہ بیٹھ جاتا تو

شاید سنگاخ فرش پر بے دم سا ہو کر گر جاتا۔ توازن قائم

نہ ہونے کی صورت میں منہ کے بل گرنا تو پھر شاید تمام

دانت ٹوٹ جاتے۔ چہرے کا جغرافیہ بگڑ جاتا یا پھر اس

کی پیشانی پھٹ کر بھیجا باہر نکل آیا۔ فرش پر بیٹھتے ہی اس

نے اس کیفیت میں محسوس کیا کہ اسے اذیت اور تکلیف

سے نجات مل گئی لیکن سکون سا محسوس کر رہا ہے۔ چند ہی

لمحوں کے بعد اس کے پورے وجود میں میٹھی میٹھی سی سن

سناہٹ ہو رہی تھی جیسے کوئی غیر مرئی اور نادیدہ شے غیر

محسوس انداز سے باہر آنے کے لئے بے تاب ہو رہی

ہو۔ جس سے اس کے سکون میں بتدریج اضافہ ہو رہا

ہے۔

آکاش کے لئے یہ تجربہ نہ صرف بے حد دلچسپ

بلکہ سنسنی خیز بھی تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی اپنی

آکاش اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا اور اسے ایسا

محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی لرزہ خیز اور خونی منظر دیکھ

رہا ہو۔

امرتارانی اپنی نادیدہ اور پراسرار قوتوں سے شکر

ناتھ کو فٹ بال کی طرح ایک سمت لے گئی اور شکر ناتھ کا

جسم اس طرح لڑھک رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے

بڑی بے رحمی سے لات مار رہی ہو۔

آکاش سشدرہ مبہوت آنکھیں پھاڑے اس

طرح یہ خونی منظر دیکھتا رہا جیسے ہولناک خواب دیکھ رہا

ہو اور اس کی نس نس میں لبو منجمد ہونے لگا تھا اور دل و

دماغ سنسناتا جا رہا تھا۔ لہجہ اس کی آنکھیں پھیلتی بھی

جا رہی تھیں۔

شکر ناتھ کی روح فرسا تھیں اس میں کوئی

ہیجان اور دہشت پیدا کرنے کے بجائے اس کی آتما کو

طاقت بخش رہی تھیں۔۔۔۔۔ اس کے کانوں میں شہد کی سی

منٹھاس گھول رہی تھیں۔ اس کی مسرت کا اندازہ وہ خود

ہی کر سکتا تھا یا پھر امرتارانی۔۔۔۔۔ اس کی بے پناہ مسرت

اس کے وجود میں موجزن تھی کہ شکر ناتھ اس کا بدترین

جانی دشمن تھا۔ آخر وہ کیوں کر اور کیسے خوش نہ ہوتا۔

پھر ذرا سی دیر میں وہ دونوں غار کی بھول بھلیوں کی

آغوش میں اس کی لگا ہوں سے روپوش ہو گئے۔

ادھر غار سے روشنی کا وہ ہلکا ہلکا سا مخرن روپوش

ہو جانے کے باعث آکاش نے محسوس کیا وہ پھر سے

ایک عجیب سی طمانیت محسوس کر رہا ہے۔ وہ جس تکلیف

اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا اب اس کا شائبہ تک نہ رہا تھا۔

اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے سارے جسم پر ایک

میٹھی سنسنی دوڑ گئی۔

آکاش کو تو قہر تھی کہ امرتارانی جلد ہی شکر ناتھ کا

منجوس وجود موت کی آغوش میں بھیٹ کر کے چلی

آئے گی تاکہ وہ راستے کا پتھر نہ بنا رہے۔ پھر کبھی تنگ و

پریشان اور جان لینے پر نہ تیار ہے۔ اس کا وجود خاک

میں مل جانے سے ہی سکون ملے گا۔

اس مجموعی کیفیت کے باعث اسے اطمینان تھا کہ یہ حالت اس کے لئے کسی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ امرتارانی شکر ناتھ پر قابو پا چکی ہے اور اب وہ اپنے سائے کے کرب ناک عذاب سے نجات پالے گا۔

وہ اس خوشی میں غار کی دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا کہ اسے غیندی آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد کسی چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی غار کے گھب اندھیرے میں مشعل بن کر پھیل سی گئی۔ کوئی غار میں گھسنا تھا اور روشنی کا دائرہ بھٹکتا ہوا اس کے چہرے پر پڑا تو اس نے اپنی آنکھیں لمبے بھر کے لئے بند کر لیں۔ کیوں اس کی آنکھیں چند عاصی گئی تھیں۔ جب روشنی اس کے چہرے سے ہٹی تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ امرتارانی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس ٹارچ کہاں سے آ سکتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک قد آور شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ وہ ایک پرکشش اور بادقار شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ جیسے اعلیٰ فوجی افسر ہو۔ وہ حیران تھا کہ یہ شخص اس غار میں کیوں، کس لئے اور کیسے آ گیا۔۔۔۔۔؟ کہیں یہ شخص کوئی مفرد مجرم نہ ہو جو پناہ لینے کی غرض سے یہاں گھس آیا ہو۔

”آپ کون ہیں۔۔۔؟“ آکاش نے اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر پوچھا۔ ”اس غار میں کیسے آ گئے؟“

”میں ایک پولیس افسر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں مجرموں سے بچ کر پناہ لینے آیا ہوں۔ وہ دس عدد ہیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے۔۔۔؟ اس غار میں روپوش ہو کر کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے قانون کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے پناہ لی ہے؟“

”میں بڑا بد قسمت اور بد بخت شخص ہوں۔۔۔۔۔ میری ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے؟“ آکاش نے ایک سرد آہ بھری۔

”وہ شخص آکاش کے پاس آ بیٹھا اور اس نے ٹارچ گل کر دی۔“ روشنی دیکھ کر بد معاش آ سکتے

ہیں۔ صبح ہونے میں دو ایک گھنٹے باقی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کیوں نہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی رام کہانی سنائیں۔ اس طرح نہ صرف وقت بھی کٹ جائے گا، دل کو سکون اور قرار مل جائے گا۔ کیا آپ پہلے اپنی پتا سنانا پسند کریں گے؟“

اس انجینی نے ٹارچ روشن کر کے اپنی جیب سے سکٹ کا ایک پیکٹ نکالا اس میں کل بارہ عدد سکٹ موجود تھے۔ یہ کریک سکٹ تھے۔ اس میں سے چھ عدد اس نے آکاش کی طرف بڑھائے۔ اس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔

”میرے خیال میں آپ بھوکے ہوں گے۔“ میرے پاس صرف اتنے ہی سکٹ ہیں۔“ اس شخص نے کہا۔

”ہاں۔“ آکاش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔“ وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہوا کہ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ میرے لئے اوتار بن کر آئے ہیں۔ میں سننے اور خیال میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ پر اپنی بڑی دیا کرنے آئیں گے۔۔۔۔۔ میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے لئے پراگتھا کرتا رہوں گا۔“

”انسان کا کسی انسان کے کام آئے اس کا فرض ہے۔“ وہ بولا۔ ”آپ اپنی دردناک کہانی تو سنائیں؟“

”میری کہانی صرف اتنی ہی ہے کہ نامعلوم پردہ فردشوں نے میری جتنی کو اس لئے اغوا کر لیا کہ اس علاقے کا ایک ظالم شخص اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور ادھر بھٹکتا ادھر آ نکٹا۔ میں اس ڈر اور خوف سے اس غار میں روپوش ہو گیا کہ اس ظالم شخص کے آدمی مجھے قتل نہ کر دیں۔ ایک عجیب سی بات اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عورت کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرتا ہے۔ وہ مجھے ختم کر کے اسے ودھوا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں اپنی جتنی کو اس حویلی سے نکال لاؤں گا۔

جس میں اسے قید کیا ہوا ہے۔ اس کی ایک بہن جو اس علاقے میں رہتی ہے۔ میری ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس کے مشورے پر میں یہاں ردپوش ہوں۔“ آکاش نے اسے اصل کہانی نہیں سنائی۔ اس لئے کہ وہ یقین نہیں کرتا۔ یہ گھڑی ہوئی کہانی سنائی دی۔ ”عورت بھی بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ جتنی خطرناک ہے، حسین اور اتنی ہی بہادر بھی ہے۔ میں جو اپنی کہانی سنارہا ہوں آپ نے شاید ہی ایسی کہانی سنی ہوگی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے کہنے لگا۔ ”عورت جتنی نرم و نازک ہے اتنی پتھر بھی ہے۔“

ہر شخص کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آتے ہیں۔ اچھے برے دن بھی آتے رہتے ہیں جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کا تصور بھی ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن آج جو دن میری زندگی میں طلوع ہوا اور وہ کسی بہار کے جھونکے کی طرح تھا۔ میں نے بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی عزت اور پذیرائی اور شہرت مل سکتی ہے میں ایک مقام بھی پاسکتا ہوں۔

ملک کے دور دور کے گوشے سے اخباری نمائندے میرا انٹرویو لینے آرہے تھے۔ میڈیا میں، میں نے بل جل چادی تھی اور انہیں چونکا دیا تھا۔ سنسنی پھیلا دی تھی۔ اس کا پس منظر ایک ایسا کارنامہ تھا جو میں نے انجام دیا تھا جو گزشتہ برسوں سے پولیس کے لئے درد سر بنا ہوا تھا اور ان کی ناک کٹ گئی تھی۔ بڑا بدنام ہو گیا تھا۔ اس بات نے جو ناک میں دم کیا تھا اور پھر ان کے منہ پر کالک بھی مل دی تھی۔ اور پھر یہ ایک ایسی مصیبت تھی جو کسی بلا کی طرح نلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پولیس کی گردن کسی مجرم کی طرح ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ اب جو اس کارنامے سے تن لگی تھی۔ ذلت و رسوائی کی کالک چہرے اور اس منہ سے دھوڑالی تھی۔

دوسری طرف حکومت نے مجھے اس بہادری کے صلے میں لاکھوں کی رقم تحفے میں دان دینے والی تھی۔ اس لئے کہ میں نے جو قانون کی پاس داری کی۔ پولیس کے منہ کی جولانج رکھی تھی اور اس کی ذلت کو عزت میں

بدل دی تھی وہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ عزت، اتھامی رقم کا اعلان، میڈیا میں میرے کارنامے کو بیان کیا جا رہا تھا۔ کیا میں واقعی اس سے خوش تھا۔

یوں تو میں دنیا والوں کو دکھانے کے لئے اس طرح اپنے آپ کو خوش ظاہر کر رہا تھا جیسے خوشی کے ساتوں درمحل تھے ہوں۔ آکاش کی بلند یوں پر پہنچ گیا۔ کچ پوچھے تو میں اپنے وجود کے اندر گہرائی میں ایک عجیب سی کسک محسوس کر رہا تھا۔ میرے سینے میں خلش کا جو خنجر پیوست ہو گیا تھا میں اسے نکال نہ سکا۔ جب کبھی میں آئینے میں اپنی صورت دیکھتا تو ایسا لگتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں گا۔ جب میں راتوں کو سونے کے لئے دراز ہوتا تو لگتا تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوں جو دیک رہے ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش اور جتن کرتا لیکن بے سود۔ وہ چہرہ نہ میری آنکھوں سے دور ہوتا اور نہ مجھے سونے دیتا۔

پدہنی مری نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میں اپنی ساری توجہ اس عورت کے تصور سے ہٹانے کی کوشش کرتا، لیکن ہٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی یکا یک چشم تصور میں دیکھتا کہ جیسے میرے دائیں ہاتھ کی کٹنی سے کچھ اوپر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔ میں کرب اور درد کی شدت سے چیخنا چاہتا تو ایسا لگتا کہ میرے سامنے وہ عورت ریوالتا نے کھڑی ہے اور میں چیخ نہ پاتا۔ جیسے میری آواز حلق میں پھنس گئی ہو۔ کوئی گولہ سا ناک کیا ہو۔

”خبردار.....! اپنی جگہ سے جو حرکت کی.....؟ سانس جو نکالا..... ریوالتا کی تمام گولیاں تمہارا جسم چھلنی کر دیں گی۔“

اس کی گرج دار آواز نے جیسے میرا گلا گھونٹ دیا۔ میں تڑپتا رہا۔ پھر اس نے قبضے مار کے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

”دیکھتے کیا ہو..... اس سا دھوکے بچے کو..... کہیں بھی..... کسی گڑھے یا سمندر میں.....“

اس واقعے کے تصور سے آج بھی میرے

یہ وہ عورت تھی دوست... جس نے بڑے
بڑے بہادر بہادر اور جیا لے پولیس والوں کی ٹاک میں

ایک دن مجھے اچانک رام گڑھ پولیس چوکی کا چارج لینے کا حکم ملا۔ اس لئے کہ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جو کارکردگی دکھائی اور خطرناک مجرموں اور قاتلوں کی سرکوبی کی اور انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔

پولیس کے ہیڈ کوارٹرز سے نہ صرف مجھے سند بلکہ ایک لاکھ کی اضافی رقم بھی مل چکی تھی۔ میری مہارت پر بھی عیش عیش کرتے تھے۔ میں نے ایک طرح سے پانی صلاحیت کا لوہا منوایا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود رام گڑھ کا نام سنتے ہی سر سے پاؤں تک پسینہ آ گیا۔ بہت دیر تک میرے جسم پر لرزہ طاری رہا اور رگوں میں لہو خشک ہو گیا، جیسے میری نظروں کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا میری بے بسی پر مسخر کر رہا ہو اور استہزائیہ نظروں سے گھور رہا ہو۔ چوں کہ سرکاری نوکری کا معاملہ تھا اس لئے مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔۔۔ مجھ میں بھلا سرتابی کی جرات کہاں سے آتی۔۔۔۔۔؟ فرض شناسی سے انکار کیسے کرتا؟

میں ایس پی اور آئی جی سے بھی ملا۔ انہیں مجھ پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ وہ میرے کارناموں کی وجہ سے مداح تھے۔ میری قابلیت پر انہیں بڑا ناز بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں پدمنی کا گروہ ختم نہ کر سکا تو امن ضرور قائم کروں گا۔ اعلیٰ افسران نے مجھے ہر ممکن مدد اور تعاون کا یقین دلایا۔

رام گڑھ جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ چار دن کی چھٹی لے کر ایک عام آدمی کی طرح وہ علاقہ دیکھ آؤں۔ اس سے پہلے کبھی میں اس جانب نہیں گیا تھا۔ اور پھر وہاں انسپکٹر کی حیثیت سے جانے پر حالات دوسری نوعیت کے ہوں گے۔ اس سوچ بچار کے بعد میں نے چاروں کی چھٹی لی اور رام گڑھ کی جانب ایک عزم اور اعتماد کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس طرح میں اس علاقے سے واقفیت معلوم کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ اجنبی نہ رہے۔

میں ایک سادھو کے بھیس میں رام گڑھ پہنچا تا کہ مجھے کوئی پہچان نہ سکے۔ رام گڑھ کے تھانے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور ایک ہولناک سناٹا کسی آسیب کی طرح مسلط تھا۔ ماحول نہ صرف بڑا پر اسرار اور دہشت ناک تھا بلکہ نحوست زدہ تھا۔ گشت پر مامور سپاہی بو جھل قدموں سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس سپاہی نے مجھے تیز لہجے میں وارننگ دی۔

”سادھو مہاراج۔۔۔! جان کی خیر چاہتے ہو تو اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”وہ کس لئے۔۔۔؟“ میں نے سوال کیا۔ ”میں ایک سادھو ہوں۔ چوری کی نیت سے تھوڑی آیا ہوں۔“ ”اس لئے کہ پدمنی کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو وہ تمہیں جلادینے میں پل بھر کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔ وہ بڑے ظالم اور سفاک ہیں۔“

میری بات سن کر اس نے خوف ظاہر کرتے ہوئے حیر سے کہا تھا۔

”کیوں جلادیں گے حوالدار جی۔۔۔؟ ہم ٹھہرے سادھو سنیا سی۔۔۔! نہ کسی کے لینے میں اور نہ ہی کسی کے دینے میں۔۔۔۔۔ نہ ہی اس کے دشمنوں میں۔۔۔۔۔ اور نہ ہی اہلکاروں میں۔۔۔۔۔ ان سنسار میں سادھو سنسیا سی سب سے بے ضرر ہوتے ہیں۔“

سپاہی خوف زدہ آواز میں دھیرے سے میرے کان کے پاس منہ لا کے بڑبڑایا۔

”سادھو ہو یا سنیا سی۔۔۔! اگر اس نے دیکھ لیا تو پاؤں کے انگوٹھے سے ماتھے پر بنا ہوا چندن کا کلک پونچھ دے گی۔۔۔۔۔ پدمنی کے ڈر اور خوف سے یہاں میلوں تک کوئی سادھو سنیا سی دکھائی نہیں دیتے۔۔۔۔۔ اگر جان پیاری ہے تو اٹھ لٹے قدموں لوٹ جاؤ۔۔۔۔۔ ورنہ ایسی مٹی خراب ہوگی کہ سارا کرم دھرم دھرارہ جائے گا۔“

میں آگے بڑھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ مشرق کی طرف پہاڑیوں میں کہیں پدمنی کا گروہ کہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اگر پدمنی نے ڈیرا بھمایا ہوا ہے تو اس کے اڈے کا کچھ سراغ مل سکے گا۔ میں کسی صورت میں ہمت ہارنا نہیں چاہتا تھا۔

ادھر کے آنے جانے والے لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ادھر نہ جائے۔ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟ میں نہ رکا تو لوگ سمجھے کہ کوئی پاگل سادھو ہے۔ جو جان بوجھ کے موت کے منہ میں جانا چاہتا ہے۔ لہذا اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

میں پہاڑیوں کے پاس ایک جنگلی پہاڑی کے

جانتا تھا کہ اگر میں نے زور زور سے سانس لی تو مجھے کچا چبا جائے گا۔

مگر وہ کس سمت سے آیا تھا یہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز کافی دور ہو گئی۔ میں نے چند لمحوں کے بعد تب اس راستے پر بڑھا۔

ابھی میں دو ایک فرلانگ ہی چلا تھا کہ محسوس ہوا کہ آگے راستہ خاصا تنگ ہے۔ دائیں طرف گہری کھائیاں تھیں۔۔۔۔۔ ذرا بھی قدم ڈگمگائے دھڑام سے نیچے جاتا۔۔۔۔۔ بائیں طرف کی اگی ہوئی جنگلی گھاس پکڑ کے میں سیدھے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح لہولہاں ہو رہے تھے۔ میں نہ جانے کب تک آگے بڑھتا رہا، چاروں طرف گہری خاموشی طاری تھی۔ جیسے گھروں کی چھن چھن کی آواز کے درمیان ایک دوسرا مجھے ایسا لگا کہ اب میں گراتب گرا لیکن میں گرائیں۔۔۔۔۔ میں جسم میں کافی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے دو چار راتیں کچھ کھائے بغیر بھی یوں ہی چل سکتا تھا۔ مگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا شروع ہی میں عدم آباد چلا جاتا۔

ایک جگہ رک کر میں نے گہرا سانس لیا اور چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔۔ پہاڑیوں اور جنگلی درختوں کے سوا کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ سائیں سائیں اور جھن جھن کی آواز کے سچ مجھے ایسا لگا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔

مجھے نیچے والے راستے کی جانب جانا چاہیے تھا۔ اب واپس لوٹنے کے تصور سے ہی میرے پاؤں لرز گئے تھے لیکن آگے بڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لہذا ہر صورت پیچھے ہٹنا تھا۔۔۔۔۔ مجھے نیچے دائیں طرف پہلے کی نسبت راستہ کچھ صاف نظر آیا تو میں نے چین کا سانس لیا۔

آگے بائیں طرف پھر ایک راستہ مڑتا تھا اس بار میں سوچے بغیر مڑ گیا۔ جب بھگتنا ہی ہے تو ہر موڑ پر کیوں نہ مڑ جاؤں۔

جیسے دھرتا مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ سوچ کر فیصلہ کیا تھا کہ اگر مجھے پدنی کے آدمی پکڑ کے لے گئے تو میں ان کا اڈا دیکھ سکوں گا۔ دیکھتے ہی دیکھے شام جھک آئی اور پھر اندھیرے کی گہری چادر نے پہاڑوں کے ننگے پن کو چھپا لیا۔

رات کی گہری خاموشی کے آغوش میں مجھے محسوس ہوا کہ میں لاکھ ہمت کا آدمی کی اور جسم میں کافی طاقت اور بھرپور توانائی تھی۔۔۔۔۔ میں بیک وقت چار بد معاشوں سے مقابلہ کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ ماضی میں چھ سات خطرناک مجرموں سے جو مسلح تھے ان سے نہتہ مقابلہ کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جاتا تھا میرے دل کے کسی کونے میں خوف کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا تھا۔

میں نے ایک اونچتی نظر چاروں طرف ڈالی تو میرے سارے بدن میں کچک کچک دوڑ گئی۔

دور دور تک آدم نہ آدم زاد۔۔۔۔۔ ٹن۔۔۔۔۔ دور تھانے کے گھنٹے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ آٹھ بن چکے تھے۔

ایک لمحے کے لئے میرے جی میں آیا کہ کیوں نہ میں بھاگ جاؤں۔ لیکن دوسرے لمحے ہمت بندھی کہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟ اچانک آس پاس کی گھسی جھڑیاں موت کی گہری نیند سے جاگ اٹھیں۔

بہت سے قدموں کی آواز اور دھمک بڑی تیزی سے میری طرف بڑھتی آرہی تھی۔ میں نے خود کو اچھی طرح سے ایک جھاڑی کے عقب میں چھپا لیا۔ وہ تقریباً بیس آدمیوں کا گروہ تھا۔ آگے والا آدمی اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا۔

”گھوڑے تیار ہیں نا۔۔۔۔۔؟“

جواب دیا گیا۔۔۔۔۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ دو فرلانگ باغ میں سب تیار کھڑے ہیں۔“

میں ام سادھے سب کچھ دیکھتا رہتا رہا۔

ایک میل سے زیادہ چلنے کے بعد کچھ دور مجھے روشنی دکھائی تو میری جان میں جان آئی کہ میری محنت اور جستجو اکارت نہیں گئی۔ میرا حوصلہ بڑھا کہ میری منزل سامنے ہے اور اب وہ دو گام پر موجود ہے۔ پھر بھی نے روشنی کی سمت قدم بڑھایا۔ دو قدم طے کئے تھے کہ ہی کہ کپٹنی پے پاس سے زن سے ایک گولی سنسنائی نکل گئی۔ جب تک میں کچھ سمجھ پاتا کہ گولی کس سمت سے آئی ہے۔ ایک ساتھ کئی آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور دیوچ لیا اور قابو میں کر کے بے بس کر دیا جس سے میں بظاہر کائی شیشیا، ان کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے، میں نے کوئی مزاحمت اس لئے نہیں کی تھی کہ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ مجھے اٹھا کے لے جائیں تاکہ میں ان کے سرغنہ کو دیکھ سکوں جو کسی رانی کی طرح اپنی ریاست قائم کئے ہوئے ہے۔

جب میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو سامنے ہی ایک بہت خوب صورت بڑی تمکنت، شان سے اور باوقار انداز سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحے میں ناقدانہ نظروں سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے لیا۔ اس میں بڑا بدبہ بھی تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کتنی خوب صورت ہے۔ وہ اتنی خوب صورت ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چائے کیوں یقین نہیں آیا اور یقین آنے والی بات ہی تھی کہ کیا اتنی حسین و جمیل پرشیا ب گدا بدن اور اس قدر بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں والی عورت اتنی سنگ دل بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جتنی نازک اندام لگ رہی ہے اس کے سینے میں بھی ایسا ہی نرم و نازک دل ہوتا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ اس کے برعکس تھا۔ وہ اس کی ضد تھی وہ ایک پتھر عورت تھی۔ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس کے متاثر کن سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے نشیب و فراز بیجان خیز تھے۔ بجلی بھر بدن تھا کہ شعلہ بنا ہوا تھا۔ پھر میں گزر گیا۔

”یہ لوگ مجھے یہاں کیوں اور کس لئے لائے ہیں۔ میں سادہ و سست آدمی ہوں۔“

وہ گرج اٹھی۔ بجلی کی طرح کڑکی اس کے چہرے پر درندگی اور حقارت ابھرائی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور بولی۔

”بکو اس بند کرو۔۔۔۔۔ کینے آدمی۔۔۔“ پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ ”خشونت سنگھ۔۔۔! نیچا کرو اس کا سر۔۔۔ دیکھو کس طرح اکڑ کے اور رعوت سے اس طرح بات کر رہا ہے۔ جیسے یہ علاقہ اس کے باپ کا ہو۔“

نفرت اور غصے سے اس کا چہرہ جتنا سرخ ہوا وہ اتنا ہی حسین نظر آیا۔ میں اس ایک بل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ عورت اگر قلم نگری میں جانی تو تہلکہ مچا دیتی۔۔۔ اس کا حسن و شباب اور گداز بدن کی قیادتیں تماشا بیوں کے دلوں پر بجلیاں گراتیں۔ وہ دلوں پر راج کرتی، ہندوستان اور بنگال میں اس کا طوطی بولتا۔۔۔ یا پھر وہ کسی شخص کی جیون ساتھی بنتی تو وہ دنیا کا سب سے بہت خوش قسمت ترین شخص ہوتا اور اس کے نصیب چاک جاتے۔۔۔ لیکن نجانے کیوں وہ ایک ڈاکو عورت بن گئی۔۔۔؟ آج تک، اب تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ڈاکو بننے کا پس منظر کیا ہے۔؟ اس کی زندگی اب تک ایک راز اور سحر بنی ہوئی تھی۔

میں ان سوچوں میں غلطیاں تھا کہ خشونت سنگھ نے مجھے کسی پہلو ان کی طرح اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا، جیسے میں کوئی پلاسٹک کا کھلو ہوں۔ پھر اس نے میری تلاش لی۔ جب میں نے اس کے بعد اٹھنے کی کوشش کی تو پدھنی نے آگے بڑھ کر میرے سینے پر ایک لات رسید کی۔۔۔ پھر جھپٹ کے اس نے اپنے دائیں پاؤں سے میرے ماتھے کا تنک مٹاتے ہوئے کہا۔

”خشونت سنگھ۔۔۔! اس کا ہاتھ داغ دو۔۔۔“

ایک موٹی سی لوہے کی گرم سلاخ میرے ہاتھ کے پاس لائی گئی۔

اس دہکتی ہوئی سرخ سلاخ کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں ایک انتہائی قوت برداشت کا مالک تھا لیکن پولیس کی ملازمت کے دوران میں نے کبھی ایسا

گاتے ہوئے جیون بیت گیا۔ لیکن دوسرے کی نیند خراب کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔ نیند سے پیاری چیز سنسار میں کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک طرح کی دولت ہے جو جانے کتنے سارے لوگوں کو نصیب نہیں ہے۔ لوگ اسے لانے کے لئے جانے کیا کیا جتن کرتے اور دوائیاں تک کھاتے ہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو سادھو مہاراج۔۔۔۔۔!“ ان میں سے دوسرا بولا۔ ”دوسرا یہاں کون ہے۔۔۔۔۔ ہم لوگوں کے سوا۔۔۔۔۔ بس اب تم شروع کر دو۔۔۔۔۔ رانی جی۔۔۔۔۔ دو تین گھنٹے سے پہلے آنے کی تمہیں۔۔۔۔۔ تم ان کی چھتا نہ کرو۔“

میرے دماغ میں برق رفتاری سے یہ بات آئی کہ پدمنی کے آنے پر یہ لوگ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر مجھے وہاں پہنچا دیں گے جس جگہ میں سوجھا تھا۔ میں یہاں زندگی بھر نہیں پہنچ سکتا۔

وہاں سے اڑے تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیوں کہ انتہائی پکڑدار اور پیچیدہ راستے تھے۔ کسی خاص وقت کا انتظار کرنا میں نے کبھی نہیں سیکھا۔ میں جانتا تھا کہ خطرناک کام خود کو خطرے میں آ لے بغیر پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا جسم درد اور تسکین سے چور چور تھا۔ جوڑ جوڑ بری طرح درد کر رہا تھا۔ ان ڈاکوؤں نے میری ٹھیک ٹھاک کا طرہ داریت کر دی تھی۔ زندگی میں پہلی بار میری ایسی خاطر ہوئی تھی۔

پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ میں ان دونوں پر آسانی سے قابو پا لوں گا۔ میرے لئے ناممکن نہیں ہوگا۔ چند لمحوں قبل بھی میں نے یہی سوچا تھا۔

میرے ذہن نے اس لمحے برق رفتاری سے ایک بے عیب منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

میرے سامنے ایک تدبیر تو یہ تھی کہ ایک ڈاکو کو ترک پہنچا دوں اور دوسرے کو گائیڈ بنا کر راستہ معلوم کیا جائے۔۔۔۔۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اس کے فرشتے بھی میری رہنمائی کرنے پر تیار اور مجبور ہو جائیں گے۔ اس منصوبے پر عمل کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔

میں نے اپنے منصوبے کا جائزہ لینے کے بعد ان دونوں ڈاکوؤں کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ ان میں ایک بہت زیادہ بگڑا تھا۔ کسی گینڈے کی طرح۔۔۔۔۔ میں نے اس بگڑے سے کہا۔

”میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ صبح سے بھوکا پیاسا ہوں۔۔۔۔۔ اگر تھوڑا پانی مل جائے تو حلق تر کر لوں۔۔۔۔۔ پانی میرے لئے کسی امرت پانی سے کم نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ میں پھر پانی کے بھجن شروع کر دوں گا۔“

مجھے امید نہیں تھی کہ ایک گھونٹ پانی بھی پینے کو مل جائے گا۔۔۔۔۔ کیوں کہ میرے سامنے ہی پدمنی یہ حکم صادر کر گئی تھی کہ اس قیدی کو ایک قطرہ بھی پانی کا پیٹنے کے لئے نہ دیا جائے۔ اسے بھوکا پیاسا مارتا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ یہ ایک موذی سانپ ہے۔“

اس حکم کے برعکس ہی وہ فوراً ہی پانی لینے چلا گیا۔ میرے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا اور ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھانے سے پل بھر کی تاخیر نہیں کی۔

اس کے لوٹنے تک میں نے دوسرے ڈاکو پر آسانی سے قابو پا لیا اور اسے ترک میں پہنچا دیا۔ میں اس کا ٹیٹو ادا چکا تھا اور اس کی لاش دیوار سے لگا دی تھی۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ میرے جانی دشمنوں میں سے تھا۔

جیسے ہی اس کا ساتھ پانی لے کر اندر آیا تو میں نے ترختے لہجے میں کہا۔

”خبردار۔۔۔۔۔ جو تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔۔۔۔۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

وہ ڈاکو بھونپکا ہو کے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ کوندا بن کر اپنی بندوق کی طرف لپکا۔ میں نے اسے بندوق پر جھپٹنے نہیں دیا۔ کیوں کہ میں نے مقتول کی بندوق اٹھا رکھی تھی۔ جب میں نے بندوق کی نال اس کے سینے میں گاڑ دی تو وہ بہت کسمپایا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے کوئی اور چیز مزاحمت کے لئے تلاش کر رہا ہو۔ لیکن میں نے اسے بہت مہلت اور موقع

کر رہا تھا کہ کب پدمنی اور اس کے ساتھیوں کی آہٹ
ہو اور وہ گولیاں برسائیں۔ انسپکٹر نے سرگوشی میں کہا۔
”شاید وہ لوگ خطرے کی بو پا کر واپس اپنے
اڈے پر پہنچ گئے ہوں۔“

میں ایک لمحے کے لئے الجھن میں پڑ گیا۔
اگر ایسا ہوا تو پدمنی کو گرفتار کرنا آسان نہ ہوگا۔ ایک بار تو
میرا جی چاہا کہ اس کے اڈے تک جا کر دیکھوں کہ کہیں
وہ پوگلی کو چھڑا کے واپس تو نہیں پہنچ گئی۔۔۔۔۔؟

اس وقت قریب سے ایک آواز آتی ہوئی محسوس
ہوئی۔ اس نے دھیمے سے سرگوشی میں کہا۔ ”ہوشیار۔۔۔۔۔“
پوگلی کو چھڑانے کے لئے چلتے وقت پدمنی نے
شگون لیا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ سے ایک چوٹی کاٹی
اور پراچھالی تھی اور دائیں ہاتھ سے چوٹی کا نشانہ لیا تھا۔
تب دلا اور نے کہا تھا۔۔۔۔۔ ”رائی جی۔۔۔۔۔! شگون
اچھا ہے۔ ہم پوگلی کو بخیریت چھڑا لائیں گے۔“
پدمنی نے قاتحانہ انداز اور تمکنت سے ریو اور کو
چومتے ہوئے کہا تھا۔

”پدمنی کا شگون آج تک کبھی خراب نہیں ہوا۔
آج بھی نہیں ہوگا۔“ اس نے سینہ تان لیا تھا۔
اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ بڑھ کے پدمنی کے
خوب صورت، سر میں، سڈول اور گداڑ ہاتھوں کو چوم
لو۔۔۔ اس کا نشانہ بھی کم اچھا نہیں تھا۔

پھر بھی ایک ہاتھ سے سکہ فضا میں اچھل کے
دوسرے ہاتھ سے نشانہ لینا دشواری نہیں ناممکن تھا۔
شاید وہ لوگ ہم سے صرف دس قدم کی دوری پر
تھے۔ آگے پدمنی۔۔۔ پھر دلا اور۔۔۔۔۔!

اس نے فائر کیا۔۔۔ فوراً ہی دھائیں کی آواز
کے ساتھ ایک گولی میری بائیں ران میں لگی۔
پدمنی نور انڈیائی انداز میں چیخا۔ ایسا لگا جیسے
بجلی کڑکی ہو۔

”کر مو۔۔۔۔۔! ناور۔۔۔ دیکھتے کیا ہو۔۔۔۔۔ مشین
گن چلاؤ۔۔۔۔۔ بھون دوان کتوں کو۔۔۔ ایک بھی زندہ نہ

نہیں دیا۔ باہر لے آیا۔
میں اسے بندوق کی زد پر لے کر رام گڑھ کی
چوکی پر پہنچا۔ انسپکٹر مہاراج سنگھ کو مختصر اتمام بات بتا کے
اس سے اس کی موٹر سائیکل لی اور ڈاکو کو اس کے حوالے
کیا۔ پھر اس ڈاکو کے چار ہاتھ ایسے لگائے کہ اسے چھٹی
کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ کیوں کہ اس نے مجھے قابو میں
کر کے میری خوب درگت بنائی تھی۔ میں نے اس کی
حالت نامگفتہ بہ کر دی اور پھر میں نے کہا۔

”میرے دل کے ارمان نہیں نکلے۔۔۔۔۔ وہ ادھار
رہے۔ واپسی پر تمہاری خوب خاطر مدارت کروں گا۔“
شہر تقریباً چالیس میل دور تھا۔ مگر سڑک بالکل
سنسان، ویان اور خالی پڑی تھی۔ اس لئے میں جلدی
شہر پہنچ گئی۔ اس سڑک پر صبح کا اجالا پھیلنے تک مال بردار
ٹرک اور بیل گاڑیاں رسد اور آڑتیوں کا اٹاج لے کر
گزر رہی تھیں جس سے آمدورفت دشوار ہو جاتی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اس سے اچھا اور سنہرا موقع
زندگی میں کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ اگر پدمنی اپنے اڈے پر
پہنچ گیا تو سب کچھ دھوا رہ جائے گا۔ کف افسوس ملنا تو
دور کی بات ہوگی۔ جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس
کے نزدیک میں کسی موذی سانپ سے کم نہیں ہوں۔ وہ
سانپ کی طرح میرا سر کچل کر رکھ دے گی۔

میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد منصوبہ بنایا کہ
پدمنی جیسے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ رام گڑھ پولیس
چوکی سے اپنے ساتھی پوگلی کو چھڑا کے لے جائے گی
پچاس آدمی اس جگہ سے اس پر ٹوٹ پڑیں گے جہاں
سے راستہ اندر کی طرف مڑتا تھا۔ وہاں پدمنی آسانی
سے قابو میں آ سکتی تھی۔

شہر پہنچتے ہی میں نے اپنا منصوبہ بنایا اور دستی
گولوں اور مشین گنوں سے مسلح نوجوانوں کو ساتھ لے کر
رام گڑھ لوٹ آیا۔

پھر میں نے بغیر کسی تاخیر کے منصوبے کے
مطابق سب کو راستوں پر تعینات کر دیا تھا کہ کہیں سے
ڈاکوؤں کا گروہ نکل نہ جائے۔ میں سانس روکے انتظار

44

نے اے سمجھایا۔

Nov 2016

”دیکھو پدمنی! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں مانتا ہوں کہ تو بہت بہادر ہے۔ تیری بہادری کا نشان میری ران پر موجود ہے۔ لیکن تو گھڑی بھر کے لئے عورت بن کے سوچ۔ کیا یہ سب کام عورتوں کے ہیں۔ کیا ایک عورت کو زیب دیتا ہے۔؟ اس وقت تو نہ لڑ کے کون کب تک بچ سکتا ہے۔؟ اس وقت تو نہ ڈاکوؤں کی سردار ہے اور نہ میں پولیس انسپکٹر۔؟ ہم دونوں محض معمولی انسان ہیں۔۔۔ جنہیں اس وقت ایک دوسرے کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ تیری زندگی یا میری موت لوگوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمارا نام ہی کیا ہے۔؟ ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔۔۔ لیکن انسانیت کے تاتے ایک عورت کو میں اتنی خنڈ میں بھیگا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ انسپکٹر ہوں تو کیا۔ پہلے انسان ہوں۔۔۔ تو بھی پہلے انسان ہے۔ ایک عورت بعد میں کچھ اور۔“

پھر میں نے پدمنی کے دونوں برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

”یہاں قریب ہی کوئی ایسی جگہ ہوگی کہ سردی سے بچا جاسکے۔؟“

میں نے دیکھا کہ پدمنی میں اب پہلی جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے سہارا دے کر پاس ہی ایک کھنڈر نما مندر میں لے گئی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اس گہری خاموشی کے دوران میں نے محسوس کیا سردی زیادہ لگ رہی ہے۔ ایک نوکیلے کپڑے اور بچ بستہ ہوا۔۔۔ پدمنی تھر تھر اس طرح کانپ رہی تھی جیسے ملیسریا کا جاڑا لگ رہا ہو۔ نمونیہ ہو جانے کا خطرہ تھا اور ہم دونوں سردی کی تاب نہ لا کر مر بھی سکتے تھے۔

اب اس وقت سب سے بڑا سنگین اور پہلا مسئلہ یہ تھا کہ سردی سے کس طرح اور کیوں کر اور کیسے بچا جائے؟ معلوم نہیں کتنی دیر تک یہاں اس حالت میں رہنا ہوگا۔ تھوڑی دیر کی بات ہوتی برداشت کر لی جاتی۔ اب اس سرد موسم اور ٹھنڈے پانی میں تیر کے جانا بس کی

بات نہیں تھی۔ پانچ سات منٹ بھی تیر انہیں چا سکتا تھا اور پھر آس پاس کوئی بستی یا ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جو قریب ہو اور پناہ لی جاسکے۔

میں نے تو خود سردی سے ٹھنڈے کے مرنا چاہتا تھا اور نہ ہی پدمنی کو کسی قیمت پر مرنے دینا چاہتا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ قانون کی مجرم تھی۔ اب معاملہ قانون اور فرض شناسی کا نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تھا۔ نہ صرف انسانیت بلکہ قانون کا بھی تقاضا تھا کہ اس کی جان کی حفاظت کروں۔ کیوں کہ اب وہ ایک طرح سے میری حراست میں تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو یہ میری مالی اور غیر ذمے داری تھی۔

میری جیب میں جو مچس تھی وہ بھیگ چکی تھی۔ اب آگ جلا نا تھی تاکہ ہم تپ سکیں۔ یہ ہی ایک ایسی صورت تھی جس سے سردی اور موت سے بچا جاسکتا تھا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا تو میں سامنے والے کمرے میں گیا شاید کوئی چادر یا لباس مل جائے۔ ستاروں کی روشنی میں ایک چادر اور چار پائی نظر آئی۔ یہ چار پائی اتنی بڑی تھی کہ اس میں صرف ایک آدمی سوا لیت سکتا تھا۔ چادر گرد و غبار سے آٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے خوب اچھی طرح جھاڑا۔ پھر اس سے چار پائی صاف کی۔ یہ کماہ اور اس کی چھت بھی قدرے منددش ہی تھی۔ کمرہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ میں نے فوراً ہی باہر آ کر دیکھا۔ پدمنی سردی سے کانپ رہی تھی اور سکڑ سٹ کے گھڑی بنی ہوئی تھی۔ اس کی حالت سردی نے غیر کردی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں جانے کتنے مردوں سے مقابلہ کیا لیکن اس نے سردی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

میں نے لکڑیاں چنیں اور گھاس زمین سے نکالنے لگا۔ پدمنی نے میری مدد کی۔ اور پھر میں بڑے بڑے پہاڑی پتھر تلاش کئے۔ پھر کمرے میں آ کر لکڑیوں پر گھاس پھوس ڈال کے پتھروں کو آپس میں کئی بار رگڑا۔ گھاس پھوس نے جلدی آگ پکڑ لی۔

”دیکھو پدمنی! تم ایک عورت ہو۔۔۔ لاگھ کیسی بھی سہی۔ بہتر ہے کہ تم کپڑے نکال کے انہیں

اچھی طرح سے نچوڑ کے پہن لو۔ اس سے پہلے اس چادر سے نہ صرف بال بلکہ جسم بھی اچھی طرح خشک کر لو۔ اس طرح سردی نہیں لگے گی۔ میں کمرے سے باہر جا کر اپنے کپڑے نچوڑ لیتا ہوں۔ مجھ پر بس اس کرو۔ میں نہ تو تمہیں بے لباس دیکھوں گا اور نہ فائدہ اٹھاؤں گا۔“

پھر میں اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو دیکھا تو وہ آگ کے پاس بیٹھی آگ تپ رہی ہے۔ اس کا لباس بدن سے چپک کر اسے بے لباس کر رہا تھا۔ وہ چارپائی آگ کے قریب کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت شعلہ جسم بنی ہوئی تھی۔ اس کا حسن و شباب اور نکھر گیا تھا اور جسم کی شادابیاں، رعنائیاں اور قیاسیں جیسے جاگ اٹھی تھیں، اس کے چہرے کا رنگ نکھر گیا تھا۔ وہ بے خوف اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔

میں چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ گیا لیکن فاصلہ رکھا تو وہ بولی۔

”مجھے تو تم پر بس اس ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا تم واقعی پولیس کے آدمی ہو۔؟“

”کیوں۔۔۔ کیا پولیس آدمی نہیں ہوتے ہیں۔؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”شاید ہوتے ہوں۔ لیکن ان میں کالی بھیڑیں اور ورنہ صفت اور بھیڑیے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔“

”یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہی ہو۔؟“ تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”پولیس جب کسی بے گناہ کو پکڑتی ہے۔۔۔ اس کی ماں، بیٹی، بہن اور بہو جب اس کی بے گناہی کا یقین دلانے اور ضمانت دینے گئیں تو تھانوں میں ان کے ساتھ زیادتی کی گئی۔“ وہ زہرناک لہجے میں بولی۔

”میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔۔۔ ایسا

ہوتا ہے۔۔۔ ہندوستان اور بنگال میں ہر دس منٹ میں ایک لڑکی اور عورت آبروریزی کا نشانہ بنتی ہے۔ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اور بھی بھیڑیا صفت کے ہاتھوں، قانون بے بس ہے۔۔۔ اس میں لڑکیوں اور عورتوں کا بھی دوش ہوتا ہے۔۔۔ وہ اس حالت میں نکلتی ہیں اور ایسا لباس پہنتی ہیں کہ بے لباس معلوم دیتی ہیں۔ جس سے برائیاں جنم لیتی ہیں۔“

پدمنی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کے درمیان گہری خاموشی کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ پھر میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”پدمنی۔۔۔ عورت تو بڑی مہربان اور محبت والی ہوتی ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔ ماں۔۔۔ بہن اور بیٹی۔۔۔ پھر تو آخر ایسی کیوں ہو گئی۔۔۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

پدمنی جو کسی گہری سوچ میں غرق تھی اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بڑبڑائی۔

”ماں۔۔۔ بہن اور بیٹی۔۔۔ بیوی۔۔۔ لیکن عورت ان میں سے کچھ نہ ہو تو دنیا اسے بدن بیچنے والی طوائف بنا دیتی ہے۔۔۔ پدمنی وہ بھی بن چکی ہے۔۔۔ معلوم نہیں کیوں ایشور نے عورت کو اتنا حسین اور دلکش اور پرکشش اور بیجان خیز بنا دیا کہ مرد بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔۔۔ گدھ بن جاتے ہیں تب وہ ماں، بہن اور بیٹی کے مقدس رشتوں کو بھول جاتا ہے۔۔۔ پامال کر دیتا ہے۔۔۔ اور ٹھاکر۔۔۔؟ تو نا ہوا انسان اس سے اچھا نہیں بن سکتا جو پدمنی بنی ہے۔ کیا بنی ہے۔۔۔ مرد یہ بات بھول جاتا ہے کہ جب کوئی عورت انتقام لینے پر تل جاتی ہے تو پھر وہ کسی مرد کو ہرگز ہرگز نہیں بخشے گی اور رحم کھاتی ہے۔۔۔ میرے انتقام کے اندر سے جنون نے بھی کسی مرد پر رحم نہیں کھایا۔۔۔؟ اس لئے کہ وہ رحم کے قائل نہیں ہوتا ہے۔“

پدمنی ایک لمبے کے لئے رک گئی جیسے کسی گہری کک نے اس کے اندر کر دیا ہو۔

اب اس کی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں تشدد

نہیں تھا بلکہ دردِ جھانک رہا تھا۔۔۔۔۔ درو کا کبرا مندر۔۔۔۔۔
اور چہرے پر کرب ابھرا آیا۔

میں نے اپنا ہاتھ پدمنی کے سر پر رکھ کے تسلی دی۔ اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کسمائی بھی نہیں۔۔۔۔۔ اس نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ میں اس بہانے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کر لوں گا۔ چہرے پر جھک جاؤں گا۔ ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ اگر میں پیش قدمی کرتا تو شاید تعرض نہ کرتی۔۔۔۔۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود سپردگی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے گی۔

”پدمنی۔۔۔۔۔! بہادر انسان ہی بہادر کی قدر کرتا ہے۔ عزت کرنا جانتا ہے۔۔۔۔۔ تو مجھے اسپیکر نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ ایک معمولی انسان سمجھ کے صرف اتنا بتا دے کہ کچھ اور کیوں نہیں بنی۔۔۔۔۔؟“

”اور کچھ۔۔۔۔۔؟“ پدمنی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ ”سنوٹھا کر۔۔۔۔۔! میں تمہیں بہت دور لئے چلتی ہوں۔۔۔۔۔ یہاں سے اڑتالیس چپاس میل دور۔۔۔۔۔ رانی پور۔۔۔۔۔ اب تو صرف اس کا نام رہ گیا ہے۔۔۔۔۔ آج سے چندرہ برس قبل میں وہاں تھی۔۔۔۔۔ جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو رانی پور میں پایا۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔۔۔؟ کہاں سے اور کیسے اس مندر میں پہنچی۔۔۔۔۔ اس کے متعلق بہت سارے قصے سنے۔۔۔۔۔ لوگ کہتے تھے کہ میں کسی کنواری لڑکی کا پاپ ہوں۔۔۔۔۔ جسے وہ دنیا کے ذرے سے چیتھڑے میں لپیٹ کے مندر کے پچھواڑے چھوڑ گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ محبت کے اندھے جنون میں دھوکا کھا کے اپنا سب کچھ ہار گئی۔۔۔۔۔ دوسری صبح مندر کے پجاری شرما آتند نے مجھے دیکھا تو اسے میری سندرتا پر بڑا پیار آیا اور وہ مجھے اٹھا کے لے آیا اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا۔ دھیرے دھیرے میں بڑی ہوتی گئی اور ایسے پجاری کا پیار بھی بڑھتا گیا۔ چاہت میں ایسی شدت تھی جیسے میں اس کی سگی اولاد ہوں۔ وہ میرے گھنے ریشمی سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔

”پدمنی۔۔۔۔۔! تو ایک دیوی معلوم ہوتی ہے۔

ایک دم رادھا کا روپ ہے۔۔۔۔۔“

میں کبھی کبھی تنہائی میں کرشن کی مورتی آگے کھڑی ہو کر سوچتی اور دل میں کہتی۔
”کاش۔۔۔۔۔! میں سچ سچ کی رادھا ہوتی۔۔۔۔۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔۔۔۔۔“

لوگ کہتے تھے کہ پجاری شرما آتند کے پاس ایسا کوئی منتر ہے جس سے ہاتھ عورتوں کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا، ہفتے میں ایک دن ہاتھ عورتوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی۔۔۔۔۔ ان میں چندرہ سولہ برس کی بھی ہوتیں۔ نہایت حسین، سبک اندام اور جوانی سے بھرپور۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایسی عورتیں بھی جن کے انگ انگ سے مستی اٹلی پڑتی۔۔۔۔۔ ریلے اور بچے پھل کی مانند۔۔۔۔۔ انہیں اولاد کی بڑی تمنا ہوتی تھی جو تندرست پجاری کے پاس سمجھ لاتی۔

پھر کافی دیر تک بھیجن کے بعد پجاری آتند شرما ایک نہایت حسین اور دلکش عورت کو چنتے اس پر گنجا جل چھڑک کر اسے ساتھ والے کمرے میں لے جاتے۔۔۔۔۔ باہر کی عورتیں بھیجن میں گمن ہو جاتیں۔

مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب اور پراسرار سا لگتا۔ میں بڑی سنسنی خیز محسوس کرتی اور میرا تجسس بیدار ہو جاتا۔

”تم کیا محسوس کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟ تم بڑی خوش نصیب ہو۔ تم جلد ہی ماں بن جاؤ گی۔۔۔۔۔“ پجاری کہتے ہیں۔

ایک دن میرے تجسس اور اشتیاق نے اکسایا تو میں نے فیصلہ کیا کہ دیکھوں تو کسی پجاری کون سا ایسا منتر پڑھ کے پھونکتے ہیں جب وہ باہر آتی ہے تو اس پر نہ صرف سرشاری طاری ہوتی ہے بلکہ اس پر خمار چھایا ہوا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک دن میں نے چھپ کر اندر جھانکا۔۔۔۔۔ پجاری جی اور ساتھ والی عورت کو باہم پیوست پایا۔۔۔۔۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا یہ دونوں جانوروں کی سی حالت میں کیوں ہو جاتے

ہیں۔۔۔۔۔ پھر میں دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے لگی۔ مجھے عجیب احساس ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ میری ایک ایسی عورت سے دوستی ہو گئی جو ماں بننے کے لئے بے چین تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لئے ناقابل یقین اور حیرت انگیز تھا۔ اس نے بتایا کہ بنارس، کارشی اور متھرا کے مندروں میں بھی یہی ہوتا ہے۔

سردیوں کی ایک اندھیری رات تھی۔ میں نو جوانی کی دلہیز پار کر چکی تھی اور شباب کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ سولہ برس کی ہو گئی تھی جس کا احساس اور خیال ہی نہیں ہوا تھا۔ حالاں کہ مجھ میں جسمانی تبدیلیاں غیر محسوس انداز سے ہوئی تھیں اور نشوونما بھی۔۔۔۔۔

میں کوٹھری بند کئے سوچ رہی تھی کل پجاری کس عورت کو ساتھ لے جائیں گے۔۔۔۔۔ پھر وہی کھیل ہو گا۔۔۔۔۔ جو ایک عرصے سے کھیلا جا رہا ہے۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ جب تک میں بکھرے بال اور لباس درست کر کے دروازے پر پہنچتی۔ پجاری جی اندر کھس آئے۔ ایک بار انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور پھر شائستہ آواز میں بولے۔

”پدمنی۔۔۔۔۔! چل مندر میں۔۔۔۔۔ آج بائکے پجاری تجھ پر مہربان ہیں۔۔۔۔۔ تجھے مندر میں بلا یا ہے۔“ میں ان کے ساتھ مندر میں آ گئی۔۔۔۔۔ پجاری جی نے مندر کے دروازے سے مستبوطی سے اچھی طرح سے بند کئے۔ پھر میرے پاس آ کر بولے۔

”تو رادھا بننا چاہتی ہے نا۔۔۔۔۔؟ او دیکھ۔۔۔۔۔ خوب دھیان سے دیکھ۔۔۔۔۔ بائکے مسکرارہے ہیں تیری سوا سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آج وہ خود حاضر ہوں گے۔۔۔۔۔“

میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دی۔۔۔۔۔ انہوں نے ہون کنڈ میں ایک منہمی مال گری ڈالی۔۔۔۔۔ چاروں طرف ایک عجیب۔۔۔۔۔ میٹھی میٹھی بو ہوا میں بھرنے لگی۔ میری آنکھیں چمکنے لگیں۔۔۔۔۔ انہوں نے میری

کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”جے پر بھو کی۔۔۔۔۔ دیکھ پدمنی۔۔۔۔۔! بائکے تیرے پتی ہیں۔۔۔۔۔ تیرا من تن سب ان کا ہے۔۔۔۔۔ میں تو پر بھو کا سیوک ہوں۔۔۔۔۔ اس وقت پر بھو مجھ میں سمائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ تجھ سے میرے روپ میں ملنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر تو نے ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈالی تو جانتی ہے۔۔۔۔۔ کوڑھی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ بدن کا ہر حصہ گل سڑ کے گر جائے گا۔ سوچ لے۔۔۔۔۔“

میں نے جواب دیا کہ ”میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گی۔۔۔۔۔“ پھر جو نہیں ہونا تھا وہ ہوتا رہا۔

ایک دن۔۔۔۔۔ دو دن۔۔۔۔۔ بائکے مہربان ہوئے اور مجھ سے کہتے کہ۔۔۔۔۔ یہ بھگوان کا پرشاد ہے۔ انکار کیا اور ٹھکرایا تو کوڑھی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ انکار کیا کرتی۔۔۔۔۔ میں تو کھلونا بنی رہی۔۔۔۔۔ اس پرشاد کا ایک دن نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ آس پاس کا نا پھوسی شروع ہو گئی۔ بات پھیلنے پھیلنے سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ نہیں سمجھی بلکہ دل ہی دل میں ڈری ہوئی تھی کہ اگر میں رکاوٹ ڈالوں گی تو میرا بدن گل سڑ کے گرنا شروع ہو جائے گا۔

گاؤں والوں نے پنجایت بلائی۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کس کا پال پال رہی ہوں۔؟ میں نے سچ سچ سب کے سامنے بات کہہ دیا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب کیا بولتی لیکن کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔۔۔۔۔ بھگوان جیسا دھرماتما برہمن بھلا ایسا کر سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ جس نے بیٹی کی طرح پالا۔۔۔۔۔؟ اس پر گھناؤنا الزام لگاتے ہوئے زبان بھی نہیں کانپی۔۔۔۔۔؟ یہ کیسی پاپی ہے۔۔۔۔۔؟ پھر لوگوں نے مجھے مارا پینا اور آخر گاؤں سے نکال دیا۔۔۔۔۔ اس مار پیٹ میں گناہ بھی وہیں ختم ہو گیا اور میرے پاؤں ہلکے ہو گئے۔

پھر میں یہاں۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکی۔۔۔۔۔ سب میرے بدن کے بھوکے تھے۔۔۔۔۔ اس زندگی سے اکتا کے میں نے تاج گانے کا پیشہ

اختیار کیا۔

قول

ارسطو نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے کہا۔ ”حکمران ظالم کب بن جاتا ہے۔“
شاگردوں نے جواب دیا۔ ”استاد محترم آپ بہتر جانتے ہیں۔“
ارسطو نے فرمایا۔

حکمران خود ظالم نہیں بن جاتا بلکہ عوام اس کو ظالم بنا دیتی ہے۔ جب ظالم حکمران کے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جائے گی تو اس کے ظلم کی اور حوصلہ افزائی ہوگی۔ ظالم حکمران ایک فرد ہوتا ہے جبکہ اسے تقویت دینے والے کروڑوں ہوتے ہیں۔ اگر یہ کروڑوں مل کر ظلم ختم کرنا چاہیں تو یہ ان کیلئے مشکل کام نہیں۔
پس ظالم حکمران نہیں ہوتا۔ ظالم خود عوام ہوتی ہے۔

(حسین حیدر شاہین - لالیاں)

تھی۔ میری محبت، خود پسندی اور الوہانہ پن اس پر ہر لمحہ بدلی کی طرح بدستور رہتی تھی۔ میرے نزدیک وہ انسان نہیں دیوتا تھا۔ ہزاروں غریبوں کو اپنے بچوں کی طرح پالتا تھا جیسے وہ اس کا خون ہوں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ انہیں سکھ پہنچاتا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اتنا صحیح نشانہ اس سے سیکھا۔ آواز پر گولی مارنا آسان کام نہیں ہے۔ ماہر سے ماہر نشانہ باز ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک اندھیری رات شکر سوامی نے اپنا گھوڑا دوڑایا تاکہ ایک مبہم سیر کر سکے۔
اسے جگہ کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔ گھوڑا دل میں جا دھنسا اس طرح اس کا دیہانت ہو گیا۔ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی، میرا دل جانتا ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری عشق تھا جو میری بدبختی نے تاراج کر دیا تھا۔
اس کے مرتے ہی میں نے گروہ کی لگام اپنے

ویلور پور کے زمیندار نے مجھے سہارا دیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ مجھے چاہنے لگا تھا۔ یوں میری زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ زندگی مجھے پسند تھی ۹ کرشن نگر میں ایک ڈاکو نے ڈاکہ ڈالا۔۔۔۔۔ وہ لوٹ کے مال کے ساتھ مجھے بھی اٹھا کے لے گیا۔۔۔۔۔ اس نے پھر زمین دار کو خط لکھا کہ اگر تم پدمنی کو چاہتے ہو تو پچاس ہزار روپے پھاڑوں کے پاس پہنچا دو۔ زمین دار نے پچاس ہزار روپے پہنچا دیے۔

میں واپس آئی تو پولیس نے شکر سوامی ڈاکو کا اڈا جاننے کے لئے مجھے گھیر لیا۔۔۔۔۔ طرح طرح کے لالچ دیئے۔۔۔۔۔ سختی کی۔۔۔۔۔ تشدد کیا۔۔۔۔۔ میں کسی قیمت پر بتانا نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے مجبوراً پولیس کے ساتھ جانا پڑا۔۔۔۔۔ لاکھ ہوشیاری سے میں پولیس کو ساتھ لے گئی۔ لیکن شکر سوامی کو پہلے ہی خبر ہو چکی تھی۔ پولیس کو تو اس نے جن جن کر مارا ہی ساتھ ہی مجھے بھی ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا۔

شکر سوامی کے ساتھ رہ کے میں نے دیکھا کہ باہر کی دنیا کی گندگی سے میں یہاں زیادہ مزے میں ہوں۔۔۔۔۔ شکر سوامی کی بہادری اور اس کی نشانہ بازی نے مجھے اس کا غلام بنا لیا۔ اس نے میری مانگ میں سیندور بھر دیا۔ کہتا تھا۔

”پدمنی تو مجھے ایسا لڑکا دے کہ۔۔۔“ میں شرم سے سٹ جاتی تھی۔

شکر سوامی ایک خطرناک ڈاکو تھا لیکن اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی لڑکی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جانے کتنے ڈاکے مارے تھے۔ وہ اندر سے ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں، عورتوں کی عزت و آبرو بچائی تھی۔ وہ دل سے عورت کی عزت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب کبھی میں کسی عورت کو دیکھتا تھا اسے اپنی ماں بہن کی طرح محسوس کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہو۔ میں بھی اسے ٹوٹ کے چاہنے لگی

”آکاش جی۔۔۔!“ وہ دور ہی سے مسرت آمیز لہجے میں چلائی۔ اس کی آواز کی بازگشت نے غار کے ہولناک سناٹے میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔

”کیا بات ہے امر تارانی۔۔۔! آکاش کہے بغیر
نہ رہ سکا۔“ تم بہت خوش لگ رہی ہو؟“ وہ بولا۔“ جلدی
ہے آؤ میرے پاس۔۔۔“

چند لمحوں کے بعد امرتارانی اس کے پاس آئی تو اس کے قریب نے آکاش کو بہکا دیا۔

”میں شکر ہاتھ کی آتما کو ترک کی آگ میں پہنچا
کے آئی ہوں۔“

”خوش ہو جاؤ۔۔۔ تمہاری پرچھا خیس اب اس
کے چنگل سے نکل پائی ہے۔“

”تو... تو کیا... میں اب اس اندھیرے غار میں سے اگلے کے اجالوں میں آ سکتا ہوں۔“ آکاش

نے خوشی سے دیوانہ ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیوں نہیں ہوگا، یقیناً ہوگا۔۔۔۔۔“ اس کی

آواز سرت سے کانپ رہی تھی۔
 "اسرنا رانی.....!" آکاش نے کچھ کہنا اور

آکاش کو اندازہ نہ تھا کہ امرتا رانی اس کی مصیبت سے نجات دلا کے اتنا خوش ہو جائے گی۔ یہ

آکاش کے ہونٹوں میں ایک عجیب سی مٹھاس
 جذب ہونے لگی تو سارے بدن پر میٹھی سی سفنی دوز نے

اسرارانی نے اپنے لیوں کو اس کے ہونٹوں پر سے اٹھا کے سرشارمی سے بولی۔

پھر وہ بولی۔ "میں تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو ورنہ وہ کمینہ اور مکار

ایک لمحہ مجھ پر گیسٹ گراں زور رہا ہے۔ اس قدر کرب
ناک ہے۔ ایک ایک صدمہ کی طرح بھاری ہے۔
مجھ پر جو بیت رہی ہے وہ میں جانتا ہوں یا میرا دل
ہی جانتا ہے۔ آکاش کے لمبے میں وحشت تھی۔

وہ سوچوں میں غرق تھا کہ امرتارانی کی بات کا کیا جواب دے۔ کچھ دیر کے بعد بو بھل سکوت کے بعد غار کی فضا میں ایک نسوانی چیخ نے جو دل خراش تھی لرز ادا کیا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان لڑکی گہری غیند میں غرق تھی کہ کوئی بھیا نک سپنا دیکھ کر لرز اٹھی ہو۔۔۔ اس چیخ نے آکاش کو لمحے کے لئے ہراساں کر دیا۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تو امرتارانی نے غصہ طراری انداز سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ کون لڑکی ہے۔“ امرتا رانی۔
 نے امرتا رانی کے قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔
 ”آکاش کو یاد آیا کہ جو کافی دیر قبل مارکی
 وحشت ہاک تنہائی میں کسی دیوانے کی طرح ہنستے ہنستے
 شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ یہ بات اسے یاد نہیں رہی تھی۔
 اس چیخ کو سن کر اسے خیال آ گیا تھا۔

”و حیرت رکھو۔ تم بہت جلد جان لو گے کہ وہ لڑکی کون ہے۔“

”اے؟“ امرتارانی نے جواب دیا۔

”ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ آکاش نے پوچھا۔ ”تمہیں بتانے میں پس و پیش کیوں ہو رہا ہے؟“

”اس لئے کہ ابھی اس راز سے پردہ اٹھانے کا
سے نہیں آیا ورنہ میں تمہیں بتا دیتی۔۔۔“ امرتارانی تنک
کے بولی۔ ”تم بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟“
اس وقت جو اس لڑکی کی چیخ سنائی دی تو پھر
سنائی نہ دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لڑکی مسلسل چیخیں
مارے گی۔ وہ ہمہ تن اس آواز کی طرف متوجہ تھا۔ اس
چیخ کا دوبارہ سنائی نہ دینا کچھ عجیب اور غیر فطری سا
لگ رہا تھا۔

”ایسا لگ رہا ہے کہ وہ چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی ہے۔“ آکاش نے دوسرے لمحے خیال ظاہر کیا۔

”وہ شاید اندر بے ہوش پڑی ہوگی۔“

”بے ہوش۔۔۔؟“ وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ ”میری جان! وہ اب غاروں کی اس بھول بھلیوں میں نہیں ہے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ اندر ہی ہے۔“ آکاش کا انداز تکرار کا سا تھا لیکن اس نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں بھول نہیں ہوں۔ میں نے اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑا تھا۔ تم میری بات کا سواں کیوں نہیں کر رہی ہو؟“

”بات یہ ہے میری جان۔۔۔ اس کی چیخ بلا سبب نہیں تھی۔“ امرتارانی بولی۔ ”اس لئے سنگیت اسے ابھی ابھی یہاں سے لے گئی ہے۔“

”لیکن یہاں سے تو کوئی گزرا نہیں۔“ آکاش نے پھر تکرار کیا۔ ”ورنہ قدموں کی چاپ تو سناؤ دیتی اس سناٹے میں۔“

”لیکن تم یہ بات بھول رہے ہو کہ اجنبیوں کے لئے یہ غار اندھے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ امرتارانی اسے بتانے لگی۔

”لیکن جاننے والوں کے لئے ایک نیا راستہ ہے۔ سنگیت اسے لے جا چکی ہے۔“

”تم کسی شک و شبہ اور اندیشوں میں مبتلا نہ ہو۔ مجھ پر سواں کرو۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گی اور نہ ہی جھوٹ بولوں گی۔ اس لئے کہ تم میرے سب کچھ ہو۔ میں تمہاری باندنی ہوں۔“

کچھ دیر بعد اسے اپنی محبوب اور جان از عزیز بیوی نیلم کی یاد آئی۔ چشم تصور میں اس کا تراشیدہ پیکر بھر آیا۔ دنیا میں کون لڑکی عورت اس کی ثنائی ہوگی۔ وہ دونوں دنیا کا حسین ترین جوڑے تھے۔

نیلم کی پراسرار جدائی کے باعث اسے ان دیکھی اور اجنبی دنیاؤں اور غیر انسانی قوتوں کے دامن میں پناہ لینی پڑی تھی اور وہ ان کے رحم و کرم پر ہو گیا تھا۔ محتاج ہو گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آئی تھی

اسے یہ ان دیکھنا پڑیں گے۔

نیلم کی بازیابی کے لئے اس نے جو عہد کیا تھا اسے کسی لمحے اور کسی دن نہیں بھولا تھا اور نہ بھول سکتا۔ یہ عہد فراموش کرنے کے لئے نہیں تھا۔ عہد بھی ایک سواند کی طرح ہی ہوتا ہے۔ یہ عہد اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ دل میں نقش تھا۔

لیکن کبھی کبھی ایک خیال اسے سوچنے پر مجبور کر دیتا۔ امرتارانی آخر کیوں اور کس لئے اس پر مرمی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنی نیلم کو اس ناگ راجہ کی قید سے نکال لانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود کہ حالات بہت پیچیدہ اور گھٹن تھے۔ نیلم کی بازیابی اور ناگ محل کا سفر بار بار یوں مل رہا تھا کہ آکاش نے پہلے تو یہ خیال کیا تھا کہ شاید اتفاق ہے۔ لیکن جب اس نے غور کیا تو اس کا ذہن ان تمام واقعات کو اتفاق ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کا بار گراں ہلکا ہونے کے بجائے مختلف حیلوں، بہانوں سے اس کے دشمنوں کی تعداد تو اتار سے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور وہ حالات کے بے رحم دھارے میں اتنا بے بس ہو کر رہ گیا تھا کہ کبھی سکون سے واقعات کو ان تمام کڑیوں پر غور کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔

اسے یاد آیا کہ اس کا سب سے پہلا معرکہ اور سامنا امرتارانی سے ہوا تھا۔

اور پھر یکے بعد دیگرے ناگ حویلی کے پراسرار حکمران۔۔۔ ناگ راجہ اس کے کریہہ صورت اور مکار معاون شیو ناگ۔۔۔ جل کماری جو ہوس پرست تھی اور ناگ دیوتا وغیرہ کے کروار ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے، جیسے فلموں میں مناظر اور ان کے کروار دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ اس پر جو افتاد آن پڑی تھی ان سے بچاؤ کے لئے کبھی اسے سمندروں کے نیچے اجنبی دنیا میں پناہ لینی پڑی اور کبھی دور دراز علاقوں میں روپوشی اختیار کرنی پڑی تھی جس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

اور پھر ایک بیک کیا ہوا۔۔۔؟ شکر تھا اس کا دشمن ہو گیا تھا جسے امرتارانی کے ہاتھوں موت کی بھیٹ چڑھنا پڑا۔۔۔۔۔ موجودہ صورت حال میں اس کے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ تاکوں کی دھرتی پر پوجا جانے والا ناگ دیوتا کسی کنواری کی بھیٹ نہ ملنے کی وجہ سے اس کی پرچھائیں اس سے چھین لی گئی تھیں۔ جس کے باعث اس کی ایک ایسی مصیبت گلے میں طوق کی طرح ڈال دی گئی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے باعث وہ اس تنگ و تاریک اور بھیانک ماحول کے غار میں بند ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ غار نہیں جیسے عقوبت خانہ تھا۔

آکاش کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے امرتارانی دوستی، عشق اور اپنے عشوہ اور جلوؤں کی آڑ میں اس کے گرد اپنا جال مضبوط کرتی جا رہی تھی۔۔۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے دل میں نیلم کی جدائی کا جو گھاؤ لگا ہے وہ اتنی جلدی مندمل نہ ہو سکے گا۔۔۔؟ اس کی جلن، تڑپ اور کسک چھین لئے نہیں دے رہی ہوگی۔۔۔۔۔ لہذا وہ اسے ناگ محل یا حویلی کے دلدل میں گرا کے ایسے حالات میں پھانسی جا رہی تھی کہ وہ بھی اس دلدل سے نکل نہ سکے۔۔۔۔۔ دلدل میں ایک بار گرنے کے بعد اس سے نکلنا ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ بغیر کسی سہارے ٹپکنے کی کوشش میں آدمی دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ عشق کا دلدل اور سراپا مشکل دوسری طرف اس کا عشق جنون تھا۔۔۔۔۔ ایسا اندھا عشق جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

وہ کسی ماہر نفسیات اور قیافہ شناسی اور مرد کی کمزوریوں سے واقف تھی۔ اس کے پاس نفسیاتی حربوں کی کمی نہ تھی۔۔۔۔۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ بے درے نا کامیوں اور مصائب سے دلبرداشتہ ہو کر نیلم کو فراموش کر بیٹھے اور کنٹھن حالات اسے اپنی جتنی سے بیزار کر دیں گے۔۔۔۔۔ اس کی یہ کمزوری امرتارانی کے لئے ایک سنہرا موقع ہو گا کہ دل میں جگہ بنالے دل میں نقش ہو جانا گویا ہر طرح سے جیت لینا تھا جس کے لئے امرتا کو خاصا وقت مل گیا۔۔۔۔۔ امرتارانی نے اسے ہر

طرح سے خوش کیا تھا اور کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور پھر شگیت جیسی شعلہ بدن کو اس کی نذر کیا تھا تا کہ وہ اس کے شکنجے سے نکل نہ سکے۔ اس سفید ناگن کے دل میں شگیت کو اس کی زندگی کا جزو بناتے ہوئے رتی برابر بھی رقابت کا جذبہ جنم نہ لے سکا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو امرتارانی کے قرب اور والہانہ پن سے پاگل ہو جاتا اور اپنی جتنی کو بھول جاتا۔

وہ جوں جوں ان خطوط پر سوچتا اور غور کرتا رہا اسے امرتارانی بھرم نظر آنے لگی تھی۔ واقعات اس کی لائق واقعات تھے۔۔۔۔۔ مگر یہ ضروری تھا کہ اس کی نگاہوں میں خود کو۔۔۔۔۔ بے گناہ ثابت کرنے کے لئے وہ خود کو لائق تعلق رکھتی۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ امرتارانی اسے مرے تک اس کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو اس کی جھولی میں کپکپ پھل کی طرح ڈال دیا تھا۔ اس نے کھلنے کی طرح جی بھر کے کھلا اور اب بھی اس طرح کھیل رہی ہے جیسے اس کا جی بالکل بھی نہ بھرا ہو۔

وہ طیش میں آ گیا۔ نفرت اور حقارت سے منھیاں بھیجنے کے غار میں ٹہلتا رہا۔۔۔۔۔ اس نے کئی بار سوچا کہ امرتارانی کے آتے ہی وہ اسے ختم کر کے ہی دم لے گا۔۔۔۔۔ یہ ناگن ہے۔۔۔۔۔ اس نے جو عشق کا زہر اس کے وجود میں سراپت کیا ہے۔ وہ نرس نرس میں بس کر رہ گیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے فیسے پر مصلحت غالب آ گئی۔ اسے نہ صرف دور اندیشی بلکہ سیاست اور چال بازی سے کام لینا ہو گا۔ جب تک اسے پرچھائیں کے روح فرسا عذاب سے نجات ملنے تک وہ اپنے بشرے اور حرکات و سکنات سے احساس ہونے نہیں دے گا۔ اگر امرتارانی نے محسوس کر لیا سارا کام نہ صرف بگڑ جائے گا بلکہ بیڑا غرق ہو جائے گا۔ وہ یہ مت بھولے کہ امرتارانی جتنی حسین ہے اتنی ہی خطرناک بھی۔

اسے سادھو مہاراج کے الفاظ خوب یاد تھے کہ امرتارانی کے سہارے نیلم تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ ہوشیاری اور صبر سے کام لینا ہو گا۔ صرف یہی ایک ایسی

ہستی ہے جس کی بدولت وہ غلام کو پاسکتا ہے۔ امرتارانی کو خوش رکھے بغیر کام نہیں نکل سکتا ہے.....

تو کیا اسے کٹھ پتلی اور کھلونا بنا ہوا رہنا ہوگا.....؟
امرتارانی کو ہر طرح سے خوش کرتے رہتا ہوگا.....؟ اس کا جو جنون عشق ہے اور جذبات ہیں انہیں پورے کرنا ہوں گے..... اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوگا.....؟

آکاش نے اس مہیب قدرتی قید خانے میں جو عقوبت خانہ لگ رہا تھا۔ اپنا بانی ماندہ وقت بہت ہی بے چینی اور کرب ناک اذیت سے گزارا۔ وقت گزاری کے لئے کئی بار اسے امرتارانی کو طلب کرنے کا خیال آیا لیکن وہ اس خیال سے باز رہا کہ اس کے سامنے آتے ہی کہیں وہ اپنے مشعل جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ اس طرح بنا بنا یا کھیل بگڑ نہ جائے۔

اس غار میں مسلسل اور یکساں تاریکی کے باعث وقت جیسے جلد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر سنگیت ہوتی تو وہ اس کی تنہائی دور کر دیتی۔ سنگیت سے اس کا رابطہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سنگیت کے تصور میں غرق تھا کہ اس وقت امرتارانی آئی۔ اس نے جان لیا کہ چاند کی آخری سیاہ شب آگئی ہے۔

امرتارانی نے اس کے گلے میں اپنی سرسری ہانپیں حماں کر کے جذباتی انداز سے پیش آئی تو اس کے باوجود وہ اپنی سرد مہری چھپانہ سکا۔

”کیا اپنی داسی سے خفا ہو گئے ہو۔ میرے آکاش جی.....!“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی اور اس کا ہاتھ تھام کے اسے غار کے ایک کونے میں لے گئی۔
”جواب دونا..... کیا واقعی خفا ہو؟“

اسے بے اختیار وہ دن یاد آیا جب امرتارانی نے الھڑ اور معصوم بنجارن بن کے روپ میں نہایت مکاری کے ساتھ اسے خود سپردگی سے پیش آ کر منکا واپس چھین لینا چاہا تھا۔

آکاش نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ

خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کی خاموشی سرد مہری کو امرتارانی نے محسوس کر کے دوبارہ سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ آکاش نے یہ بات محسوس کی کہ وہ افسردگی کی کامیاب اداکاری کر رہی ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ ایک ناگن ہونے کے ناتے چال باز ہے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھلی فضا میں نکل آئے۔ باہر شدید سردی تھی۔ ہوا تھی کہ برقانی نیزوں کی طرح بدن میں اور ہڈیوں میں چمید کر رہی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لے کر آس پاس نگاہیں دوڑائیں اور پھر بری لے کر رہ گیا۔ امرتارانی اس سے پیٹ کے چلنے لگی تھی تاکہ اس کی سردی کو دور کر دے۔ اس کا جسم سرد ہونے کے بجائے گرم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس وقت بہت ہی خطرناک پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

جس غار سے نکل کے وہ آئے تھے وہ ان کی پشت پر تھا اور وہ ایک مختصر چٹان پر کھڑے ہوئے تھے۔ جس سے ایک پتلی سی پکڑنڈی چلی وادی میں جاتی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی اور جس میں کسی پہاڑی کے حاصے شور سنائی دیتا تھا۔ نبادوں کی چھاؤں میں اکا دکا جھاگ اڑاتی لہروں کا ایک خاکہ بھی نظر آ جاتا تھا۔ وادی کے اس پار ایک اور فلک بوس پہاڑ تھا جس پر بے تحاشا جنگلات رہے ہوں گے۔ چوں کہ اس جانب ہواؤں کا بہت شور آوارہ روتوں کے رونے کا سماں باندھ رہا تھا..... درختوں سے ٹکرانکر کر چلنے والی سرد ہواؤں میں اس ہلکی ہلکی برف کی نمی رچی ہوئی تھی جو قریب و جوار کی پہاڑیوں پر چاندی کے ذروں کی طرح دور دور تک بکھری ہوئی تھی۔

رات سیاہ تھی اور صرف تاروں کی چھاؤں میں زیادہ دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا..... لیکن اس کے باوجود اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ انتہائی خطرناک اور دشوار گزار مقام پر کھڑا ہوا ہو۔

اس نے سرگھما کے امرتارانی کی طرف دیکھا تو

اس نے امرتارانی کو اپنی طرف ہی متوجہ پایا۔

”میری جان.....! تمہیں دہم ہوا ہے..... کیا میں تم سے خفا ہو سکتا ہوں..... اچھا یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”جہاں جانا ہے، وہاں تو پہنچ ہی جائیں گے.....“ اس کے لہجے میں ابھی تک دکھ بھرا ہوا تھا۔

”لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم ابھی تک روٹھے ہوئے ہو..... سچ بولو.....! تاکہ میرے من کی کلی کھل جائے۔“

”یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو.....؟“

”لیکن تم نے بڑے رسمی انداز سے اور بڑے پچھلے لہجے میں میری بات کا جواب دیا ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو..... یقین نہیں آیا ہے تو میرے دھڑکتے سینے پر اپنا کان رکھو تو میرا من گواہی دے گا۔“

”دل کی باتوں پر نہ جاؤ..... سردی بہت ہے..... اگر میں نے تمہارے سینے پر کان رکھ دیا تو میرے جذبات بھڑک اٹھیں گے۔“ اس نے امرتا رانی کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اس کے رخسار کا رسمی انداز سے بوسہ لے لیا۔ ”اب تو شکایت نہیں رہی نا.....؟“

اسے اندازہ نہ تھا کہ امرتا رانی کے سینے میں کتنا بڑا دل ہے.....؟ یہ کس قدر عظیم ہستی ہے..... کیا یہ عشق ایسا ہی ہوتا ہے.....؟ امرتا رانی نے جذبات کی رو میں بہہ کے جو کہا تھا وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ اس نے نیلم کی جداگی کا خلا پر کرنے کے لئے حسن و شباب سے دل بہلایا تھا۔ ایک طرف اس کی زندگی میں جو لڑکی عورت آئی تھی اس میں اس کا دوش تھا اس کی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت اور پرکشش اور دل نواز شخصیت کا..... دوسری طرف جو لڑکیاں عورتیں وہ ان کے حسن و شباب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک مرد جو تھا اور اسے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے..... وہ اس کے بدن کی داد دینے سے خود کو نہ بچا سکتا تھا۔ وہ ایسا

مہلک اور خطرناک ہتھیار تھا کہ اس سے بچنا آسان نہ تھا..... وہ صرف ان لڑکیوں کو دوش نہیں دے سکتا تھا جو عشق کے جنون میں اس کی تنہائی کی رفیقہ بنی تھیں۔

”یہ تم کیا سوچنے لگے ہو؟ کیا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے.....؟“ امرتا رانی نے اس کا شانہ ہلایا۔

”دیکھو..... سردی کی شدت میں لکھنے بہ لکھنے اضافہ ہو رہا ہے..... یہاں سے جتنا جلد ہو سکے چلنے کی کوشش کرو..... اور تمہارے دل کے کسی کونے میں شک و شبہ کی رمتی بھی ہو تو اسے نکال پھینکو.....“ آکاش نے ایک کان کی دھواں اگلتی چٹنی پر نظر جما کر کہا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس سیاہ دھوئیں میں اس کے دل کا غبار بھی شامل ہو..... وہ نیلم کے فراق اور جدائی میں اس طرح دھیمے دھیمے سلگ رہا ہو جیسے جہنم میں پڑے ہوئے کوئلے دیر تک جھنجھٹ کر دھیمے پڑتے جا رہے ہوں۔

”میرے دل کے مندر کے دیوتا.....!“ امرتا رانی ایک لخت اس کے قدموں میں کسی تیل کی طرح لپٹ گئی۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے پریم نہیں کرتے..... اور نہ ہی کر سکتے ہو..... میں جانتی ہوں کہ تمہارے من پر تمہاری چٹنی کی سندر صورت راج کر رہی ہے اور تمہارے من کے نہاں خانوں میں وہ نقش ہے..... اس کے باوجود کہ تم دنیا میں سب سے زیادہ اسے چاہتے ہو اور تم صرف میرے حسن و شباب اور جسمانی دلکشی سے متاثر ہو اور دل بہلاتے ہو..... لیکن اس کے باوجود میرا ہر جانی من پھر بھی تمہاری طرف جھکتا ہے۔“

جانے کیوں آکاش کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ریا کاری اور منافقت سے پیش آرہی ہے۔

اس کا احساس ہوتے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مشتعل ہو گیا..... اس نے محسوس کیا کہ امرتا رانی کا ایک ایک لفظ، جھوٹ اور عیاری کا پلندہ ہے..... عورت کتنی بڑی اداکارہ ہے..... وہ کس قدر چالاکی اور خوب صورتی

سے اپنے فریب کا بھرم رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔
وہ اسے بے وقوف اور احمق سمجھ رہی ہے۔

پھر آکاش سے رہا نہ گیا۔ اس کی نفرت اور غصہ
انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے امرتارانی کے شانے تھامے اور
جھک کے ایک جھٹکے سے اسے گود میں اٹھالیا۔ امرتارانی
یہ سمجھی کہ وہ اس کے چہرے پر جذباتی انداز سے جھک
جائے گا۔

لیکن دوسرے لمحے اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔
پھر وہ بگڑ کے برہمی سے بولا۔

”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اپنی ان باتوں سے دھوکا
کھا کر تمہاری اس بکو اس پر اندھا یقین کر لوں گا۔ تم
نے بڑی خود غرضی اور مکاری سے اپنے حسن کے جال
میں اس لئے پھانسا کہ میری خوب صورتی اور مردانہ
وجاہت سے اپنے ارمان پورے کر سکو۔ مجھ سے ایک
کھلونے کی طرح کھیلتی رہی ہو۔ مجھے کھلونا بنالیا۔
لیکن اس جذبے میں نہ تو محبت تھی۔ اچھوتا جذبہ تھا
اور نہ ہی میں نے خلوص محسوس کیا۔ تمہاری اس سیاہ
کاری کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔“

آکاش نے یہ بات کہتے ہوئے اس بات کی
کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ قابو میں رہے۔ لیکن وہ زہر
آلود ہوتا گیا۔ امرتارانی کا چہرہ متغیر سا ہوتا گیا۔ کیوں
کہ اس کا ایک ایک لفظ فشر زنی کرتا گیا تھا امرتارانی
کے وجود پر

”میں کیسی ابھرا گئی ہوں۔“ امرتارانی نے
اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر جیسے سک
پڑی۔ ”ہر وہ کام جو میں نے تمہیں اپنانے کے لئے
اور تم سے قریب ہونے کے لئے اس کے برعکس اور الٹا
ہی ہوا۔ میں نے تمہارے کارن کیا کچھ نہیں
کیا۔؟ اپنی پوری جاتی کا بیرمول لیا۔ ناگ حویلی
کا راجہ میرے خون کا پیاسا ہو چکا ہے۔ میں اب
اونی نگر جاؤں تو میری جان لے کے رہے گا۔ میں
نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔؟ لیکن ان تمام
باتوں کے باوجود تمہارے دل کے کسی گوشے میں اب

میرے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں اکن ناگ
کی سوگند کھا کے کہتی ہوں کہ میں تمہاری پتی کی جگہ لیتا
نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ وہ صرف اور صرف
تمہاری ہے۔ لیکن پھر میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ
نیلیم کی داسی سمجھ کے پریم کے دو بول بول لیا کرو۔
جب تک تم اسے پانہیں لیتے ہو مجھے اس بات کی آگیا
دو کہ میں تم پر مہربان ہوتی رہوں۔ تمہیں خوش اس
طرح کرنی رہوں جس طرح اب تک کرتی رہی
ہوں۔ اس لئے کہ تم اس کی جدائی اور فراق میں
بے چین نہ رہو۔“

”خاموش۔۔۔۔۔“ اس کی زبان سے نیلیم کا نام سن
کے اس کے وجود میں دلی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔
پہاڑوں سے اس کی آواز کی بازگشت نگرانی تو اس نے
آکاش کو اور مشتعل کر دیا۔ پھر اس سے برداشت نہ
ہو سکا۔ اس نے بے اختیار امرتارانی پر ہاتھ چھوڑ دیا۔
اس گہرے سنائے اور فضا میں کھنکھرائی کی آواز کے
ساتھ ہی ایک طویل دل خراش چیخ گونجی تو سارا ماحول
جیسے دہل کے رہ گیا تھا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی تھی
کیوں کہ یہ امرتارانی کے لئے اچانک اور غیر متوقع
تھا۔ وہ لہرا کے چمن کے سرے گہری کھائی میں
لڑھک گئی۔ وہ بکئی کی سی سہمت اور اضطراب کی کیفیت
سے آگے بڑھتا کہ امرتارانی کو پکڑ لے۔ لیکن بے
سود۔ کمان سے نکلتے واپس آنے سے رہا تھا۔
امرتارانی کی چیخ تو معدوم ہو چکی تھی۔

آکاش نے بھونچکا ہو کر دیکھا۔ امرتارانی کا
سایہ اسے پہاڑی کی ڈھلان کی ہزاروں فٹ گہری
کھائی میں چھائی ہوئی مہیب تاریکی میں غرق ہوتا نظر
آتا تھا۔

اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ جو کچھ ہوا وہ اس
قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سوچ بھی نہیں سکتا
تھا۔ اسے پچھتاوا سا ہوا کہ اس نے کیا کر دیا۔!
اپنے پیروں پر کلباڑی مار لی۔ کاش۔ کاش۔ کاش۔ وہ
یہ حثت نہ کرتا۔! (باری ہے)

روح کا انتقام

ملک این اے کاوش۔ سلاٹوالی سرگودھا

کمرے میں محو خواب حسینہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، کمرے کی لائٹ روشن تھی، اور پھر حسینہ نے اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، اور وہ آہستہ آہستہ بستر سے اوپر کو اٹھنے لگی اور چشم زدن میں ہوا میں معلق ہو گئی کہ پھر.....

خوف و بھس اور سسپنس جو کہ پڑھنے والوں کو..... ورطہ حیرت میں ڈال دے گا

سرپرست نام کا مالک رنیز ملہو ترا اس وقت اپنے سامنے آن وارد ہونے والے پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر واقعی حیران و ششدر رہ گیا تھا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس سبب آپ مجھے لے جانے کی جرات کر رہے ہیں؟“ رنیز ملہو ترا نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کے خلاف درخواست دی گئی ہے کہ آپ اپنے ہسپتالوں سے انسانوں کے اعضاء کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے نیشنل و انٹرنیشنل ہوٹلوں میں انسانی گوشت کی ایک اسٹیشن ڈس تیار کی جاتی ہے۔“ انسپکٹر نے معنی خیز آنکھوں سے رنیز ملہو ترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں احساس ہے اپنے الفاظ کا انسپکٹر اور تم جانتے ہو کہ تمہارے مقابل کون کھڑا ہے۔؟“ انسپکٹر کی بات سن کر رنیز ملہو ترا نے ناک بھونچے ہاتھ ہوئے کہا۔ رنیز ملہو ترا انسپکٹر کی بات سن کر غصے سے بیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے بھی چوشترا انسپکٹر کی گردن مروڑ ڈالے۔ دیکھا دیکھی میں ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔

”جی ہاں کیوں نہیں مجھ سے زیادہ آپ سے کون

رنیز ملہو ترا گاڑی سے اترا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا۔

”انسپکٹر... رنیز ملہو ترا نے انسپکٹر اور چند کانسیبلوں کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھا اور پھر انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ”کیا بات ہے آپ اور یہاں؟“

”جی ہاں۔ ہمیں یہاں دیکھ کر آپ ورطہ حیرت میں ضرور مبتلا ہوئے ہوں گے کہ صبح ہی صبح آپ کے دفتر کے سامنے سے ہم آپ کو معذرت کے ساتھ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“ انسپکٹر نے رنیز ملہو ترا کے پاس آ کر دھمے لہجے میں کہا۔

رنیز ملہو ترا ممبئی کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ جس کے نام سے ہر کس و نا کس آشنا تھا۔ اندرون ملک ہی نہیں بیرون ممالک میں بھی اس کی کافی آشنائی تھی۔ اس کا بزنس اندرون بیرون وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ اندرون و بیرون ممالک اس کے ہسپتال اور دی آئی پی ہوٹلز چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپورٹ ایکسپورٹ کا وسیع بزنس کا مالک تھا۔ اندرون بیرون کئی فیکٹریوں میں بھی اس کے شیئرز چل رہے تھے۔ ممبئی کی ایک جانی پہچانی اور امراء کی لسٹ میں

Dar Digest 180 May 2015



آشنا ہوگا مہوٹر صاحب۔۔۔ انسپکٹر نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”آپ کا بزنس دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی میں آپ کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے ہم اس بات سے بھی بخوبی آشنا ہیں کہ یہ آپ کے کسی حریف کی کوئی چال ہے جو آپ کے اسٹیٹس سے جھگڑا ہے اور آپ کے خلاف لکھناؤنا چالیں چار کر رہا ہے لیکن مہوٹر صاحب آپ چٹا نہ کریں اگر آپ بے تصور ہوئے تو میں آپ سے پروم کر رہا ہوں کہ آپ کے حریفوں کو ناکوں پٹے چبواؤں گا اور امید بھی کرتا ہوں کہ آپ ہماری معاونت کرنے میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں برتیں گے ہماری معاونت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔“

”ہوں۔۔۔ چلیے آپ اپنی جانچ پڑتال بھی کر لیجئے انسپکٹر صاحب لیکن ہمیں شواہد نہیں ہو رہا کہ کوئی ہم پر ایسا حلیہ الزام بھی لگا سکتا ہے۔“

رہبر مہوٹر نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پیشانی پر سلوٹیں میاں کرتے ہوئے کہا۔

”خاطر جمع رکھیں آپ۔۔۔ انسپکٹر نے مہوٹر کے ساتھ اس کی بہت پروف گاڑی میں براہمان ہوتے ہوئے کہا جبکہ ہائی کمانڈ میں پولیس وین میں سوار ہو کے ان کے پیچھے ہو لیے۔“

”ہاں اب بتاؤ انسپکٹر کیا بات ہے۔۔۔“

رہبر مہوٹر نے گاڑی کیسر میں ڈالتے ہی پرسکولیش لہجے میں اس سے پوچھا۔

ایک لڑکی آئی ہے پولیس اسٹیشن۔ اس کے ہاتھ شاید کچھ شواہد لگ گئے ہیں مگر وہ شواہد اس صورت میں پولیس کے حوالے کرنے کی حامی بھرتی ہے کہ اگر ہم آپ کو اریسٹ کر کے اس کے سامنے لائیں تو۔۔۔

انسپکٹر کی بات سن کر مہوٹر نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کیا ایس ایچ اوسالابھی وہیں موجود ہے۔۔۔ مہوٹر نے غصے سے دانت پیستے ہوئے

کہا۔

نہیں مہوٹر صاحب یہی تو غصہ ہے کہ آج ایس ایچ اوسالاب ایک اربنٹ میٹنگ میں آؤٹ آف شئی گئے ہیں۔۔۔ انسپکٹر نے چپک کر جواب دیا۔

”ایسے بھی کون سے شواہد اس لڑکی کے ہتھے لگ گئے ہیں۔۔۔؟“ مہوٹر نے متواتر غصے سے چیخ دتا ب کھاتے ہوئے کہا۔ ”جانتے ہو اب ہماری غیر موجودگی میں چھ میگوئیاں شروع ہو گئی ہوں گی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تک بات پہنچنے سے قبل ہی اس بات کو دہانا ضروری ہے۔ تم نے بے وقوفیت کی انتہا کر دی ہے تم اتنے مورکھ ثابت ہو گے کہ میں نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا۔ مجھے فون کر لیتے ہیں ڈائریکٹ وہاں آ جاتا۔“

مہوٹر کا غصہ بدستور اپنی جگہ قائم و دائم تھا۔ اس نے اب سارا غصہ انسپکٹر پر اتارنا شروع کر دیا۔ کیونکہ آن کی آن میں وہاں لوگوں کا جہم غصہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ کوئی عام انسان ہوتا تو کبھی جیسے پر جہوم شہر میں اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا جاتا، چاہے پولیس اسے گھسیٹے ہوئے لے جاتی۔ مگر رہبر مہوٹر جس کے نام کا ڈنکا پورے شہر میں بجتا تھا۔ ہر کس ونا کس اس کے نام سے آشنا تھا۔ امراء کی فہرست میں اس کا نام بھی لکھا جاتا تھا۔ پیسے کی ریل چل تھی۔

”بقول اس کے وہ آپ کے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ جنہوں نے اسے پکڑ کر قہر میں موجود رہبر کے لوگوں کے ساتھ تہہ خانے میں مقید کر دیا مگر نبھانے کیسے وہ سب کو چھم دے کر وہاں سے نکلنے میں سہیل ہو گئی۔ میں نے حوالدار کو سمجھا دیا ہے وہ اسے الگ روم میں بیٹھا آیا تھا۔ اور میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی بھی طور اسے باہر نہ نکلنے دیا جائے یہاں اسنے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے پاس آنا مجبوری تھا کیونکہ میں پچھلے دو گھنٹوں سے پیہم آپ کا نمبر ملا رہا ہوں جو متواتر بند چار رہا ہے۔ ہم یہاں ضروری کام سے آئے تھے اور اوپر سے آپ بھی فی الفور آگئے تو معذرت چاہتا ہوں

ایسی گستاخی کرنی پڑی۔۔۔۔۔" انسپکٹر کی بات کرتے کرتے آنکھیں جھک گئیں۔

"تم لوگ تو آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے بورے ہو۔ جب دیکھ بھی رہے ہو کہ لوگوں کی نگاہیں متواتر ہم پر تھیں ہوئی ہیں تو ایسی تفصیل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔۔۔" ملہو ترا نے اسٹیزنگ گھما کر موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"سر آپ چننا مت کریں جب آپ واپس جائیں گے تو سب کو اطمینان ہو جائے گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔۔۔۔۔" انسپکٹر نے دھیسے لہجے میں کہا۔ اس میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کی جسارت نہ تھی۔ گاڑی پولیس اسٹیشن کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ رہیز ملہو ترا نے گاڑی ڈائریکٹ پولیس اسٹیشن کے اندر جا کے کھڑی کی۔ پولیس مین بھی پیچھے ہی جا کر رک گئی۔ سب یکے بعد دیگرے باہر نکلے۔

رہیز ملہو ترا نے تین شادیاں کی تھیں مگر تینوں بیویوں سے اس کی متواتر لڑکیاں ہی پیدا ہوئیں۔ اس وقت وہ پانچ بیٹیوں کا باپ تھا۔ اس نے بھی اس بات کا ماتم نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی مکمل توجہ اور پیار دیتا تھا۔ اس کی پانچویں بیٹیاں اچلی اداروں میں اسٹوڈنٹس تھیں۔ رہیز ملہو ترا نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی اس کی اپنی چھوٹھی زادگر دھادی ملہو ترا سے ہوئی تھی جس سے بھگوان نے اسے دو بیٹی (گانتی ملہو ترا، شیفتہ ملہو ترا) سے نوازا جبکہ بیٹے کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے دوسری شادی آؤٹ آف فیملی ٹھا کر اوتار سنگھ کی بیٹی ساوتری ملہو ترا سے کی تھی۔ ٹھا کر اوتار سنگھ کئی فیکٹریوں کے مالک تھے اور بائے قسمت کہ ان کی صرف ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کی پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی چنی سوہرگماش ہو گئی تھی۔ ساوتری سے بھی رہیز ملہو ترا کو دو بیٹی (لکشمی ملہو ترا، فانیہ ملہو ترا) ہوئیں۔ اس کا دل بچپن سے کرمٹھی میں آگیا۔ چھٹی اس کی ملاقات کرن سے

ہوئی۔ کرن ایک متوسط گھرانے کی تھی۔ مگر شرم و حیا کی چادر میں لپٹی وہ کوئی ایسا دکھائی دیتی تھی۔ جلد ہی کرن اس کی بیٹی بن کر کرن سے کرن ملہو ترا بن گئی۔ اس سے بھی بھگوان نے رہیز ملہو ترا کو ایک بیٹی دی جس کا نام مادھوری ملہو ترا رکھا گیا تھا۔

کرن ملہو ترا کو ہمیشہ کم ذات کا رتبہ دیا جاتا تھا۔ گرد دھادی ملہو ترا اور ساوتری ملہو ترا کا کرن ملہو ترا کے ساتھ بڑا ذوق بہت براتھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ کرن ملہو ترا نے آج تک کسی کے لیے بھی اپنے دل میں میل تک نہ آنے دی تھی۔ سونے پہ سہاگا گرد دھادی ملہو ترا اور ساوتری ملہو ترا کی اولاد نے بھی پر نکالنے شروع کر دیے تھے۔ کبھی کبھی تو کرن ملہو ترا کا من کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر اس گھر سے کہیں دور چلی جائے جہاں وہ اپنی بیٹی کی آزادانہ تعلیم و تربیت پر دھیان دے سکے۔ رہیز ملہو ترا کی سوچو دنی میں سب ناماں بیٹی کے ساتھ بڑا ذوق ایسا ہوتا تھا جیسے ان سے بڑا ان دونوں کا کوئی خیر خواہ ہی نہ ہو۔ مگر رہیز ملہو ترا کے جاتے ہی سب گرگٹ کی طرح رنگ دھار لیتی تھیں۔

خود رہیز ملہو ترا کرن ملہو ترا سے دوسری دونوں بیویوں کی نسبت زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کرن ملہو ترا خوبصورتی میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ جبکہ گرد دھادی ملہو ترا اور ساوتری ملہو ترا پورے پورے نمین نقش کی مالک تھیں۔ مزید برآں گانتی ملہو ترا، شیفتہ ملہو ترا، لکشمی ملہو ترا اور فانیہ ملہو ترا کی نسبت مادھوری ملہو ترا بہت حسین و آئیں تھیں۔ رہیز ملہو ترا کی زیادہ توجہ ان دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھ کر گرد دھادی ملہو ترا اور ساوتری ملہو ترا نے اندر ہی اندر تپنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کرن ملہو ترا اور اس کی بیٹی سے ٹیلس ہوئے لگی تھیں۔ دوسری طرف کرن کے ضبط کا پتہ نہ بھی لہریز ہوتا چلا ہار ہا تھا۔

ایک شام جب دونوں سونکھوں نے ملی بھگت سے کچھ ملازموں کو چھٹی دے دی اور کچھ کو دوسرے کاموں میں ابھار دیا۔ پھر گرد دھادی ملہو ترا نے کرن ملہو ترا کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ملازموں کی بجائے کچن خود سنبھال لی ہے کہتی ہیں کسی کے ہاتھ کا پکا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔“

سادتری نے رمیز ملہو ترا کی طرف دیکھتے ہوئے طنز یہ تیر چھوڑا لیکن آگے سے رمیز ملہو ترا کے جواب نے سب پر سکتہ طاری کر دیا۔

”یہ پہچان ہوئی ہے ایک سلیقہ شعار عورت کی۔ ملازما میں نجانے پاکی ناپاکی کا کہاں تک خیال برتی ہوں گی بہت اچھا کیا ہے بلکہ میں تو کرن کی اس بات کی داد دیتا ہوں، یقین مانو کرن تم نے آج میرا دل جیت لیا ہے۔ میری بیٹی کو گھر داری سکھاؤ، ان لوگوں کو تو اپنی بیٹیوں کا خیال ہی نہیں ہے نجانے کیسے سسرال ملے پڑیں۔۔۔۔۔“ رمیز ملہو ترا نے سادتری کی بات کا جواب دیتے ہوئے کچن سے سامان اٹھاتے دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات سن کر سب کو جیسے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ سب نے کھا جانے والی آنکھوں سے دونوں زریب مسکراتی ماں بیٹی کو دیکھا۔ دونوں کے لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔ خاص کر مادھوری ملہو ترا تو باپ کی بات سن کر خوشی سے باغ باغ ہو گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی دونوں سوتیلی ماؤں نے ان دونوں بیٹیوں کے خلاف اس کے باپ کے کان بھرنے چاہے تھے مگر بے سود۔

”میری پیاری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہو تم مجھے بہت خوشی ہے تمہیں ماں کا ہاتھ بٹاتے دیکھ کر۔ یہ سب تعلیم و تربیت پر منحصر ہوتا ہے جیسی اولاد کی تربیت کی جائے ویسی ہی وہ پرورش پاتی ہیں۔۔۔۔۔“ رمیز ملہو ترا کی بات میں چھپا طنز نہ صرف اس کی دونوں بیویوں کی سمجھ میں آچکا تھا بلکہ اس کی اولاد بھی بات کو سمجھ چکی تھی جو کام کو ہاتھ لگانا گناہ گردانتی تھیں۔ کچی پکائی کھانے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ان پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ ہر وقت میک اپ کرنا، بیٹھے بٹھائے کھانا، ہر وقت کسی نہ کسی ڈے و ناٹ محفل میں جانا مگر کرن ملہو ترا اور اس کی بیٹی ان سب سے بہت مختلف تھیں۔ وہ

رات کا کھانا تیار کرنے کا کہا تو کرن ملہو ترا کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ وہ سب سمجھ چکی تھی کہ دونوں مل کے اب اس کے خلاف کوئی نہ کوئی پلان بنا رہی ہیں لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا اور رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ مادھوری ملہو ترا نے ماں کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو ماں کا ہاتھ بٹانے آگئی۔ کرن ملہو ترا نے تو اسے منع بھی کیا کہ وہ جا کر اسٹڈی کرے مگر وہ بھی بضد رہی تو کرن ملہو ترا کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑ گئے۔

”ماں آپ پاپا سے بات کیوں نہیں کرتیں، ان کے سامنے تو یہ کیسے ہمدرد ہو جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ہمیں ہاتھوں کا آبلہ بنا کے رکھا ہو اور پاپا کے جاتے ساتھ ہی ان کے رنگ و روپ ہی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ کام ملازموں کے کرنے کے ہیں اور کس قدر ڈھٹائی سے انہوں نے آپ کو کہہ دیا ہے۔۔۔۔۔“

مادھوری نے پیاز کاٹتے ہوئے آنکھوں سے گرتے پانی کو دائیں ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں میری بچی تم تردد مت کرو۔ یہ جلیس ہوتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی تمام تر توجہ تم پر لگی ہوئی ہے۔ تمہاری تعلیم و تربیت پر انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ دوسری بیٹیوں کے ساتھ بھی انہوں نے کوئی نا انصافی نہیں کی مگر جتنی توجہ اور پیار وہ تم پر لٹا رہے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ توجہ اور پیار میسر نہیں آ سکا یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اندر ہی اندر جلیس ہو چکی ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ ہمیں کچا چھاڑالیں۔۔۔۔۔“ کرن ملہو ترا نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ سلا دتیار ہوا کہ نہیں، میں نے سارا کام مکمل کر لیا ہے۔“

”ارے آج بھوک سے کیا مارو گی کیا دونوں ماں بیٹیاں۔۔۔۔۔“ دستر خوان پہ سب جمع ہو چکے تھے۔ رمیز ملہو ترا کو سنانے کے لیے سادتری ملہو ترا نے طنز یہ لہجے میں زور سے انہیں پکارا حالانکہ ابھی وہ دیکھ کے گئی تھی کہ سب کچھ تیار تھا۔ آج دونوں ماں بیٹیوں نے

گھر میں رہنا ہی بہتر سمجھتی تھیں۔ غیر کے سامنے جانا وہ گناہ سمجھتی تھیں۔ جبکہ دوسری ازواج اور بیٹیاں بلا جھجک جایا کرتی تھیں۔

رہیز مہو تر اپنی بیوی کرن مہو تر اور بیٹی مادھوری مہو تر اسے بہت چاہت رکھتا تھا۔ سرائٹھانی گھریلوں کشیدگیوں سے بھی وہ آشنا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ کرن مہو تر اور مادھوری مہو تر اطمینان تھیں۔ رہیز مہو تر اکو کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک غلط راہ پر چل رہا ہے جس پر کسی بھی وقت وہ چلتے چلتے کسی آفت کا کہانی کا شکار ہو جائے گا۔ مگر افسوس کہ ہوس انسان پر جب ایک بار قابض ہو جاتا ہے تو انسان کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود پڑ جاتی ہیں۔ یہ وقتی احساس ہوتا تھا کہ وہ غلط ہے لیکن جلد ہی وہ یہ بات کہہ کر اپنے اس احساس کو غلط قرار دے دیتا کہ:

”غلط میں نہیں پوری دنیا ہے۔ ایسا کون سا منٹس بارسا ہے جو اپنی پارسائی کا دعویدار ہو۔ ویسے ہی طرح لوگ من کی دیوار پر پاؤں کے داغ دھبے چھپانے کے لیے دھرم اور خدمت خلق کا کیلنڈر لٹکا دیتے ہیں۔ ”شہرت میں آفت ہے“ کے مقولے پر ایسے لوگ دھیان نہیں دیتے۔ جو لوگ ”رسمک نہیں لیتے وہ عموماً کتنا نام زندگی گزارتے ہیں۔“ مگر رہیز مہو تر اس بات سے نا آشنا تھا کہ اس کی شہرت اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی اب ایک نیا موڑ لینے والی تھی جس سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

تمہیں زندگی بچ جانے پر بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا مگر کھڑکی۔ تم نے ایک بار پھر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے اب تو تمہارا انجام سیدھا موت ہی ہوگا۔۔۔۔۔ رہیز مہو تر نے اس لڑکی کی طرف غصیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

”تم مجھے مار بھی ڈالو تو اب مجھے اس کی کوئی چھتا نہیں ہے رہیز مہو تر، میں جانتی تھی کہ یہ رشوت کے لالچی تمہارے سامنے کتے کے جیسے دم ہلانے کے سوا

کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔“ لڑکی نے جواباً رہیز مہو تر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس کی بات پر رہیز مہو تر اسمیت پولیس انسپکٹر بھی چوکے بنانہ رہ سکا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ رہیز مہو تر نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

جواباً لڑکی نے کوئی جواب دیئے بغیر ایک لفافہ اس کی طرف میز پر اچھال دیا۔ اس نے جھٹ لفافہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اسے یوں لگا کہ ابھی آسمان ٹوٹ کر اس کے اوپر آگرے گا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو بلا خوف و خطر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہ سب تمہارے پاس کہاں سے آیا۔۔۔۔۔؟“ رہیز مہو تر نے اس سے انتظار کیا جواباً لڑکی کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ عیاں ہوئی۔

”چونک گئے نہ تم رہیز مہو تر۔۔۔۔۔؟“ لڑکی نے اس کی بات کا جواب دیئے بنا سوال داغا۔

”کم ذات زبان چلائی ہے میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، بتا کس نے دیا ہے یہ سب کچھ تجھے۔۔۔۔۔؟“ رہیز مہو تر نے یکبارگی اٹھ کر اسے بالو سے پکڑ کر کرسی کی پشت سے نکاتے ہوئے کہا۔ بال اس نے آٹا ناٹا اتنی زور سے پکڑے تھے کہ لڑکی کی ہلکی سی سسکی نکلی مگر جلد ہی وہ اپنے منتشر ہوتے جذبات پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی۔

”اسی نے جس نے مجھے تمہاری قید سے آزادی دلائی۔۔۔۔۔“ لڑکی نے شدت درد کو سہتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”بول کون ہے وہ میں تیری جان بخشی کر دوں گا اگر نہیں بتلائے گی تو تجھے کوئٹہ میں ٹھونس دوں گا۔۔۔۔۔“

رہیز مہو تر کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے ٹاک سکیز کر پیشانی پر سلوٹیں عیاں کرتے ہوئے اب کی بار اس سے پوچھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کسی غلط فہمی میں رہ، تو میرے بھائی کا قاتل ہے۔ تو نے اس کے اعضاء نکالوا کے بیچ ڈالے۔ تو مجھے کیا بخشے گا اور نہ ہی میں جینا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ بس تو کان کھول کر ایک اور خوشخبری سن لے یہ جو فوٹو تیرے ہاتھ میں ہیں ناں ان کی ایک ایک کاپی جگہ نش کے پاس پہنچ چکی ہے اور صبح تک اخبار کے مین بیچ پہ تیرے ان کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے گا۔ علاوہ ازیں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تیری جعلی عزت کی دھجیاں اڑا دیں گے۔۔۔۔۔ تو ایک ایسی موت مرے گا جس کا تو نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا ہوگا۔۔۔۔۔“ لڑکی نے غصے سے بیچ دھاب کھاتے ہوئے کہا۔ جبکہ رہنیز ملہوترا نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی، دوسرے ہی سے اس نے لڑکی کی گردن مروڑ دی اور لڑکی کا مردہ جسم ایک طرف لڑھک کر فرش پر جا گرا۔

”سر۔۔۔۔۔“ انسپکٹر نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے مزید کچھ بولنے سے قبل ہی ایک ٹوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھوں میں تھما تا رہنیز ملہوترا وہاں سے جا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

مادھوری اور جگہ نش کی پہلی ملاقات یونیورسٹی میں ہی ہوئی تھی۔ جبکہ نش ایم اے صحافت کر رہا تھا۔ اسے صحافت سے بہت لگاؤ تھا۔ شروع سے ہی وہ ادبی دنیا سے رشتہ استوار کیے ہوئے تھا۔ ایک مقامی نیوز پیپر میں اس کا کالم بھی آتا تھا اور اس وقت وہ ماسٹر فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا جب اسے ایک اخبار نے اپنے نمائندے کے طور پر رکھ لیا تھا۔ ایم اے صحافت مکمل کرنے تک وہ صحافت کی دنیا کا ایک مشہور صحافی بن چکا تھا۔ اس نے صحافت کی دنیا میں رہتے ہوئے ایسے ایسے کارنامے بائے سر انجام دیئے تھے کہ قتل انسانی دنگ رہ جاتے۔

چند ماہ قبل اسے رہنیز ملہوترا سے متعلق کچھ انفارمیشن موصول ہوئی تھی جو جلد ہی اسے پتہ چل

گیا تھا کہ وہ حقیقت پر مبنی تھیں۔ لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ رہنیز ملہوترا جیسے انٹرنیشنل شہرت کے حامل انسان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتا تھا۔ دوسری طرف مادھوری اور اس کے مابین محبت کی ایک روداد چل رہی تھی جو آخری مراحل میں بھی وہ جلد ہی اسے اپنی چٹنی بنالینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ اس سے قبل ہی رہنیز ملہوترا کی اصلیت دنیا کے سامنے عیاں کر دے۔ جب اسے متواتر نامکامیوں سے دوچار ہونا پڑا تو اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو جو کبھی اس کی گرویدہ رہ چکی تھی۔ اور ایک پارٹی میں اظہار عشق بھی کر چکی تھی اسے ساتھ دینے کا کہا تو اس نے فوراً سے بھی پیسٹر حای بھری۔

اسی دن سے دونوں کی محنت شروع ہوئی۔ اس لیڈی ڈاکٹر نے جس کا نام ڈاکٹر منہما پر تاب تھا۔ ڈاکٹر منہما پر تاب پر تاثر شخصیت تھی۔ جلد ہی اس نے اپنے اثر و رسوخ بڑھائے اور رہنیز ملہوترا کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے رہنیز ملہوترا کو مکمل اعتماد میں لے لیا۔ باوجود اس کے رہنیز ملہوترا نے کبھی اس پر اعتماد کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ رہنیز ملہوترا اس سے وہ باتیں شیئر کرے جن کے حصول کے لیے وہ یہاں آئی تھی مگر وہ اس بات سے بالکل نا آشنا تھی کہ اس کی مکمل طور پر گرانی کی جاری تھی اور جلد ہی اس کی اصلیت رہنیز ملہوترا کے سامنے آگئی اور اس نے اسے بھی قید میں پھینکوا دیا جس میں سے نجانے کیسے وہ جان بچا کے رنو چکر ہو گئی اور اسے پکڑنے کے لیے رہنیز ملہوترا کے آدمی دن رات سرگرداں رہتے تھے۔ مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کے جیسے یوں نود گیارہ ہوئی گویا زمین نکل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔ اب اسے یکبارگی سامنے دیکھ کر ایک بار تو اس کا ماتھا ٹھٹھا تھا مگر پھر اسے خوشی بھی ہوئی کہ پچھلی خود ہی جال میں پھنس چکی ہے اس کی تمام جھٹ پائی تکمیل تک پہنچ گئی مگر اس کے منہ سے اگلی بات سن کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اس نے فوراً سے

بھی بیسترا ہے آدمیوں کو جگہ لیش کے آفس بھیج دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ ثبوت وہاں سے نکال کے لے آئیں۔

ادھر مادھوری ملہو ترا جگہ لیش سے ملنے اس کے آفس گئی مگر وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ آفس جگہ لیش کے انتظار میں بیٹھی ہی تھی کہ ایک ملازم ایک لفافہ جو ابھی UMS آیا تھا رکھ کر اگلے قدموں لوٹ گیا۔ ایسے ہی اس نے اس لفافے کو کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اسی لمحے اسے کسی کے بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے فی الفور اس لفافے کو اپنے پرس میں چھپالیا۔ آنے والا کوئی اور نہیں جگہ لیش ہی تھا۔ جو اسے دیکھ کر چونکا نہیں بلکہ زیر لب مسکرا دیا۔

”آج حیرت تو ہے جناب کے چہرے پر بارہ بکے ہوئے ہیں کوئی پریشانی الحق تو نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“

جگہ لیش نے اپنی چیئر پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ مادھوری نے ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی اور ایک لمبی سانس خارج کی۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ مسکراہٹ کیا تھی گویا کرب کی کیفیت میں ہونٹوں نے کڑوٹ بدلی ہو۔ ”چہرہ ہی ایسا ہے۔“

”واہ۔۔۔ آج صبح ہی مذاق لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔۔۔۔۔؟“ جگہ لیش نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”زندگی نام ہی مذاق کا ہے کبھی مذاق بنادی جاتی ہے تو کبھی مذاق بن جاتی ہے۔۔۔۔۔“ مادھوری نے ٹیبل پر پڑا پیرویت گھماتے ہوئے کہا۔

”کوئی خاص بات ہے ضرور۔۔۔۔۔؟“ اب کی بار جگہ لیش نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے بغیر روکے ہوئے کہا۔

”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“ مادھوری نے اس کی طرف کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوال داغا تو جگہ لیش پر جیسے

ہم آگرا ہو۔

”واٹ یو مین۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اٹس مین کہ تم مجھے کس کام کے لیے یوز کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو آشکار ہو چکا ہے مجھ پر کہ تم مجھ سے محبت کا ٹانک کرتے آئے ہو۔ میرے احساسات و جذبات کو روندتے آئے ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب باتوں کے پیچھے ایسی کون سی وجہ پنہاں ہے جس کی وجہ سے تم ایسا کرتے آئے ہو۔۔۔۔۔؟“ مادھوری ملہو ترا کی دائیں آنکھ کا دایاں کوٹا تقریباً بھیگ چکا تھا۔

”تم اضطرابیت کا شکار ہو یا تم نے کوئی خوفناک پسند دیکھا ہے جو تمہارے حواس پر سوار ہو گیا ہے بھی تو تم ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔“ جگہ لیش نے ورطہ حیرت میں مبتلا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے کوئی اضطرابیت نہیں، نہ ہی میں نے کوئی خوفناک پسند دیکھا ہے جو حقیقت ہے وہ میں جان چکی ہوں۔۔۔۔۔۔“ اتنا کہہ کر مادھوری نے نشست چھوڑ دی اور کھڑی ہو گئی۔

”ایک بات میری کان کھول کر سن لو جگہ لیش اگر تم نے کبھی میرے پتاجی کے خلاف کوئی کنواں کھودنے کی کوشش کی تو ہمیشہ مجھے اپنے مد مقابل پاؤ گے یوانڈر سٹینڈ۔“

”مادھوری تمہیں ہو کیا گیا ہے آخر تم پاگل تو نہیں ہو گئی، کیسی بیوقوفوں والی باتیں کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ جگہ لیش بھی تھسے سے بیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا اور اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اتنا قریب کہ دونوں کو ایک دوسرے کے سانسوں کی زیر و بلب کی آوازیں مترنح سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ بات تمہیں بھی سن لینی چاہیے کہ تمہارے پتاجی خونی ہیں، نجانے کتنے مظلوموں کی جان لے چکے ہیں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ میرا تم سے محبت کوئی ٹانک نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور میں نے آج تک تمہیں یوز کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ رہی بات اپنے

پتائی کی ڈھال بننے کی تو تم ہوا ایک بات یاد رکھنا
مادھوری میرا کام ہے دوسروں کی سیوانہ کہ دوسروں پر
ظلم۔ میں قطعاً یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ اس
قدر بے دردی سے لوگوں کے ساتھ ظلم و ستم ہو، اور اگر تم
اس رشتے کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی چکی ہو تو میں
تمہیں روکوں گا نہیں لیکن یاد رکھنا میری تلوار کی
دھار کے نیچے جو بھی آیا مولی گا جرح کاٹ پھینکوں
گا۔"

ابھی جگدیش نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر دوڑتے
قدموں کی بازگشت سن کر دونوں چونکے۔ دونوں نے
ایک دوسرے کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا۔
مادھوری ملہو ترا سمجھ چکی تھی کہ اس کے پتا کے کارندے
ثبوت حاصل کرنے کے لیے یہاں آ چکے ہیں اور ممکن
ہے ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جگدیش کو ابدی نیند
سلا دیں۔ اس کے دل میں چند سے پہلے پیدا ہونے
والی نفرت کا دھارا ایک بار پھر محبت کی طرف بہہ نکلا۔
تبھی دروازے کے دونوں پٹ زور سے کھلے اور
درجنوں مسلح نقاب پوش اندر داخل ہوئے جنہیں دیکھ کر
دونوں مبہوت رہ گئے۔ جگدیش نے ایک سوالیہ نظر
مادھوری ملہو ترا پر ڈالی، مادھوری ملہو ترا اس کے دیکھنے
سے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے قصور وار سمجھ رہا تھا مگر اس میں
اس کا کیا قصور تھا۔ حالات یکبارگی اتنی کشیدگی
اختیار کر جائیں گے مادھوری ملہو ترا نے کبھی تخیل میں
بھی نہ سوچا تھا۔

"کہاں ہے وہ لفافہ جس میں UMS آیا
تھا۔۔۔۔؟" ایک نقاب پوش نے جگدیش کی کہانی پر
پستول کی نال جماتے ہوئے پوچھا۔

"کون سا لفافہ۔۔۔۔؟ تم لوگ کس لفافے کی
بات کر رہے ہو اور ہو کون تم لوگ۔۔۔۔؟" جگدیش
نے انگشت بندھاں ہو کر پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں خوف و ترہرائی نہ
تھی۔ لیکن وہ خیران و ششدر ضرور تھا کہ یہ سب کون
ہیں اور کس لفافے کی بات کر رہے تھے؟ اسے تو کچھ سمجھ

نہیں آ رہی تھی۔ بس اس کے دماغ میں ایک ہی بات
گردش کر رہی تھی کہ یہ سب مادھوری ملہو ترا کا کیا دھرا
ہے جبکہ مادھوری تو اس کی آمد سے قبل ہی آئی تھی۔ اسے
مادھوری ملہو ترا کے چہرے سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔
خوبصورت دکھائی دینے والے چہرے کی حقیقت اس
قدر بھیاںک ہو سکتی تھی اس نے تو بھی تخیل میں بھی نہ
سوچا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس
کا گلا گھونٹ ڈالے۔

جبکہ دوسری طرف مادھوری ملہو ترا کو کچھ سمجھ نہیں
آ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ مسلح نقاب پوش اس
بات سے فطعی نا آشنا تھے کہ وہاں موجود دو شیڑہ اس کے
باس کی ہی بنی ہے۔ مادھوری ملہو ترا کی کہانی پر بھی ایک
مسلح نقاب پوش پستول کی نال جمائے کھڑا تھا جبکہ
جگدیش یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب مادھوری ملہو ترا کی
چال ہے۔

"ارے کون سا لفافہ؟"

"سالے دی لفافہ جو تیری اس ڈاکٹر منہما پر تاب
نے تجھے UMS کروایا تھا، جس میں ملہو ترا صاحب
کے خلاف مکمل ثبوت تھے بول نہیں تو تیری گردن تیرے
دھڑ سے جدا کر ڈالوں گا۔۔۔۔۔" اسی نوجوان نے
پستول ہٹا کر بازو کے ٹکچے میں جگدیش کی گردن
جکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے گردن اتنے زور سے
جکڑ رکھی تھی کہ جگدیش کو سانس لینے میں بھی دشواری
سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا اس کا رنگ ایک دم سے ہلکی
مائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں متواتر مادھوری
ملہو ترا پر کی ہوئی تھیں جبکہ مادھوری ملہو ترا شرم سے پانی
پانی ہونی جا رہی تھی۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا کہ
کرے تو کیا کرے۔

"ابھی تک تو مجھے ایسا کوئی UMS موصول نہیں
ہوا اور پرار تھا کر کہ ملے بھی نا، اگر مل گیا تو رہیز ملہو ترا
کے تن پر سے چھڑی تک ادھیڑوں گا۔۔۔۔۔"

جگدیش نے اپنی تمام تر قوت کو یکجا کرتے ہوئے بڑی
مشکل سے کہا جبکہ اس کی کھا جانے والی آنکھیں متواتر

مادھوری ملہوترا پر ہی مرکوز تھیں۔ قبل اس کے کہ وہی مسلح
نوجوان جس نے جگہ لیش کی گردن دبوچ رکھی تھی بولتا
اس کا ایک اور ساتھی بول پڑا جس نے آفس کی ہر چیز کو
اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکا تھا اور پورے آفس کا حلیہ ہی
بدل کر رکھ دیا۔

”سریہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس کی بات سن کر اس نوجوان نے ایک نفرت
بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”اس کی تلاشی لو۔“

اس نے جگہ لیش کو اس کی طرف دھکا دیتے ہوئے
کہا۔ اس کے بازوؤں میں جکڑی گردن چھوٹی تو جگہ لیش
کی سانسوں میں سانس آئی۔ اس نے لمبے لمبے سانس
لینے شروع کر دیے۔ جبکہ دونوں مسلح جوان اس کی تلاشی
لے رہے تھے مگر اس کے پاس سے بھی کچھ نہ ملا۔ تو اس
نوجوان نے مادھوری ملہوترا کی طرف منہ پھیرا۔ قبل اس
کے کہ وہ کچھ کہتا مادھوری خود ہی بول پڑی۔

”کوئی غلط قدم اٹھانے سے قبل یہ بات ذہن
نشیں کر لو کہ میں رنیز ملہوترا کی بیٹی مادھوری ملہوترا
ہوں۔۔۔۔۔“

مادھوری ملہوترا کی بات سن کر نوجوان نے سوالیہ
نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً سے بھی
جیشتر اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ مادھوری ملہوترا کا دل
دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جب اس
کے پتا کو اس بات کی خبر ہوگی کہ اس کے جگہ لیش کے
ساتھ سمبندھ ہیں۔ وہ تو اس کو جان سے مار ڈالیں گے
مگر اسے اگلا لمحہ عمل کیا اختیار کرنا تھا اس نے دل میں
سوچ لیا تھا۔

”سریہاں سے ویسے تو کوئی ثبوت نہیں ملا لیکن
جگہ لیش کے آفس میں اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے،
جو کہتی ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے مادھوری ملہوترا نام بتاتی
ہے۔۔۔۔۔ جی ہاں سر۔۔۔ ٹھیک ہے سر۔۔۔۔۔“
نجانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا۔ بات کرتے
ہوئے اس نوجوان نے ایک بھر پور نگاہ مادھوری ملہوترا

پر ڈالی دوسرے ہی لمحے موبائل مادھوری ملہوترا کے
کانچے ہاتھوں میں تھا۔

”جی پتاجی۔۔۔۔۔“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے
بیشکل کہا جبکہ دوسری طرف رنیز ملہوترا کو اپنی قوت
سماعت پر دشاں نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جس سے بات
کر رہا ہے وہ اس کی سب سے لاڈلی بیٹی مادھوری ہے۔

”مادھوری تم اور وہاں۔۔۔ واٹ آٹان
سینس۔۔۔۔۔ تم وہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ رنیز

ملہوترا کے لہجے میں اچانک سے چاشنی سے ترشی پیدا ہوئی۔
”پتاجی انہیں کہیں کہ یہ مجھے آپ کے پاس لے
آئیں پھر میں آپ کو ساری حقیقت بتاتی ہوں، آپ
کے لیے ایک نہایت ہی اچھی نوید ہے۔۔۔۔۔“ اس نے
آٹاناما چپک کر کہا۔ اور ایک طائرانہ نگاہ جگہ لیش پر
ڈالی۔

”تم وہیں رکو میں وہیں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ رنیز
ملہوترا نے مختصر جواب دیا اور مزید کچھ کہنے سے بغیر رابطہ
منقطع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رنیز ملہوترا جگہ لیش کے
آفس میں تھا۔

”پتاجی آپ کچھ غلط مت سوچئے گا اگر میں
بروقت نہ آتی تو ممکن تھا کہ آپ کی عزت، جاہ و جلال اور
رعب و دبدبے کی دھجیاں اڑا دیتا یہ شخص۔۔۔۔۔“
مادھوری ملہوترا نے بات کرتے کرتے ایک دم جگہ لیش
کی طرف منشی بھیج کر انکی سے اشارہ کرتے ہوئے
کہا اور پھر پرس میں چھپایا وہ لفافہ نکال کر اپنے پتاجی
کے ہاتھوں میں تھما دیا جسے دیکھتے ہی رنیز ملہوترا کی
آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے لفافے میں سے
تصاویر نکال کر دیکھی۔

”پتاجی میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں
اور آپ پر کوئی آنچ آئے میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی
میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں لیکن آپ کو کاٹنا بھی چھپے
مجھے برداشت نہیں“

مادھوری نے پتا سے لپٹتے ہوئے کہا تو جگہ لیش کی
حیرت بڑھ گئی۔ وہ کبھی خیال میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ یہ

عورت جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا اسے اس قدر ذلیل و خوار کر سکتی ہے۔ اس نے تازیست جس عورت سے محبت کی تھی وہ اتنی ہرجائی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

”میں تم دونوں باپ بیٹی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔“ جب جلد لیش کے صبر کا پیمانہ بھر پڑا ہو گیا تو اس نے پاس ہی مستعد ایستادہ نو جوان سے اس کی گن چھین کر ان دونوں کی طرف اس کی نال کرتے ہوئے کہا۔ جسے دیکھ کر دونوں نو اس باختہ ہو گئے مگر تب تک رنیز ملہو ترا کے ایک مسلح نو جوان کی گن جلد لیش کا سینہ کو لہوں سے چھلنی کر چکی تھی۔ جلد لیش کے ہاتھوں میں پکڑی گن زمین پر گر چکی تھی۔ اس کی حیرت میں ڈوبی آنکھیں متواتر مادھوری ملہو ترا پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ زیر لب بڑبڑایا مگر اس کی آواز کسی کی قوت سماعت سے بھی نہ ٹکرا پائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا مردہ جسم فرش پر جا گرا۔ پورے کمرے میں خون کے دھبے پھیل چکے تھے۔ مادھوری ملہو ترا اپنی پچھلی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص جو اس سے جان سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا اس کے ساتھ اس نے بے وفائی کی تھی۔ اس کی موت کی ذمہ داری وہی تھی۔

”تم بہت قتل مند ہو بیٹی۔ میرا مانا آن تم پر اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔۔۔۔“ رنیز ملہو ترا نے مادھوری ملہو ترا کے سر پر ہاتھ پیھرتے ہوئے کہا۔

”پتا چلی۔۔۔“ مادھوری ملہو ترا سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تو رنیز ملہو ترا نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بھی آپ کے کاروبار میں شراکت اختیار کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ ایک ایسا جملہ تھا جس نے رنیز ملہو ترا کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر کے رکھ دیا۔ اس نے ایک بھر پور نگاہ اپنی بیٹی پر ڈالی۔

دوسرے ہی لمحے رنیز ملہو ترا اور اس کے کارندوں کی گاڑیاں سرعت سے فرار لے بھرتی جا رہی تھیں۔

مادھوری ملہو ترا باپ کے ساتھ پچھلی نشست پر براہمان تھی۔ جبکہ ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح کارندہ بھی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر براہمان تھا۔ رنیز ملہو ترا اپنی بیٹی کو پورے راستے میں صرف یہی سمجھاتا آیا کہ اسے اس کے کاروبار میں شراکت کر کے کیا کرنا ہے اور کس طرح اپنے فرض منصبی پر پورا اترتا ہے اور کسی بھی قسم کی غفلت کے عوٹ اس کی جان لینے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جائے گا۔ پہلے تو مادھوری ملہو ترا کو چنداں خوف کا احساس ہوا مگر جلد ہی خوف کی وہ لہر ختم ہو گئی کیونکہ جب دنیا میں وہ شخص ہی نہ رہا تھا جس کے ساتھ اس کی زندگی کی ڈوری جڑی تھی تو اسے زندہ رہنے یا مرنے میں فرق ہی کوئی نہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا مقصد اب صرف ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا جو محبت کرتے ہیں اور محبت کے دعویدار بنتے ہیں۔

اس کی نظروں کے سامنے وہ چہرے گھومنے لگے تھے۔ اس کے بہت ہی قریبی چہرے اس کے اپنے چہرے۔ اس نے اس کام کی ابتدا اپنی محبت سے ہی تو کی تھی اور اپنی کوئی پہلے اس چکی میں پیسنے کی سولہ کھا چکی تھی۔

بہت ہی قریبی چہرے۔

پرنت میڈیا اور ایلیٹراٹک میڈیا نے جلد لیش کی موت پر پہلے جام ہڑتال کر رکھی تھی لیکن کسی کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو سکنے کی بنا پر کسی پرائیگی اٹھانا بھی ممکن نہ تھا۔ حالات کی کشیدگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسی حکام نے جلد از جلد انصاف کی یقین دہانی کرائی اور اسی دن ہڑتال اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اور کئی بے گن ہو اں کے جیسے جلد لیش کی فائل بھی پولیس کی روی میں ڈال دی گئی۔

مادھوری ملہو ترا کو رہ کر اپنے قتل پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس نے جلد بازی میں اپنی ہی محبت کو ابدی غنیمت سمجھا لیا تھا۔ وہ کرنا کچھ چاہ رہی تھی مگر آن کی آن میں ہو کچھ گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنی محبت کو اپنی آنکھوں کے سامنے توجہ دے سکتا موت کے گھاٹ

کمرے کی جانب دوڑے۔

☆ ☆ ☆

جنونی کیفیت سے دو چار مادھوری ملبھوڑا اس وقت ایک بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ لمبی لمبکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی اور زرد رخساروں پر ہلکی سرخی کا نشان مترشح دکھائی دے رہا تھا۔ کئی گز رتے لو جوانوں نے اس کی طرف الفت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بس اسٹاپ پر اس کے علاوہ بھی کالج کی کئی اسٹوڈنٹس موجود تھیں مگر اس کے حسن میں جو کشش تھی وہ ان کے حسن میں نہ کہاں تھی۔ وہ آنے جانے والوں کی لپٹائی آنکھوں میں اندنی چاہت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اب اسی حسن کو اس نے آئنا کار بنانے کا عزم بنالیا تھا۔ اور اس حسن کا پہلا شکار انسپکٹر پانڈے ال تھا۔

وہ جانتی تھی کہ انسپکٹر پانڈے اسی راستے سے ہمیشہ گزرتا ہے۔ اسی لیے وہ چنداں آگے ہو کر کھڑی تھی تاکہ دور سے ہی انسپکٹر پانڈے اسے دیکھ لے اور ایسا ہی ہوا جلد ہی اسے انسپکٹر پانڈے کی فراٹے بھرتی دور سے آتی گاڑی دکھائی دی۔ اس نے ادائے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے انسپکٹر خود ہی کھینچا ہوا اس کی طرف گاڑی لے آیا۔ اس کے قریب گاڑی روک کر اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ بس اسٹاپ پر موجود ہر کس ونا کس یہ سب دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر پانڈے بذات خود ایک خوب رو جوان تھا۔

مادھوری ملبھوڑا بچوں جہاں فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ انسپکٹر نے اس کی سمت ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔

”کیا بات ہے آج تمہیں پبلک ٹرانسپورٹ کی کیسے ضرورت محسوس ہوئی، تمہارے تو اپنے گھر میں گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوتی ہے۔۔۔؟“ انسپکٹر نے گاڑی کیئر پر ڈالتے ہوئے سوال داغا۔ مادھوری ملبھوڑا دیکھ رہی تھی کہ انسپکٹر پانڈے جس اسپینڈ سے پیچھے سے آ رہا تھا اس سے کئی گنا آہستہ اب آگے جا رہا تھا۔ شاید وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ

میل بس چلایا اور یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ کبیل ہوا میں معلق لہرا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے چاروں کونوں کو پکڑ رکھا ہو اور اسے جھاڑ رہا ہو۔

خوف کا احساس ترقی پر تھا اور اس کے غالب ہونے کا احتمال تھا۔ آسودگی کی جگہ اضطراب، بے چینی اور بے سکونی کا راج تھا۔ آنکھوں کے جنگنوں ماند پڑ رہے تھے۔ اسے اپنی قوت بینائی پر وشواں نہیں ہو رہا تھا۔ خوف سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ وہ جان بلب کیفیت سے دو چار تھی۔ قرین قیاس تھا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ اسے کچھ بھھائی نہ دے رہا تھا کہ کمرے تو کیا کرے۔ خوف کا احساس اس قدر غالب آچکا تھا کہ وہ چیخا، چلانا چاہتی تھی مگر بے سود۔ ٹرڑ پلنے والی زبان تو جیسے آج اس کا ساتھ دینے سے ہی قاصر تھی۔ ابھی رات ہی کی تو بات تھی جب وہ اپنی سوتیلی ماں کرن ملبھوڑا اور سوتیلی بہن مادھوری ملبھوڑا کو بے گئے جھلے سنا آئی تھی۔ جو کچھ منہ میں آیا تھا سنا دیا۔ دونوں اس کی باتیں سن کر خون کے آنسو پی کر رہ گئی تھیں۔ اس کی اس جرأت پر نہ صرف اس کی ماں ساویری ملبھوڑا نے داد دی تھی بلکہ گردھاوی ملبھوڑا نے بھی اس کے ان اقدام کو سراہا تھا اور اس کا حوصلہ بلند ہوا تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ جلد ہی دونوں ماں بیٹیوں کو یہاں سے چلا کرے گی مگر بائے قسمت اسے کیا معلوم کہ اس کی زندگی کی مشعل آج رات بجھ جائے گی۔

ان کو چلا کرنے کا خواب دیکھنے والی فنامیہ ملبھوڑا خود ہی چلتی بنے گی۔ بے بسی اور بے چارگی کی کیفیت سے دو چار فنامیہ ملبھوڑا ابیم ہوا میں معلق اپنے اس کبیل کو دیکھے جا رہی تھی۔ خوف اور سردی کی ملی جلی کیفیت سے دو چار وہ بند کراؤن سے ٹیک لگائے اپنے آپ میں ہی جھکڑتی چلی جا رہی تھی۔ ابھی اس کی آنکھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا اور پھر نبھانے کیسے اس کے منہ سے ایک سماعت شکن چیخ برآمد ہوئی جسے گھر کے تمام افراد نے سنا اور فوراً سے بھی پیشتر فنامیہ ملبھوڑا کے

گزارنے کا متنی تھا اور یہی تو اس کی بھی خواہش تھی۔

”دراصل گاڑی پتھر ہو گئی تھی۔ گھرفون کر کے ڈرائیور کو بلوانے کی بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کا مزہ اٹھانے کا سوچا اور بس اسٹاپ پر آ گئی۔ پیچھے درکشاپ میں گاڑی دی ہے۔۔۔۔۔“ مادھوری نے انسپکٹر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہر طرح سے اسے اپنے جال میں پھنسانے کا مصمم ارادہ کر کے آئی تھی۔

”فار پور انفارمیشن کہ یہاں دو کلومیٹر دور تک کوئی درکشاپ نہیں ہے۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پاڈے نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا تو وہ ہونٹ بھیج کر رہ گئی۔

”دراصل پبلک ٹرانسپورٹ کا مزہ لینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔“ مادھوری ملہو ترانے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس کا یہ تیرنشانے پر جا لگا۔

”تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔“ انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دم سے گاڑی کو بریک لگائی تو اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ اس نے آنکھیں میاڈ کر انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار آئی تھی۔

”چنتا کیوں کر رہی ہیں آپ۔ بس ہمارا من کر رہا ہے کہ آج آپ ہمارے ساتھ ایک چائے کی پیالی پی لیں۔ اسی بہانے کچھ سے گفت و شنید کا موقع ہمیں بھی میسر آ جائے گا اور ہمارے لیے یہ دن ناقابل فراموش ہو جائے گا وہ بھی اگر جناب کو گوارہ ہو تو۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر نے ایک بھر پور مگر محبت بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا تو وہ جواباً مسکرا دی۔ اور اپنا بھاری بھر کم پرس تھا سے گاڑی سے باہر نکلی۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں ہر طرف گوشت کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ یہی نہیں خون کے دھبے بھی کمرے میں چاروں اطراف دکھائی پڑ رہے تھے۔ یہ ایک ایسا بھیا تک اور جان لیوا منظر تھا کہ جسے دیکھتے ہی سب کی

کھٹکھی بندھ گئی تھی۔ پورہ گھرانہ ماتم کدہ بن چکا تھا۔ کوئی بھی اس آفت ناگہانی سے نبرد آزما ہونے کے لیے مستعد نہ تھا۔ کسی کو کیا خبر کہ آن کی آن میں ان کا خوشیوں بھرا گھرانہ غموں کا گہوارہ بن جائے گا۔ سونے پہ سہاگا چھت سے لٹکے پتھے کے ساتھ فامیہ ملہو ترا کا لٹکا دھڑ سے کٹا سب کا منہ چڑا رہا تھا۔

سادتری ملہو ترا کا تو برا حال ہو چکا تھا۔ رات چنٹی بھلی اس کی بیٹی کمرے میں سوئی تھی۔ کمرہ بھی اندر سے مقفل تھا۔ رنیز ملہو ترا کی قبر آلود صورت پہلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں سے خوف و حیرت کے طے جٹے جذبات کی وجہ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کسی کو بھی کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کو دلاس دے رہے تھے۔ پولیس موقع داروات پر پہنچ چکی تھی۔

چند منٹ بعد ایک لمبے قد کا آدمی جس کا بدن کشیلا اور مضبوط، چہرہ جرات و استقلال کی علامات لیے ہوئے تھا کمرے سے باہر نکلا۔ وہ کوئی اور نہیں انسپکٹر پاڈے تھا۔ اس کی نگاہیں ایک دم سے رنیز ملہو ترا پر جا نکلیں۔ کپڑے شکن آلود اور سر کے بال پورے طور پر جھے ہوئے نہ تھے۔ مونچھیں چھوٹی اور گھڑی گھڑی مگر دہانہ شجاعت کا نشان تھا۔ لیکن اس کے چہرے کا سب سے حیرت انگیز حصہ اس کی بھوری تیز آنکھیں تھیں جو کبھی تیز کبھی متشکر نظر آتی تھیں۔ جن میں شفقت اور ملامت کی جھلک اکثر نمودار ہوتی تھی۔

”ملہو ترا صاحب۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پاڈے نے صوفے پر براجمان سوچوں کے بھنور میں پھنسے رنیز ملہو ترا کو مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ”میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔“

”تشریف رکھیے۔۔۔۔۔“ رنیز ملہو ترا نے تھکے تھکے لہجے میں ہاتھ کا اشارہ سامنے پڑے خالی صوفے کی طرف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

”بہت شکریہ آپ کا۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پاڈے نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ مجھے کچھ ڈنیل سے بتانا پسند کریں گے کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کون سا مجرم ہے جو آپ کے گھر میں داخل ہوا حالانکہ ہمہ وقت درجنوں محافظ آپ کے گھر کی نگہبانی کرتے ہیں۔ یہی نہیں آپ کی دختر کا کمرہ عین اسی طرح جیسے آپ بتا رہے ہیں کہ اندر سے مقفل تھا اور آپ لوگوں نے توڑا تو آخر ایسا اور کونسا چور راستہ ہے جس کا آپ کو بھی نہیں پتا اور قاتل وہاں سے آیا اور آپ کی دختر کو موت کی آغوش میں سلا کر پھروہیں سے ہی چلتا ہوا؟“

انسپکٹر کی بات سن کر اب اس کی بارہمیز ملہوڑا کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ یہ بات تو اسے بہت پہلے ہی سوچنی چاہیے تھی۔ لیکن اس نے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ انسپکٹر کی بات میں واقعی دم تھا۔ درجنوں محافظوں کی موجودگی میں آخر ایسا کونسا چور راستہ ہے جہاں سے آتے جاتے ہوئے قاتل کو کسی نے نہیں دیکھا اور قاتل باسانی آکر اپنا کام پورا کر کے چلتا ہوا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں انسپکٹر صاحب۔۔۔۔۔“

رہیز ملہوڑا نے ورطہ حیرت میں مبتلا ہو کر انسپکٹر پاٹھ سے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے کچھ اور ہی چکر لگتا ہے ملہوڑا صاحب۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پاٹھ نے معنی خیز نگاہوں سے رہیز ملہوڑا پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا۔ جبکہ جواباً رہیز ملہوڑا نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”یہ بھی ممکن ہے ملہوڑا صاحب کہ کوئی آتما داتما کا چکر ہو کیونکہ کسی بھی قسم کے کوئی فنگر پرنس نہیں ملے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ملزم جتنا بھی آتش کا پر کالا ہو ملہوڑا صاحب کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے لیکن یہاں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی ان دیکھی مخلوق نے یہ سب کچھ کیا ہے یا بقول آپ کے انٹرنیٹ میں سے ہی کوئی نکل کر آپ کی بیٹی کو موت کی نیند سلا گیا وہ بھی ایک اذیت ناک موت۔۔۔۔۔“ انسپکٹر نے آخری لفظ آہستہ اور چبا کر ادا کیے اور رہیز ملہوڑا سوچوں کے بھنور میں پھنسا چلا گیا۔

”سوچے ملہوڑا صاحب کہیں آپ کی بیٹی کا کسی

کے ساتھ کوئی لفظ نہ ہوا ہو یا آپ کی فیملی میں سے کسی کا کسی کے ساتھ۔ اس ٹیکنالوجی کے دور میں ان باتوں پر دشواری کرنا بے وقوفیت سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت کو پس پشت ڈالنا دراصل حقیقت ہوتی ہے ملہوڑا صاحب۔۔۔۔۔“ انسپکٹر کی بات میں وزن تھا۔

وہ رہیز ملہوڑا کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر کے خود چلا گیا تھا۔ پولیس اپنی فرضی کارروائی کر کے چلی گئی تھی۔ جبکہ قدامیہ ملہوڑا کے شریک کے بکھرے ٹکڑوں کو یکجا کر کے انہیں چٹا کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی ارنچی گنگا کے سپرد کر دی گئی۔ اب رہیز ملہوڑا کو فکر لاحق ہو چکی تھی کہ اس کے ہاتھوں نہ کسی اس کے کارندوں کے ہاتھوں درجنوں افراد سپرد اجل ہو رہے ہیں۔ اور یہی تو اس کا بزنس بھی تھا۔ لیکن اسے جلد سے جلد ہی کوئی نہ کوئی ادبائے نکالنا تھا۔ اس کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ اسے کسی چیز کی کوئی چٹانک نہ تھی۔ وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی اس آتما کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ کام کسی بھی منٹس کا نہیں ہے کیونکہ اگر یہ کام کسی منٹس کا ہوتا تو کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل چکا ہوتا۔ اول تو کسی منٹس میں اتنی جسارت ہی نہیں کہ رہیز ملہوڑا کے گھر میں آکر اس کے اہل خانہ کو ایذا پہنچانا تو درکنار اس کے گھر کی طرف سیلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

☆.....☆.....☆

مادھوری ملہوڑا ہمیں جلدیش کی موت کا اڑھ رنج ہے لیکن ہونی سے کون واقف ہوتا ہے یہ تو بھگوان کے کام ہیں کسی کو لمبی عمر عطا کر دے تو کسی کو اذیت ناک موت سے دو چار کر دے۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پاٹھ نے چائے کی چسکی حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا تو مادھوری ملہوڑا کو یوں لگا جیسے انسپکٹر کو حقیقت سے آشنائی ہو گئی ہو۔ ایک بار تو اس نے غور سے اسے دیکھا لیکن انسپکٹر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ حقیقت سے آشنا نہیں ہے۔

وہ بہت اچھے تھے۔ سب کی بہت چٹا کرتے تھے

چند انسانی اعضاء مل گئے جنہیں انہوں نے سب کی آنکھوں سے بچا کر ٹشو میں لپیٹ کر کوٹ میں چھپالیا اور ایمر جنسی کا بہانہ کر کے وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ لیبارٹری میں آ کر ٹیسٹ کروایا تو طشت از بام ہوا کہ وہ حقیقت میں انسانی اعضاء تھے۔ لہذا رات کے پچھلے پہر جب کسٹمرز کی آمد و رفت کم پڑ چکی تھی اس نے بھاری نفری کے ساتھ دھوا بول دیا اور پھر جلد ہی ہوٹل کے تہہ خانے سے ثبوت ان کے ہتھے لگ گئے۔

جب اسٹاف کی خاطر تواضع ہوئی تو انہوں نے رنیز ملہوڑا کے اندرون بیرون تمام دھندوں کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اسی رات رنیز ملہوڑا کواریسٹ کر لیا گیا۔ اندرون بیرون اس کے تمام ہوٹلز کو سیل کر دیا گیا۔ یہی نہیں ان تمام ہوٹلز کے اسٹاف کواریسٹ کر لیا گیا۔ دوسری طرف ہسپتالوں میں ہونے والے اس کے سکروہ دھندے کا پردہ بھی فاش ہو گیا۔ انسپکٹر پاٹل سے، انسپکٹر سے ڈائریکٹ کسٹمر کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے اسے ہیرو بنا دیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

رنیز ملہوڑا کی تمام پراپرٹی اور بینک بیلنس حکومت نے اپنے قبضے میں کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے محلوں میں رہنے والوں کو جھونپڑی لگانے کے لیے کیڑا ایک میسرٹ آسکا۔ ادھر بادھوری ملہوڑا کے اندر آتش انتقام نے سراٹھایا۔ وہ پاٹل سے کو اپنے ہاتھوں ابدی نیند سلانے کا معہم ارادہ کر چکی تھی۔ اسی غرض سے اس نے پاٹل سے ملنے کی درخواست کی۔

☆...☆...☆

رنیز ملہوڑا کو سلاخوں کے چپھے ہی یہ نوید سننے کو ملی کہ اس کی جتنی کرن ملہوڑا اور اس کی بیٹی گانتی ملہوڑا کو بھی کسی نے ابدی نیند سلا دیا ہے۔ اسے اپنے پر یوار کے ان دونوں افراد کی چٹا کو آگ لگانے تک کی اجازت نہ مل سکی۔ اسے رو کر اپنی بے بسی و بے چارگی پر رونا آتا تھا۔ اب اس کی آخری بیٹی اور وہ خود ہی گئے تھے۔ نجانے کون تھا جو اپنی دانست میں اس کے

پر یوار کا صفایا کرتا جا رہا تھا۔ رنیز ملہوڑا کو سب سے الگ ایک کال کوٹھری میں قید کر کے رکھا گیا تھا۔ عدالت نے اسے ایک وقت سات مرتبہ پھانسی کا اعلان سنایا تھا اور ساتھ میں یہ بھی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ عدالتی حکم کے دروز بعد ہی اسے پھانسی پر لٹکایا جائے اور اس کی طرف سے کوئی بھی درخواست دائر کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

تک و تار یک کوٹھری میں بنے روشن دان سے شام کا ٹیلا اجالا دھیرے دھیرے اندھیرے میں خم ہوتا رکھائی دے رہا تھا۔ خشک ہوا کے جھونکے نے اس کے کان میں نہانے ایسی کیا سرگوشی کی کہ وہ پھر پھڑا کر رہ گیا۔ یادوں کے چمچی اندھیری کوٹھری سے نکل کر درافتی میں محو پرواز ہونے ہی والے تھے جب اس کی آنکھوں نے ایک ناقابل فراموش منظر دیکھا۔

اندھیری کوٹھری میں دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے ایک انسانی روپ دھار لیا۔ جسے دیکھنے کے ساتھ ہی رنیز ملہوڑا کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے پر یوار کو ابدی نیند سلانے والا کون تھا۔ انسپکٹر پاٹل کے الفاظ اس کی قوت سماعت سے ٹکرائے۔

”یہ بھی ممکن ہے ملہوڑا صاحب کہ کوئی آتما و اتما کا پکڑ ہو کیونکہ کسی بھی قسم کے کوئی ٹنگر پرنس نہیں ملے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ملزم جتنا بھی آتش کا پر کالا ہو ملہوڑا صاحب کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے لیکن یہاں تو یوں لگتا ہے جیسے ہی ان دیکھی مخلوق نے یہ سب کچھ کیا ہے یا بقول آپ کے انٹرنیٹ میں سے ہی کوئی نکل کر آپ کی بیٹی کو موت کی نیند سلا گیا وہ بھی ایک اذیت ناک موت“

واقعی انسپکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ معاملہ کسی آتما کا ہے کیونکہ منٹش جتنا بھی آتش کا پر کالا ہو کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے سامنے دھوئیں سے انسانی روپ دھارنے والی آتما اس بات کا نہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب اس کی زندگی کے

سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے تو تمہارا باپ ایک نہایت ہی گھٹیا انسان تھا۔ نہ جانے بلا ناغہ وہ روزانہ کتنے معصوموں کی جان لیتا تھا۔ ایسا ظالم اور سفاک انسان تو ہم نے نہیں دیکھا، نہ سنا اور نہ ہی کبھی تاریخ میں پڑھا۔ ایسے انسان کو تو زندہ جلا دینا چاہیے۔“

پانڈے کی بات سن کر مادھوری ملبھوترا نے ہونٹ بھیجنے۔ دوسرے ہی سے اس کے پسٹل کی ٹال پانڈے پر تنی ہوئی تھی۔ پانڈے کے مسلح جوانوں نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنی بندوقوں کا رخ اس کی طرف کر کے اس کی طرف بڑھنے لگے۔

”وہیں رک جاؤ ورنہ ٹریگر ہاؤس کی گولی۔۔۔۔۔“ مادھوری ملبھوترا نے ان بڑھتے مسلح جوانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جنہوں نے فوراً سے بھی پیسٹر پانڈے لال کی طرف دیکھا۔ اس نے تصدیق کی تو وہ وہیں اس پر بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پارک میں براہمن باقی لوگ یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

”تم غلط کر رہی ہو جانتی نہیں ہو کہ تمہارا یہاں سے بچ کر جانا ممکن نہیں ہے۔۔۔۔۔۔“ پانڈے لال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پانڈے لال تمہیں ابدی نیند سنانے کے بعد مجھے جینے کا کوئی ادھیکار ہی نہیں ہے۔ میں جینا بھی کب چاہتی ہوں میں تو خود اپنے پر یوار سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ لیکن میرے پر یوار کی خوشیوں کو چھین کر خود قسمت کا دھنی سمجھنے والا انسان مطلب تم، جب تک تمہیں ابدی نیند نہ سلا دوں میرے پر یوار والوں کی آتماؤں کو چھین نہیں آئے گا۔۔۔۔۔“ مادھوری ملبھوترا نے پیشانی پر شکنیں عیاں کرتے ہوئے کہا۔ قبل اس کے کہ وہ ٹریگر ہاؤس ایک نہایت ہی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش دہاں موجود ہر کس و نا کس نے منظر دیکھا۔

پسٹل خود بخود اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں مطلق ہو گیا۔ اس کی کیفیت تو کاٹھ تو جان نہیں

دن گئے جا چکے ہیں۔ چند ساعتوں کے بعد ہی وہ لقمہ اجل ہو جائے گا لیکن اس کے بعد یہ آتما اس کی بیٹی کو ابدی نیند سلائے گی۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں اپنی جان دے کر اپنی بیٹی کی جان بچاؤں گا میں اس سے بڑی کروں گا کہ میری جان لے لے لیکن میری بیٹی کی جان بخشی کر دے۔ ابھی رہنمزا ملبھوترا سوچوں کے بھنور میں کم تھا جب اسے یکبارگی احساس ہوا کہ وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ جیسے ایک دم چونکا اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ واقعی ہوا میں معلق تھا۔ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی فنامیہ ملبھوترا کا انجام دکھائی دیا۔ جس کے شریر کے گڑے پورے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور خون کے دھبے بھی جگہ جگہ لگے ہوئے تھے جبکہ اس کا سرچکھے سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسے انجام کا سوچ کر اس کے منہ سے ایک ساعت ممکن چیخ نکلی لیکن وہ چیخ اس کی زندگی نہ بچا سکی۔

☆.....☆.....☆

مجھے از حد رنج ہے کہ پولیس کسٹڈی میں ہونے کے باوجود ہم تمہارے چاچی کو نہ بچا سکے۔۔۔۔۔“ کشن پانڈے نے مادھوری ملبھوترا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

دونوں اس وقت ایک پبلک پارک میں ایک آنس کریم بار کے سامنے کرسیوں پر براجمان تھا۔ کشن کو مادھوری کی کال اس وقت آئی تھی جب وہ آنس سے گھر کے لیے نکلنے لگا تھا۔ اس لیے گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا وہیں آن دھمکا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ مسلح نو جوان بھی تھے۔ جو وہیں ان کے قریب ہی مستعد موجود تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ رنج اور تمہیں۔۔۔۔۔ اس سارے کپے کرتے کے ذمہ دار تم ہی ہو پانڈے، ہمارے پر یوار کی بربادی کا سبب۔۔۔۔۔“ مادھوری ملبھوترا نے غصے سے پیچ دتا بکھاتے ہوئے کہا۔

”واٹ یو مین۔۔۔۔۔؟“ پانڈے نے حیرت

والی ہو چلی تھی۔ دوسرے ہی کے سب نے اس سے بھی حیرت انگیز منظر دیکھا جب اس کا شریر بھی ہوا میں معلق ہو گیا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے سب کو پکار رہی تھی۔ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا۔ نہ ہی اندھیرے نے ماحول پر قبضہ بھایا تھا۔ ابھی سورج کی باقی ماندہ کرنوں نے کچھ اجالا کر رکھا تھا۔ اور اس اجالے میں سب نے دیکھا کہ وہاں دھواں اکٹھا ہو رہا تھا اور اس دھوئیں نے ایک انسانی روپ دھارنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جلد ہی دھوئیں سے ایک انسانی روپ بن گیا جسے دیکھتے ہی مادھوری ملہوڑا کے ساتھ ساتھ کشتی پانڈے لال بھی انگشت بندھا رہ گیا۔

وہ کوئی اور نہیں جگدیش تھا۔ وہی جگدیش جسے مادھوری ملہوڑا نے اپنے باپ کے کارندوں سے ابدی نیند سلوایا تھا۔ اس کی خونخوار آنکھیں مادھوری ملہوڑا پر جمی ہوئی تھیں۔ سارے پارک میں شہر خموشاں کا سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ ہر کس و ناکس پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں انسان نہیں بلکہ پتھر کے بجسے اکٹھے ہوں۔ جگدیش نے پانڈے لال کی طرف دیکھا۔

”پانڈے لال تمہیں تمہاری کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔۔۔۔۔“ دھوئیں سے انسانی روپ دھارنے والی جگدیش کی زبان میں جنبش پیدا ہوئی اور لفظوں کی ایک مالا نے پانڈے لال کی قوت سماعت پر دستک دی۔ جو اب اس نے شکرانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

”تم حیران تو ہو گے پانڈے لال۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ موت کی وادی میں پہنچنے والا جگدیش آج ایک نئے روپ میں تمہارے سامنے کیسے آن وارو ہوا۔ پہلے تم پر اور مادھوری ملہوڑا پر چند انکشافات کرتا چلوں۔“

ایک نظر دونوں کو دیکھ کر اس نے اپنے پورے شریر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی حالت زار پر سب کو رونما آیا۔ اس وقت اس کی حالت ایسی بن گئی کہ گویا ایک دکھوں کا لاداس کے دل میں کجا ہو گیا ہو اور وہ ہل بھر میں پھٹے ہی والا ہو۔

”دنیا میں سب سے حسین بھگوان کا تحفہ محبت ہے۔ لیکن مجھے محبت کی آڑ میں دھوکہ دیا گیا۔ یہ عورت (مادھوری ملہوڑا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جس پر میں جان سے بھی زیادہ اعتماد کرتا تھا اس نے مجھے دھوکہ دیا اور میں نے ایک ایک کر کے اس کے پر یوار کو ابدی نیند سلایا۔ یہی نہیں تمہاری انویسٹی گیشن کے دوران میں نے ہی رنیز ملہوڑا کے لوگوں کے اندر گھس کر تم پر بھید کھولے تھے۔ کیونکہ میری طرح تم نے بھی سدا سچائی کا دامن تھا۔ میری اور تمہاری منزل ایک ہی تھی۔ ظالم کے ظلم سے مظلوم کو بچانا اور واقعی یہ کام ہم دونوں نے مل کر کیا۔ رنیز ملہوڑا اور اس کی اس بیٹی نے مل کر مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کیونکہ میرے پاس وہ تمام ثبوت پہنچ چکے تھے جن کی بنا پر میں رنیز ملہوڑا کو تھیسٹ تھیسٹ کر سلاخوں کے پیچھے لے جاسکتا تھا۔ میرا انتقام اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے اور آج ایک بار پھر محبت اور عشق و پیار کے جھانسنے میں پھنسا کر یہ ظالم تمہیں ابدی نیند سلانے کا مضمم ارادہ کر چکی تھی لیکن اب اسے ایک ایسی موت دوں گا کہ یہاں موجود ہر کس و ناکس پر آشکار ہو جائے گا کہ اگر دوبارہ کسی نے محبت کی آڑ میں کسی کو دھوکہ دیا تو وہ کبھی بھی ایک بھیانک موت مرنے سے بچ نہیں پائے گا۔“

جگدیش کی بات سن کر پارک میں موجود لوگوں میں خوف و ہراس کی ایک لہر پھیل گئی۔ جگدیش نے سب کی طرف ایک بھرپور نگاہ سے دیکھا اور پھر سب نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ آسمان کی وسعتوں سے آن کی آن میں بے شمار بھیانک شکلوں والے چھوٹے چھوٹے چڑیوں کی جسامت کے پرندے آتے دکھائی دے۔ مادھوری ملہوڑا جگدیش سے زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ جبکہ جگدیش کے کانوں پر جوں تک نہ رہنے والی تھی۔ اور پھر جلد ہی پرندے اس کے سر پر پہنچ گئے اور ہوا میں معلق مادھوری ملہوڑا کے شریر سے گوشت نوج نوج کر کھانے لگے۔ شدت تکلیف کے باعث مادھوری

ی اس زندگی سے سن اکٹا چکا ہے۔۔۔ میں مایا ہے
آب کی طرح تمہاری یادوں میں تڑپنا نہیں چاہتی
۔۔۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔۔۔ میرے
ہمسفر۔۔۔ میرے دلربا۔

اس سے اگلے ورق پر ایک اور تحریر تھی جس کی
عبارت یہ تھی۔

”میں نے تو تمہیں پہچانا چاہا تھا۔ تم تو جانتے بھی
نہ تھے کہ وہ لفافہ تمہارے آئس تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں
تمہیں پہچانے کے لیے ڈھونگ رچایا مگر مجھے کیا خبر کہ وہ
پلک جھپکتے میں تمہیں ابدی خیند سلاویں گے۔ میں کتنی
خود غرض ثابت ہوئی کہ اپنے ہی ہاتھوں تمہیں ابدی
خیند سلانے کا اہتمام کیا۔ کیا ایسی بھی کوئی محبت کرتا ہے۔“
پانڈے لال کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ مادھوری
ملہوڑا اپنی دانت میں جگدیش سے واقعی بہت چاہت
رکھتی تھی لیکن وہ کرنا کچھ چاہتی تھی کر کچھ نہیں۔ جگدیش
کی آتما حقیقت سے آشنا نہ تھی، اسے کاش کہ وہ ایک
بار تو اس کے من میں جھانک کر دیکھ لیتا۔ اصل مجرم
تو نہیں ملہوڑا تھا اس کی موت کے ساتھ ہی سارا قصہ تمام
ہو جاتا تھا لیکن اس ایک ظالم سفاک کی وجہ سے کئی بے
گناہوں کو ابدی خیند سونا پڑا اور اسی پیٹ میں اس کے
اپنے بھی آگئے۔

”سریساں مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں
ہے۔۔۔“ اچانک پانڈے لال کی قوت سماعت سے
اس کے ایک سچ جوان کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے ایک
لباسائس خارج کیا۔ دو زمین پر پڑے پستل کو اس
کے ایک جوان نے قبضے میں لے لیا۔ اس نے ایک نگاہ
اپنے اطراف میں ڈالی۔ ٹیبل پر پڑے گلاسز کو پہنا اور
پھر ان کے ساتھ ہولیا۔ پیچھے کھڑے لوگ ہکا بکا ابھی
تک یقین نہیں کر رہے تھے کہ جو کچھ ہوا آیا حقیقت پر مبنی
تھا کہ ان کی آنکھوں کا دھوکہ تھا لیکن حقیقت سے انکار
تو نہیں کیا جاسکتا۔

ملہوڑا کی سماعت شکن چھین پورے ماحول کو خوفناک
بنادیتی تھیں۔ ہر کس و نا کس کی آنکھیں اسی منظر پر مگی ہوئی
تھیں۔ مادھوری ملہوڑا خود کو ان پرندوں کے چنگل سے
بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر بے سود وہ جس
قدر ہاتھ پاؤں مارتی وہ پرندے اسی قدر اس پر تیزی سے
جھپٹتے اور پھر آن کی آن میں وہ مادھوری ملہوڑا کی ہڈیاں
تک جٹ کر گئے۔ دوسرے ہی سے پرندے دوبارہ
آسمان کی وسعتوں کی طرف ٹھو پر داز تھے۔

سب حیرت کے بت بنے ہوئے تھے۔ کسی کو بھی
اپنی قوت بینائی پر دشا اس نہ ہو پار ہا تھا۔ جگدیش کی آتما
بھی جا چکی تھی۔ اس کی آتما کے جاتے ساتھ ہی جیسے
سب آتما فنا ہوٹھ میں آگئے تھے۔ لوگوں کے رگ و پے
میں خوف سرایت کر چکا تھا۔ دوسری طرف پانڈے لال
کو ایک نامکمل فائل کو مکمل کرنے کے لیے ثبوت مل چکے
تھے۔ اس کے پاس گواہوں کی کمی نہ تھی۔ اس نے ایک
نگاہ ٹیبل پر پڑی آئس کریموں کو دیکھا۔ وہ پانی کی شکل
اختیار کر چکی تھیں۔ مادھوری ملہوڑا کی آئس کریم کے
ساتھ ہی مادھوری ملہوڑا کا پرس بھی ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس
نے اسے اٹھایا اور کھولا تو حیران و ششدر رہ گیا تھا۔

اس میں جگدیش کی ایک ساتھ کئی
تصاویر تھیں۔ اور ایک چھوٹی سی ڈائری بھی تھی۔ جسے اس
نے کھول کر دیکھا ورق گردانی کرتے کرتے اچانک اس کی
نگاہ ایک ورق پر پڑی جس پر کچھ اس طرح تحریر لکھی تھی۔
”میرے جان جگر۔۔۔ میری گیسوؤں کے

اسیر۔۔۔ میرے سپنوں کے راجہ۔۔۔ میرے خیالوں
کا محور۔۔۔ میرے ہاتھوں کی ریکھا۔۔۔ میرے جینے
کی وجہ۔۔۔ میرے مرنے کا سبب۔۔۔ میرے دل
کا گلستان اور گلستان میں لہلہاتے ماحول کو معطر کرتے
پھولوں کی خوشبو سے بنے۔۔۔ میرے گوہر ہائے
آبدار۔۔۔ تمہارے بنا میرا جینا ادھورا۔۔۔ میری
زندگی ادھوری۔۔۔ تمہاری کمی کا احساس مجھے محسوس
ہوتا ہے۔۔۔ من میں دہکتے تمہاری محبت کی آتش کے
شعلوں نے جینا محال کر رکھا ہے۔۔۔ مایا بے آب کی



قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اک ہاتھ خوابوں کی دولت، اک ہاتھ میں کاسہ لائے ہیں
ہم "خاک نشین" تیری چوکھٹ پر اک سجدہ کرنے آئے ہیں
کوئی صحرا پار نہیں بھٹکا، کوئی دریا بچ نہیں ڈوبا
یہ جھوٹے سچے قصے تو کچھ لوگوں نے پھیلانے ہیں!
(انتخاب: ساحل دعا بخاری..... بصیر پور)

کسی کو اس آلی بے وفائی
کسی کو کر دیا رسوا وفا نے
(ملیقہ خان..... پشاور)

دن بدلے نہیں میرے وہ دامن چھڑا گئے
ہم چپ رہ کے بھی اپنا دل جلا گئے
دل و جاں سے جو عزیز تھے احباب بھی
وقت پڑنے پہ وہ بھی نگاہیں چرا گئے
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

حالات کا کیسا شکوہ کرنا حالات نے کس کا ساتھ دیا
تم خود کو بدل کر دیکھو تو حالات بدل ہی جائیں گے
(عثمان فنی..... پشاور)

اور کیسے بتاؤں اپنی بے بسی کی انتہا حبیب
زندیاں میں قید ہوں چڑیا گھر کے شیروں کی طرح
(رانا حبیب الرحمن سینٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور)
مرجھا چکے ہیں پھول تیری یاد کے گھر
محسوس ہو رہی ہے عجیب تازگی مجھے
دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا
کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے
(انتخاب: کاوش عبید کاوش..... نگر ام)

رہے گا تیری گرد میری دعاؤں کا دائرہ حلیم
زندگی کے ہر قدم پہ حفاظت تیری خدا کرے
(محسن عزیز حلیم..... کوٹھاکلاں)

کون کسی کے ساتھ کتنا مخلص ہے راشد
وقت ہر رشتے کی اوقات بتا دیتا ہے
(راشد عزیز..... کوٹھاکلاں)

چمڑ کے مجھ سے اب وہ تک نہ رویا
کوئی تو ہمدرد تھا اس کا جس نے میری یاد تک نہ آنے دی
(دارت آصف خان..... دلاں پھراں)

تمام عمر کی آوارگی پہ ہماری ہے
وہ ایک شب جو تری یاد میں گزاری ہے
مجھے یہ ناز ہے کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ فخر کہ تصویر تو ہماری سے
(حسنین حیدر شاہین..... لالیاں)

پتھر بنادیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیرے غم میں بھگوئے نہیں دیا
تنہائیاں تمہارا پتہ پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا
(انتخاب: اسحاق انجم..... کنگن پور)

یہ کہہ رہی ہے تمہیں جھوٹے آنے والی ہوا
اداس میں ہی نہیں بے قرار تو بھی ہے
(مہر دراز..... کھڑیاں خاص)

تیری محبت میں یہ کیسا احساس ہے
کہ تو دور ہو کر بھی میرے دل کے پاس ہے
(نسیم..... قصور)

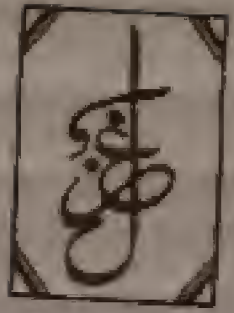
جانے کیوں یہ گماں ہوتا ہے
کہ وہ نظر آئے گا سر راہ چلتے وقت
خدا لکھ دے گا اسے میری قسمت میں
کسی قبولیت کی گھڑی میں شام ڈھلتے وقت
(عبدالستار انجم اسلم..... قصور)

یہ بات میاں ہے دنیا پر ہم پھول بھی ہیں کموار بھی ہیں
عزت سے جئے تو جی لیں گے جام شہادت پی لیں گے
(عرفان علی..... دیپالپور)

ہاتھوں کی لکیروں میں ہم جسے ڈھونڈتے رہے
پتہ چلا وہ کسی اور کا نصیب تھا
(رخسانہ..... دیپالپور)

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے جیسے کی کوئی شمع جلانے جاتے
(عابد..... کراچی)

☆☆



درد دل پال کے میں نے یہ جانا ہے
ترے پیچھے صدیوں سحر اٹھاتا ہے
آؤ کسی دن بھول کے دل کی گھڑی میں
تم کو اپنے دل کا راز بتاتا ہے
کیسے سمجھو گے تم پیار کی باتوں کو
اپنا حال وہی ہے، روگ پڑا ہے
ایک کسی محسوس تمہاری ہولی ہے
موسم آج بھی کتنا سہانا ہے
ہاتھوں میں اب جام اٹھالو رانا جی
تھوڑی دیر کو اپنا دور بھلاتا ہے
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

ڈوبتے چاند کا منظر نہیں دیکھا جاتا
ہم سے آنکھوں کا سمندر نہیں دیکھا جاتا
چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی ویرانی ہے
ایرا، اجڑا سا یہ اب گھر نہیں دیکھا جاتا
ہم نے ہر موڑ پہ مانگی ہے محبت تم سے
تیرے ہاتھوں میں یہ پتھر نہیں دیکھا جاتا
حاکم وقت سے سمجھوتہ میں کیسے کر لوں!
دل میں اترا ہوا خنجر نہیں دیکھا جاتا
کسی معصوم کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو!
کسی مفلس کا مقدر نہیں دیکھا جاتا
بچھ نہ جائے کہیں امید کی شمع ہی ٹھیکم
اب تو آنکھوں سے کھلا در نہیں دیکھا جاتا
(حکیم خان حکیم.....حضرہ)

تم مجھے چاہو گے اک دن دیکھنا
ہاں چلے آؤ گے اک دن دیکھنا
یوں کر دست میرے جذبوں سے مذاق
ورنہ پچھتاؤ گے اک دن دیکھنا
سوچ لو یہ بے رخی اچھی نہیں
خود کو تڑپاؤ گے اک دن دیکھنا
میرے چہرے کی جھلک کے واسطے
تم ترس جاؤ گے اک دن دیکھنا
آہ سوزاں نے جلایا ہے مجھے
تم بھی جل جاؤ گے اک دن دیکھنا
درد اتنا سہہ نہ پاؤ گے سنو
لوٹ کر آؤ گے اک دن دیکھنا
خانم اپنے دل کی یہ آواز ہے
تم سمجھ جاؤ گے اک دن دیکھنا
(فریدہ خانم.....لاہور)

آج پھر کوئی یاد ماضی سے ہم رکاب نظر آتی ہے
چاندنی سی جب کوئی دلیر پہ اتر آتی ہے
اکثر اس دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے
جب وہ دور ہی سے اپنا آنچل لہرائی ہے
میرے وطن کی فضا میں حسین تر ہو جاتی ہیں
جب گھٹا چار سو اپنا رنگ دکھلاتی ہے
جب کبھی میں تیرے کشتوں کی بات کرتا ہوں
ہر دل میں تبدیل سی جلتی نظر آتی ہے
خود بڑھ کے تمام لیتی ہے منزل ان کو
پائے استقامت میں لرزش سی جن کے نظر آتی ہے
شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں و امق عذرا کے زمانے تو گئے
اب تو عاشقی کھلی کھلی در بدر نظر آتی ہے
کاغذی پیرہن ہے اعضاء کی نمائش جاری ہے
بے حیائی سڑکوں پہ بال کھولے نظر آتی ہے
اس مازنین دربار کی تو کیا بات ہے واجد
قدم پھولوں پر پڑتا ہے نظر تاروں پہ جاتی ہے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گینوی.....کراچی)

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے ہیں آج کل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خار زادوں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم لے لے ہیں ہم کو

نہیں "تعبیر" تھی اس کی
اسے اک شب سلا آئے...!!!
(انتخاب: دعا عالم بخاری... بصیر پور)

وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
(محمد اسلم جاوید... فیصل آباد)

تھا مگر سے باہر جانا ٹھیک نہیں
تم معصوم ہو اور زمانہ ٹھیک نہیں
صاف دلوں کو پھر سے میلا کر دیں گی
گزری باتوں کو پھر سے دہرائے ٹھیک نہیں
ایسی چیزیں دور سے اچھی لگتی ہیں
چاند کو اپنے پاس بلانا ٹھیک نہیں
آؤ میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھو
سائل کو خالی ہاتھ لوٹانا ٹھیک نہیں
رفتہ رفتہ تعبیریں بہ جانی ہیں
نم آنکھوں میں خواب سجانا ٹھیک نہیں
چھوڑ نوید ان پتھر دل انسانوں کو
اپنے دل کا حال سنانا ٹھیک نہیں
(نوید قمر... کلکشن کراچی)

جب ملنے لگا اس کی محبت میں سکون
پھر یوں ہوا وہ میرا ساتھ چھوڑ گیا
ابھی بہت تھیں حسرتیں دل میں
مگر وہ شخص ادھوری ملاقات چھوڑ گیا
خیر تو یہ ہے کہ وہ تھا میرا ہم سفر کبھی
دکھ یہ ہے کہ وہ سچ راہ میں میرا ہاتھ چھوڑ گیا
ہن اس کے رہنا اب اک عذاب سا لگتا ہے
نہ جانے زندگی میں وہ کیسے جذبات چھوڑ گیا
وہ بے وفا شخص تو چلا گیا اس زندگی سے
مگر آنکھوں میں میری آنسوؤں کی برسات چھوڑ گیا
(دارت آصف خان... بھجراں)

کہو! وہ چاند کیسا تھا؟
جدھر آنکھیں گنوا آئے، جدھر سب کچھ لٹا آئے
کہا! سیلاب جیسا تھا...
بہت چاہا کہ غم نکلیں، مگر سب کچھ بہا آئے
کہو...! وہ ہجر کیسا تھا؟
جوانگی سے چھوٹنے، تو تم نے کیا بھلا پایا؟
کہا! بس آگ جیسا تھا، اسے چھو کر تو اپنی روں
یہ تن من جلا آئے...
کہو! وہ وصل کیسا تھا؟
تمہیں جب چھو لیا اس نے، تو کیا احساس جاگا تھا؟
کہا! بس راستوں جیسا... جدھر سے بس گزرنا تھا
مکان لیکن بنا آئے...
کہو! وہ عشق کیسا تھا؟
بنا سوچے، بنا سمجھے، بنا پرکھے کیا تم نے...؟
کہا! ساطلوں پہ لکھے نام جیسا تھا
اسے اک دن، کسی بل، کسی رو میں مٹا آئے...
کہو! وہ چاند کیسا تھا...؟

میرے قرب سے میرے وجود تک
اسے اختلاف تو سدا کا تھا
میرے غم سے میرے جنون تک
یہ فاصلہ بس اتنا کا تھا
میری زندگی سے میری سانس تک
وہ فلسفہ بس دعا کا تھا
میری بات سے تیرے ذکر تک
کوئی سلسلہ جو ہوا کا تھا
میرے حقیقت سے تیرے خواب تک
وہ بے خبر انتہا کا تھا
میرے وہم سے میرے گمان تک
یہ مرحلہ جس وفا کا تھا
میری طلب سے میرے نصیب تک
یہ معاملہ تو صرف خدا کا تھا
(بلقیس خان... پشاور)

آسمان سے جراتر آیا... تمہاری آنکھوں میں بسنے؟
کہا! بس خواب جیسا تھا...

ہر کی کھاد بھی جاوے اثر نکلتی ہے

علم و ہنر کو سامنے رکھ کر بات ہم اپنی سنائیں
تب وہ ہماری بات سنیں گے تب وہ ہمارے ساتھ چلیں گے!
دانش مندی کا ہے تقاضا پیار محبت سے پیش آئیں!
الفت سے ہم جوڑ کے رشتہ نفرت سے ہم توڑ کے رشتہ!
لوگوں کی اصلاح کی خاطر اک اچھی تنظیم بنائیں
(محمد شفیق اعوان..... حضور، ایک)

بے وفا سے مانگتے ہو وفا کیا کرتے ہو
اور دل ٹوٹنے تو کرتے ہو مقدر پہ شکوہ کیا کرتے ہو
جو رکھتے نہیں دل میں اپنے درد محبت
درد دل کی مانگتے ہو ان سے دوا کیا کرتے ہو
چھوڑ جائیں جو تمہیں دے کر زخم جدائی کا یارو
پھر بھی کرتے ہو ان سے وفا کیا کرتے ہو
جس شجر کو تم زمین میں لگا ہی نہیں پائے
کیوں مانگتے ہو پھر اس سے نشوونما کیا کرتے ہو
جنہیں فرق نہیں پڑتا تیرے ہونے یا نہ ہونے سے
بات بات پہ ہو جاتے ہو ان سے نفا کیا کرتے ہو
آج بنے ہوئے ہیں جو حبیب تمہاری جان کے دشمن
اور تم مانگتے ہو ان کی زندگی کی دعا کیا کرتے ہو
(رانا حبیب الرحمن..... سینٹرل جیل لاہور)

چہرے سے کتاب کا آنکھوں سے غزلوں کا پیام نکلتی ہو
تم مجھے خوبصورت شاعری کا منتخب کام نکلتی ہو
جان بہار بدلتے موسموں کی طرح چاہا ہے تمہیں
کہ تم مجھے سردیوں کی دودھ گرمیوں کی شام نکلتی ہو
جی نہیں بھرتا میرا جتنی بار بھی پڑھوں تمہیں
کہ تم مجھے محبت کے خط میں پیار بھرا پیام نکلتی ہو
ہر کوئی یہ خوشی اپنے سر لینے کو تیار ہے
کہ تم مجھے محبت کا خوب صورت الزام نکلتی ہو
صحیح جان کر بھی مانی نہیں کبھی کسی کی بات
کہ میری طرح تم بھی اپنے دل کی غلام نکلتی ہو
جی چاہتا ہے ایک ہی سانس میں پی جاؤں تمہیں
کہ تم مجھے شراب کا بھرا جام نکلتی ہو
جسے دیکھو حاصل کرنے کی جستجو میں ہے

مناس شاخ پر بن کر ٹر نکلتی ہے
جو میرے ساتھ ہے اس کو تو ڈھونڈنے کے لئے
چراغ ہاتھ میں لے کر سحر نکلتی ہے
مری طرف سے اجازت ہے دیکھ لو خود بھی
کوئی جدائی کی صورت اگر نکلتی ہے
عجیب بات ہے آئی ہو جب کوئی مشکل
تو پہلی فال مرے نام پر نکلتی ہے
غرور اتنا نہ کرا اپنی شان و شوکت کا
یہ خوش گمانی تو کٹوا کے سر نکلتی ہے
میرے خیال میں تغیر شش بہت کیلئے
تری کلی سے کوئی رہگور نکلتی ہے
نہ رات سختی ہے راحت نفاں صید یہاں
نہ دھوپ دیکھ کے طرف سحر نکلتی ہے!
(انتخاب: کاشف عبید کاوش..... بے سوڑی فکر ام)

اک دن یہ بھی تماشا ہو جاتا ہے
ہستا ہستا دریا سحرا ہو جاتا ہے
جیسے کوئی خوف سے پیلا پڑ جائے
چاند اچانک ایسے نیلا ہو جاتا ہے
جانے اس کو کیسے ستر آتے ہیں
جو بھی اس کو دیکھے اس کا ہو جاتا ہے
تمن اکیلے، چار اکیلے، سات اکیلے
اور پھر ہر کوئی اکیلا ہو جاتا ہے
جانے اس کو چھوٹنے کی تاثیر ہے کیسی
زخم کوئی بھی ہو، سچ سچ اچھا ہو جاتا ہے
(حسین حیدر شاہین..... لالیاں)

اللہ کے ہم بن کے سپاہی راہ حق میں جان لٹائیں
مظلوموں کے حامی بن کر ظالم سے ہم ٹکرائیں!
آپس کے سب جھگڑے مٹا کر اپنا علم لہراتے جائیں!
دور کریں ہم دل سے نفرت یکسوئی سے قدم بڑھائیں
جن کا جہاں میں کوئی نہیں ان کا سہارا بن کر ہم
مدد کریں ہم ان کی مل کر! ان کا ہاتھ بنائیں
دل نہ دکھائیں کبھی کسی کا ثبوت ہو تنقید ہماری!

کہ تم مجھے محبت کا اعلیٰ مقام ملتی ہو
کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں ملتی
کہ تم مجھے کہانی کا تمام ملتی ہو
(احسان محرم..... میانوالی)

کیوں تم اس دنیا کو ظلم کا نشانہ بنانے لگے ہو
کیوں تم ایک دوسرے کا خون بہانے لگے ہو
کیوں آخرت کو بھلا رہے ہو
کیوں اس دنیا کو اپنا رہے ہو
کیوں آزادی کو ٹھکرا رہے ہو
کیوں غلامی کو اپنا رہے ہو
کیوں ہمدردی کو بھلا رہے ہو
کیوں دولت کو اپنا رہے ہو
کیوں نعم! انسان علم کو بھلانے لگے ہیں
کیوں جاہلیت کو اپنانے لگے ہیں
(نعم اللہ..... ہڈالی)

اس نے جس روز مجھے دل سے بھلایا ہوگا
خون آنکھوں سے سر شام بہایا ہوگا
مسکرا کر جو کسی سے بھی وہ ملتا ہوگا
اس کی باتوں میں میرا ذکر تو آیا ہوگا
اس نے ماضی کی تصویر اٹھائی ہوگی
اور پھر سر کو بھی دیوار سے ٹکرایا ہوگا
سوچتا ہوگا میرے بارے میں بے سببی سے
اپنی انگلی کو دانتوں میں دبایا ہوگا
یاد آیا ہوں، تو یاد آتا رہوں گا اس کو
جس نے لکھ لکھ کر میرا نام سنایا ہوگا
جاننا ہوں کہ وہ تنہائی میں روتا ہوگا
میری تصویر کو سینے سے لگایا ہوگا
بھلا کر بھی مجھے یاد کرتا ہوگا وہ
کئی بار اسے میرا خیال آیا ہوگا
اس کا دل زور سے دھڑکا بھی ہوگا حلیم
نکس جس نے میرا کاغذ پر بنایا ہوگا
(محسن عزیز حلیم..... کوشا کلاں)

☆☆

ہم تیرے لئے کیا کرتے ہیں لب کھول کے تو دیکھ ذرا
سب کچھ کریں گے تیری خاطر کچھ بول کے تو دیکھ ذرا
فنس کے کہیں گے سب تم تیرے اف نہ کریں گے قسم سے
روغن بیاباں یا جنگل میں رول کے تو دیکھ ذرا
ہر ایک عہد ہر اک قول ہر اک بات ہر وعدے میرے
بے وزن نہیں ملیں گے تم کو قول کے تو دیکھ ذرا
ہم نے کتنے شوق سے لگائی تھی دل سے پریت تسمی سے
میرے دل میں جو بات ہے وہ تم پر بول کے تو دیکھ ذرا
اپنی ہر اک خوشی میں تجھ پر لٹا دوں گا سوں رب دی
تو کبھی اپنے دل کے دکھڑے ہم سے بول کر تو دیکھ ذرا
میرا دعویٰ ہے مجھ سا نہ ملے گا قسم سے کوئی تمہیں
ہم جگ میں سے کوئی مطلوب سا کول کے تو دیکھ ذرا
(مطلوب اللہ خان دہاڑی)

چھیڑو نہ رزم پرانے دوستو
آئی ہے یاد طیب کی رلانے دوستو
پھٹتا ہے کلیجہ میرا طیب کی جدائی میں
لگی ہے میری روح اب کرلانے دوستو
پھر کارواں عام سفر ہوئے دیوانوں کو لے کر
کب ہوگا نصیب میں اپنے جانے دوستو
آئی ہیں یاد مدینے کی وہ پر نور نضائیں
لگی ہیں میری آنکھیں اشک بہانے دوستو
سینے میں اٹھتی ہیں درد کی لہریں ہر دم
لگی ہے شہری جال مجھے تڑپانے دوستو
حجرۃ اماں عائشہ ہے مرکز انوار رحمت
کب جاؤں گا میں یہ رحمتیں پانے دوستو
دور ہوں تو کیا مجھے ہے یقین اک دن
وہ آئیں گے خواب میں جلوہ دکھانے دوستو
دعا ہے بخاری خدا سے یوں جائیں مدینے

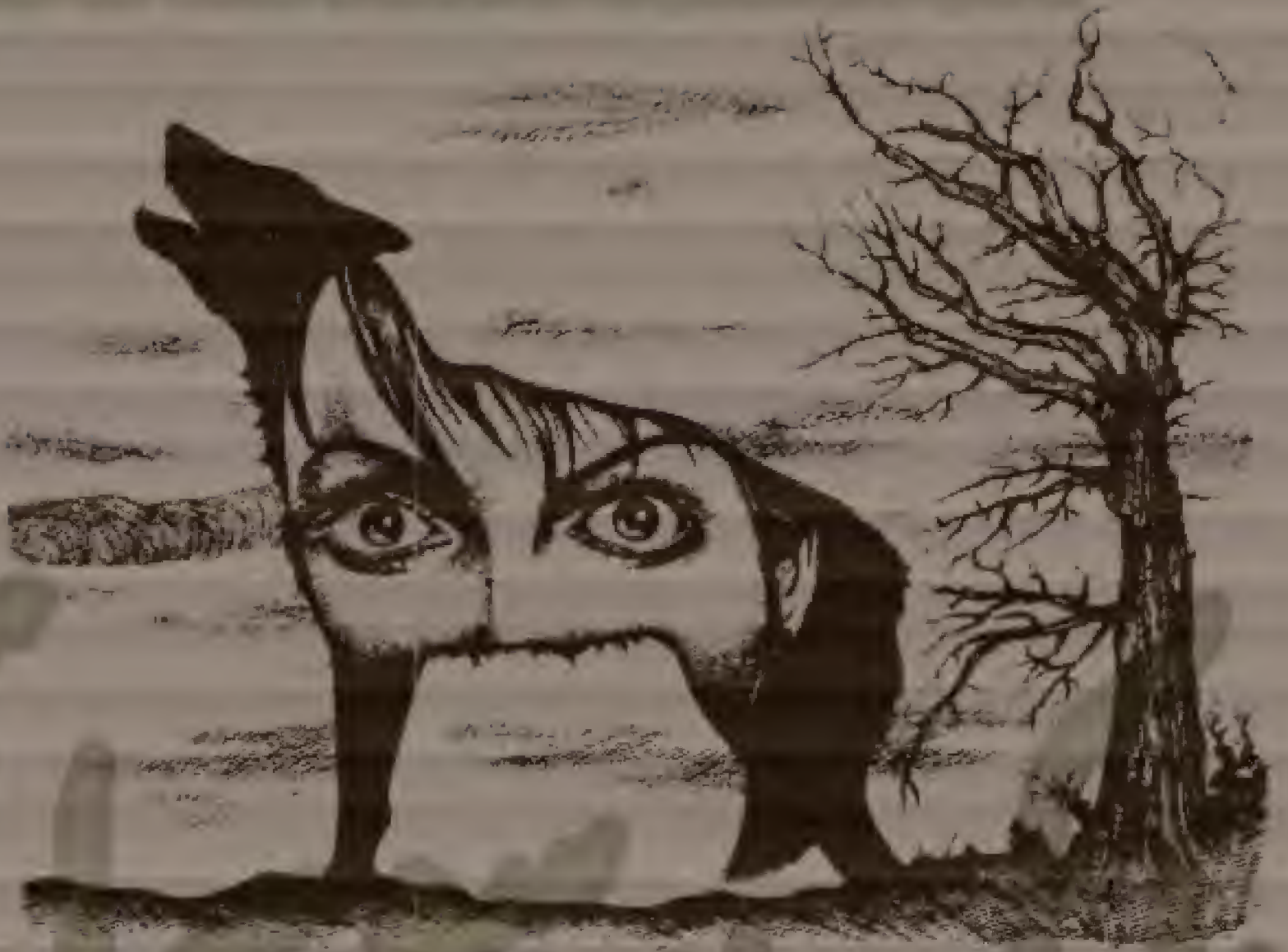
ستم بن گئی، مہربانی تمہاری اندھیارے سب چھٹنے دیکھے میرے وطن کی شاہراہیں
یہاں تک بڑھی، بدگمانی تمہاری بول ہوا تھا حق کا بالا خون سے سرخ، سرخ اور صرف سرخ رہی تھی
یقین ہے چلو بات مانی تمہاری تھے اخلاق کبھی کے اعلیٰ میرے وطن کی بائیں!۔
دفاؤں کے وعدے زبانی تمہاری مظلوموں کے غم بھاگے تھے بیٹوں کو کفن پہنائی رہی تھی
مجھے بھر میں چین ملا نہیں ہے ستم رسیدہ شاد ہوئے تھے میرے وطن کے معصوم لوگ
ستاتی ہے یاد آ کے جانی تمہاری بے چینوں کو ملا قرار کھتے رہینگے مرتے رہینگے۔۔۔
قیامت کی شوخی بلا کی ادائیں علم کا جگ میں بڑھا وقار مگر۔۔۔ ایہ دعویٰ ہے میرا!۔
غضب کی ہے کافر جوانی تمہاری نقش بدل گیا دنیا کا میرے وطن کی تاریک گلیوں میں
تمہارا لڑکپن ہے اس کی ضمانت اسلامی پرچم لہرایا امید کا روشن دیا ضرور چلے گا
اٹھائے گی فتنے جوانی تمہاری (چوہدری قمر جہاں علی پوری۔۔۔ ملتان)
نہ تم امتیاز اس جگہ جاؤ ہرگز کیوں مجھے ملا نہیں
جہاں پہ نہ ہو قدر دانی تمہاری تو مرا ہوا نہیں
(ایس امتیاز احمد۔۔۔ کراچی)

غم حیات نے رکھی ہے آمد میری غم حیات نے رکھی ہے آمد میری
وگر نہ ستا یہاں کون کھنگو میری! عشق مرض لا دوا نہیں
ہر ایک لمحہ تجھے دل صدا میں دیتا ہے مجھ کو صبر و ضبط کا
تلاش کرتی ہے تجھ کو یہ آرزو میری کچھ صلہ ملا نہیں
دیار عشق کو بخشش ہیں شہر میں نے جو ملا ہے کوڑے پ
ہر ایک لب پہ کہانی ہے سرخرو میری ماں بھی اس کی کیا نہیں؟
خوشی سے دیکھ کے اس کو چٹک پڑے آنسو ہے قلم پر فخر کیوں؟
بوقت دید رہی آنکھ بادلو میری منصف ہو خدا نہیں
گر ادیا تھا کبھی جس نے اپنی نظروں سے دعا کا صرف رب نے بھی
سنا ہے آج اسی کو ہے جستجو میری یہی لگا! سنا نہیں
زبان کھولی تھی میں نے حکیم حق کے لئے (فریدہ خانم۔۔۔ لاہور)
سنی گئی نہ کسی سے بھی کھنگو میری وہ اک شخص تھا جس سے شکایتیں تھیں بہت
(حکیم خان حکیم۔۔۔ کابل پور سوئی)

ظلم لگا تھا حد سے بڑھنے جہل لگا دل میں گھر کرنے
تب ایسے میں آئے آقا
دنیا پر پھر چھائے آقا
لوگوں کی امید بندھی تھی
لطف کی تب بارش ہوئی تھی
پودے جہاں کے پھٹے دیکھے
وہ اک شخص تھا جس سے شکایتیں تھیں بہت
وہ عزیز تھا اس سے محبتیں تھیں بہت
وہ جب ملا تو دل میں کوئی طلب ہی نہ تھی
پچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنوں نے ہی کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت
ہر موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے
ہماری روح تھی تہا اور قیامتیں تھیں بہت
(ملک این اے کاوش۔۔۔ سلا نوالی)

دیوانوں کی دیوانگی پر بننے والے بہت
زندگی کو سزا بنانے والے بہت
یہ طے ہے کہ غم کسی سے نہیں کہتا
بن آنسو آنکھوں کو رلانے والے بہت
آنکھوں کے ویپ جٹے یا جیا جٹے
یہاں درد کے سودے باز بہت
کاش کہ لفظوں کو خول پہنا سکوں
درد کشید کرنے والے تماشا بہت
کسی کو پرکھنا مت اسے سحر
عزت سے رسوا کرنے والے بہت
(وجیہہ سحر۔۔۔ جوہر آباد)

☆☆



خاموشی

سائل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان حصار میں بیٹھا عمل پڑھ رہا تھا، اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ چوکس و چوکنا رہے اور غلطی نہ کرنے کی احتیاط برتے، لیکن نوجوان سے غلطی سرزد ہوتے ہی موت نے جھپٹنا مارا اور نوجوان کا گلہ دیوچ لیا۔

برسوں دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت کے لبادے میں لپٹی ہوئی شاہکار کہانی

تھا..... اس سے قبل اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی سے کچھ ”مانگ“ بھی سکتا ہے؟ مانگنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہ تھا..... یہ اس کی ”فطرت“ کے برعکس تھا۔ مگر..... محبت ایسی ہی منہ زور اور سرکش ہوتی ہے۔ ”مقدر“ کی طرح منہ زور اپنی مرضی سے انسان کو جدھر چاہے، ہانک کے لئے جائے، شاہ کو گدا بنادے..... اور ”صوت“ کی صورت، سرکش..... انسان لاکھ بھاگ

اس کی چال میں سد یوں کی تھکن تھی۔ گرد آلود پاؤں، طویل مسافت کا پتہ دیتے تھے..... بلیک ٹراؤزر اور بلیوئی شرٹ سلوٹوں سے پر تھی۔ پیشانی پہ بکھرے بال بھی اس کی لا پرواہی کے شاہد تھے۔ سیاہ، گہری آنکھیں حزن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ شیوہ لگی بڑھی ہوئی تھی اور لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے..... وہ ”گداگر“ تھا..... ہاں! وہ محبت کا گداگر

Dar Digest 207 May 2015

لے بکر اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتا... عقاب اور چیتے
کی طرح جھپٹ کر دبوچ لینے والی

لی طرح بچپن کر دینا چاہیے۔
اگر دیکھا جائے تو انسان کی پوری زندگی ان تین
”میموں“ کے مدار میں گھومتی ہے..... ہر چیز کا معاوضہ
ہے۔ انسان معاوضہ دے کر کوئی بھی کام دوسرے سے
کروا سکتا ہے، مگر یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا کوئی
معاوضہ نہیں..... یہ تینوں انسان کو خود اپنی ذات پہ جھیلانی
پڑتی ہیں۔

پڑی ہیں۔
 ”مقدر، محبت، اور موت.....“ انسان ہر چیز
 دوسروں سے بدل سکتا ہے..... جوتے، کپڑے حتیٰ کہ
 جسمانی اعضاء بھی..... لیکن..... انسان کسی سے اپنا
 ”مقدر“ نہیں بدل سکتا..... معاوضہ دے کر اپنے حصے کی
 ”مشقت“ تو دوسروں کے حوالے کر سکتا ہے، مگر اپنا
 ”مقدر“ نہیں..... مقدر میں لکھے دکھ، لکھی ٹھوکریں بہر
 صورت خود ہی کو کھانا پڑتی ہیں۔ اس طرح، انسان اپنے
 جذبات، اپنی محبت بھی کسی صورت، کسی اور کے حوالے
 نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ”مجھ سے فلاں چیز لے لو
 مگر اس کے بدلے محبت کی اذیت تم جھیل لو.....“

نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ محبت کا کرب بھی
بہر حال خود کو ہی سہتا ہوتا ہے۔۔۔ اور ٹھیک اسی طرح
انسان اپنے حصے کی "سوت" بھی دوسرے کو نہیں دے
سکتا۔۔۔ پوری کائنات کی قیمت پر بھی نہیں۔۔۔ مرنا بھی
ہر صورت، ہر حال میں، ہر طور "خود" ہی پڑتا ہے
ان کے آگے انسان کھل "بے بس" ہے۔۔۔ بے بس تو
اور بھی بہت سی چیزوں میں ہے، مگر ان میں سے بچنے کی
کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے، کچھ خواہشات بھی
بے بس کر دیتی ہیں۔۔۔ اگر موت سے بچا جاسکتا تو انہیا
کرام علیہم السلام ہمیشہ یہیں رہتے۔۔۔ کبھی "پردہ پوش"
نہ ہوتے۔۔۔

اگر محبت سے بھاگنا جاسکتا تو گریباں چاک کئے
 مجنوں ہو کر صحرائوں کا رخ نہ کرتا۔۔۔ رانجھا کبھی "جوگ"
 نہ لیتا۔۔۔ کسی کبھی صحرائوں کی گرم ریت میں دفن نہ
 ہوتی۔۔۔ ان تینوں چیزوں کی گرفت سے بچنا ناممکن

فاروق حیدر نے درخت سے زمین پر بکھرے
خسک پتوں کو ہٹا کر جگہ صاف کی..... ٹراؤزر کی جیب
سے چھری نکال کر، حصار کھینچا اور لب بھینچ کر بیٹھ گیا.....
حصار کے باہر بھی خاموشی تھی اور حصار کے اندر بھی
خاموشی تھی..... اس نے موت سے بچنے کے لئے حصار
کھینچا تھا..... حصار کے باہر موت تھی، حصار کے اندر
محبت اور حصار کے اوپر مقدر..... وہ ایک "میم" سے
دوسری "میم" مانگ رہا تھا..... اور تیسری میم..... تیسری
میم کا کیا کر، ار تھا؟ اس کا فیصلہ تو پہلی میم نے کرنا تھا۔

میں کا کیا کر رہا تھا۔ بس اس کا یہ دل تھا کہ وہ اپنے دل کی شبیہ
 فاروق کی سیاہ آنکھوں میں "دل نور" کی شبیہ
 تھی۔۔۔۔۔ دل نور۔۔۔۔۔ وہ پیکر نور۔۔۔۔۔ جو اس کے دل کا ہی
 نہیں، روح کا بھی نور تھی۔۔۔۔۔ اور آنکھوں کا نور تو تھی
 ہی۔۔۔۔۔ اس کے لب خاموش تھے۔۔۔۔۔ سختی سے بھنپے تھے،
 مگر۔۔۔۔۔ دل مسلسل ایک ہی نام کا درد کر رہا تھا۔
 آنکھیں بظاہر سامنے درخت پر جمی تھیں مگر بصیرت و
 بصارت ایک ہی چہرے کا طواف کر رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ سراپا
 بے بس، سراپا سوال تھا۔۔۔۔۔ محو دعا، محو التجا، محو ندا تھا۔
 مقدر سے محبت۔۔۔۔۔ میم سے میم مانگ رہا تھا۔۔۔۔۔ سر پر
 براجمان میم نے اسے "میم" دینے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔۔۔ مگر
 ابھی اسے مانگنے والے کی "طلب" کو پرکھنا تھا۔ پھر بعد
 میں۔۔۔۔۔

Dar Digest **208** May 2015

دل نور شیرازی اس کی خالہ زاد تھی۔ لیکن ستم یہ کہ ”صرف“ خالہ زاد نہیں تھی۔ اس کی پسند تھی..... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہمیں اچھی لگتی ہے پھر دلچسپی بڑھنے لگتی ہے، حتیٰ کہ وہ چیز ہماری خواہش، پھر طلب، پھر ضرورت اور پھر مجبوری بن جاتی ہے، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا..... دل نور اس کی ضرورت سے بھی آگے بڑھ کر ”مجبوری“ بن گئی تھی۔

بھکاری ”خواہش“ نہیں بناتی، بھکاری ”مجبوری“ بناتی ہے۔ مثلاً ہمیں کوئی سوٹ پسند آ جاتا ہے، ہم اسے لینے کی خواہش کرتے ہیں، لیکن اگر وہ سوٹ پہلے ہی کوئی اور لے چکا ہو یا پھر اس میں کوئی ”نقص“ کھل آئے تو ہم اس سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ یہ خواہش ہے.....

لیکن..... اگر ہمیں پیاس لگی ہے، ہم پیاس سے قریب الرگ ہیں اور کسی کے پاس پانی ہے، مگر پیالہ ٹوٹا ہوا ہے، ہم اس ٹوٹے ہوئے پیالے میں پانی پی لیں گے..... یہ مجبوری ہے۔ مجبوری نقص سمیت قبول کرنے کا نام ہے.....

اس کی محبت بھی ایسی ہی تھی بلکہ محبت ہوتی ہی ایسی ہے..... تمام تر خامیوں اور نقص سمیت اسی اور صرف ”اسی“ کو پانے کی طلب میں پاگل..... محبت مجبوری ہے..... اور مجبوری تو نہ چاہتے ہوئے بھی ”کرتے“ کا نام ہے..... یہ از حد حقارت سے ہمارے ہاتھوں میں کشکول تھما دیتی ہے اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کشکول تھام لیتے ہیں..... اور پھر اسے بھرنے کی چاہ میں نکل کھڑے ہوتے ہیں مگر یہ اور بات ہمیشہ ایک ہی دور پہ کسی اجڑے ہوئے درخت کی طرح منجمد کھڑے رہتے ہیں..... پھر اگر اس ”کاسہ دل“ میں ”کاسہ عشق“ میں حسن چاہت کی، توجہ کی خیرات کا ایک سکہ بھی ڈال دے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا..... گویا دونوں جہاں مل گئے..... لیکن اگر ”وہ“ ایک نظر کا سکہ بھی نہ ڈالے اور باقی پوری دنیا کی دولت و محبت اس کا سے میں ڈال دی جائے تب بھی یہ خالی کا

خالی ہی رہتا ہے کیونکہ کسی اور سے یہ کبھی بھرنے والا نہیں..... اسے صرف ”وہی“ بھر سکتا ہے..... وہ نہ بھرے تو کوئی بھی نہیں بھر سکتا.....

اس کا کاسہ دل بھی خالی کا خالی تھا..... اور یہ خالی پن کسی طور بے قرار کرتا ہے، کاش! اس کے لئے کوئی لفظ ہوتا جو بیان کیا جاسکتا..... مگر..... فاروق اکلوتا تھا.....

حیدر شیرازی ایک کامیاب بزنس من تھے اور صوفیہ حیدر سوشل ورکر..... دولت کی فراوانی اور ماں باپ کی محبتوں نے فاروق حیدر کا وہی حال کر دیا تھا جو کرنا چاہئے تھا وہ مغرور تھا..... خود پسند تھا اور..... ابا ہالی تھا..... اسے دولت، محبت اور خوبصورتی وراثت میں ملی تھی..... مگر اسے مقدر وراثت میں نہیں ملا تھا..... مقدر ہر ایک کا جدا جدا ہوتا ہے..... اس کا بھی جدا تھا.....

☆.....☆.....☆

تاریکی بے حد گہری تھی..... بے حد گاڑھی..... تنہائی نے کسی بوزھے سے برگد کی طرح زمین میں دور دور تک اپنی جڑیں پھیلا رکھی تھیں، قبروں کے کتبے کسی عفریت کی طرح لگتے تھے..... برگد کا اکلوتا پیڑ عالم یاس میں سر جھٹکائے ہوئے تھا اور پیڑ پہ ”مسکن“ خاموشی کی دہشت، موت کی دہشت پہ بھی ہماری محسوس ہوتی تھی۔

قبرستان میں جا بجا موت بکھری تھی..... زندگی مر گئی تھی..... آوازیں مر گئی تھیں..... اور جب زندگی مرجائے تو موت اسے زیر زمین لے جاتی ہے..... خاموش زندگی کو زیر زمین پا کر خدا جانے مطمئن تھی یا پھر افسردہ..... اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ..... وہ خاموش تھی..... اور اس کا چہرہ سپاٹ تھا..... کسی بھی تاثر سے یکسر عاری۔

قبرستان میں خاموشی کی حکومت ایسی قوی تھی کہ مسلسل چیخنے رہنے والے جھینگر بھی دم سا دھمے ہوئے تھے۔ قبرستان کی شکستہ چار دیواری ٹوٹ پھوٹ کے

سنہری رنگت، تکیلی ناک، یا قوتی ہونٹ اور شفاف،
سنہری مائل سبز آنکھیں..... کمر تک گرتی سیاہ آبشار اور
سناج میں ڈھلا کاج کا پیکر..... اسی کو پانے کے لئے تو
وہ اتنی خطرناک جگہ، ایک خطرناک عمل کرنے آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ان دنوں دل نور کے لئے ایک رشتہ آیا ہوا
تھا، لڑکا مہروز بخت اسریکے کارہائشی تھا اور دل نور کو کافی
پسند تھا وہ.....

اسے اس بابت علم ہوا تو وہ اس کے مقابل جا
ٹھہرا..... "آخر کیا ہے اس میں، جو مجھ میں نہیں؟" آنج
دینا لہجہ ہلکا سا تلخ تھا۔ "پتہ نہیں۔" اس کی سبز آنکھوں
میں ناگواری در آئی۔ "تم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو
دل نور؟" "نونا ہوا لہجہ ٹکھرا ٹکھرا تھا۔

"تم مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو فاروق؟"
اس نے اہردا چکا کر پوچھا۔ لہجہ سرد تھا۔

"پتہ نہیں....." اس کے انداز میں بھرپور بے
بسی تھی۔ بھلا محبت کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے؟

"اسی طرح مجھے بھی نہیں پتہ کہ مجھے تم سے
نفرت کیوں ہے۔" اس نے نرمی سے وضاحت کی تھی
اور اس کا "نرم انداز" بھی اس کی آنکھوں میں کرچیاں
بن کر چھاتا تھا۔

"پلیز..... مجھ سے شادی کر لو دل! تمہیں بہت
خوش رکھوں گا، جو کہو گی، کروں گا، تمہاری ہر بات مانوں
گا۔" کیسی شدت کی خواہش چل رہی تھی اس کی آواز و
انداز میں.....

"سوری فاروق! مگر میں تم سے شادی نہیں
کر سکتی اور پلیز اگر تم میں ذرا بھی انسانیت باقی ہے تو
آئندہ میرے راستے میں نہ آنا۔" یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے
سے مڑ گئی۔

وہ پتھر کا بت بنا اس کی لہرائی زلفوں اور
سر سراتے دوپٹے کو دیکھے گیا۔ لفظ بھی کیا جادو بھرے
ہوتے ہیں۔ پل بھر میں جیتے جاگتے وجود کو پتھر میں
ڈھال دیتے ہیں۔ "ایک ہی لفظ کہا تھا اس نے۔"

یا وجود سرتانے کھڑی تھی۔ موت اس چار دیواری کے
اندر "محصور" تھی۔ مگر..... کیا واقعی موت "محصور" تھی؟

اس وقت ایک ایک سایہ قبرستان میں بکھری، موت سے
بچ بچ کر چل رہا تھا..... مگر خشک پتوں کی طرح جا بجا
بکھری موت پہ پھر بھی اس کا پاؤں آتی گیا..... اس کا
دل دھک سے رہ گیا..... خوف نے اس کے دل کو
فولادی گھونسہ رسید کیا اور اس کی روح تک ٹھہرا گئی تھی۔

قبرستان خاموشی کا گھر تھا اور وہ خاموشی سے
"زبان" مانگنے آیا تھا..... آواز مانگنے آیا تھا.....

قبرستان موت کا گھر تھا..... اور وہ "موت" سے
"زندگی" مانگنے آیا تھا..... مقدر اب بھی اس کے سر پہ
سایہ نلکھن تھا اور یہ ہمیشہ سر پہ سایہ نلکھن ہی رہتا ہے.....

محبت اب بھی اس کے دل، اس کی رگوں، اس
کی روح اور اس کی شہ رگ میں اپنے نوکیلے دانت
گاڑے ہوئے تھی..... اور اس کے نوکیلے دانتوں کی
چیمیں اسے بے قرار کئے دیتی تھی۔ اور یہ بے قراری اس
کے وجود میں "پارہ" بن کر چل رہی تھی..... ایک عجیب
ساخوف اس کی رگوں میں نیچے گاڑنے لگا تھا۔

وہ بزدل تو کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ مگر قبرستان کا

ماحول ایسا ہولناک اور وہاں خود رو جھاڑیوں کی طرح سر
ابھارے ہوئے "موت" کا تاثر ایسا بھیاٹک تھا کہ اس
جیسا غڈ انسان بھی ہر اسان تھا..... گاڑھی تاریکی،
مہیب خاموشی، چلاتا سناٹا، سنسناتا سکوت اور قبروں میں
لپٹی موت.....! کسی کو بھی خوفزدہ کر سکتی تھی۔ دیرانی ایسی

تھی کہ اسے لگا اس کا سارا وجود، روح سمیت یکا یک
ویران..... بے حد ویران ہو گیا ہے۔ سارے خیالات

کہیں تحلیل ہو گئے تھے۔ یکا یک ایک آواز اس کی
سامعتوں میں نیزے کی انی بن کر اتری..... "مجھے نفرت

ہے تم سے....." اس کے دل کو کسی نے جلتے انگاروں پہ
رکھ چھوڑا تھا۔ سنہری مائل سبز آنکھوں کی ناگواری اسے

بری طرح تڑپا گئی تھی اس نے بے اختیارانہ ضبط کی
کوشش میں نچلا لب دانتوں تلے چل ڈالا۔ اس کی

بصیرت و بصارت ایک ہی چہرے پر مرکوز ہو گئی۔ وہ

دنیا

دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ ان جیسی کوئی چیز نہیں جیسا کہ آب زم زم جیسا کوئی پانی نہیں۔

نماز جیسی کوئی عبادت نہیں۔

حج جیسی کوئی زیارت نہیں۔

اسلام جیسا کوئی مذہب نہیں۔

قرآن پاک جیسی کوئی کتاب نہیں۔

مدینے جیسا کوئی شہر نہیں۔

درود شریف جیسا کوئی خزانہ نہیں۔

کے جیسی کوئی دولت نہیں۔

جمعے جیسا کوئی دن نہیں۔

رمضان جیسا کوئی مہینہ نہیں۔

(شرف الدین جیلانی - مُنڈ والہ یار)

اظہار کر دیا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں، خود میرا اور سونیا کا بھی یہی خیال تھا۔ میں آج ہی سونیا سے بات کرتی ہوں۔ میرے خیال میں شایان بھائی اور خود دل نور کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" وہ پر جوش ہو گئیں۔

اگلے چند دن میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ دل نور نے انکار کر دیا تھا۔ وہ وجہ جاننے کو اس کے پاس گیا تو اس نے دل نور کی سنہری مائل سنہرے آنکھوں کی بیزاری دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جسے ہم سب سے زیادہ چاہیں، اس کی ہم سے بیزاری تکلیف تو دیتی ہے ناں!

وجہ دل نور نے یہ بتائی تھی کہ "کوئی وجہ نہیں۔ بس فاروق! میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ شاپنگ کے لئے جا رہی تھی۔ اسے وجہ بتا کر گاڑی میں بیٹھی اور..... چلی گئی۔

"پتھر کا ہو گیا ہوں میں" پاس ابھرنے والی سرسراہٹ اسے حال میں کھینچ لائی۔ اسے یاد آیا کہ وہ شہر خموشاں میں کھڑا ہے، اس نے کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ان نظروں میں فقط ویرانی تھی۔ جیسے قبرستان میں پھیلی ساری ویرانی ایک دم اس کی آنکھوں میں آن سمائی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی حواس میں لانے کی سعی کی جو کہ قدرے کامیاب ٹھہری، اس نے جگہ منتخب کرنے کے لئے سیل فون روشن کیا۔ تاریکی آن کی آن میں اپنا زخم زخم وجود لئے نو دو گیارہ ہو گئی۔ چند لمبے روشنی چار سو رقص کرتی رہی۔ پھر ایک جگہ ٹھہر گئی..... جیسے اسے کسی نے کیلوں کی مدد سے گاڑ دیا ہو.....

جگہ منتخب ہو گئی..... مگر وہ جگہ کس شے کے لئے منتخب ہوئی تھی۔ یہ خدا ہی جانتا تھا..... تخت، یا تختہ زندگی، یا موت..... وہ چند قبروں کے بیچ خالی پڑی جگہ تھی۔

اسے دائرہ کھینچ کر وہاں بیٹھنے میں محض چند لمبے ہی لگے تھے..... اب پھر..... اس کے لب سختی سے ہیوست تھے..... لبو کی روانی، دل کی دھڑکن اور سانس کی لرزش ایک ہی نام کا ورد کر رہی تھی..... بصیرتوں اور بصارتوں پہ ایک ہی چہرہ معلق تھا۔ خاموشی آنکھوں میں طیش لئے اسے تک رہی تھی اور اس کے سر پہ سایہ فلک، بخت کا سنہرا، جھلکا تا تاج پہنے "مقدر" اس کی طلب کی "شدت" کو پرکھ رہا تھا۔ جا بجا رہا تھا۔ فاروق کی آنکھوں میں نی آن ٹھہری تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے خود بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ کب دل نور اس کے دل میں آن بسی تھی۔ اسے علم بھی ہوا تھا جب دل کے چپے چپے پہ اس کی حکمرانی ہو گئی تھی۔ پہلے وہ حیران ہوا تھا..... مگر یہ محبت ہمیشہ "شب خون" ہی مارتی ہے..... پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی محبت اس کی دسترس میں تھی۔ لہذا اس نے بڑے آرام سے صوفیہ حیدر کی آغوش میں سر رکھ کر اپنی خواہش کا

فاروق ناکام پلٹ آیا۔۔۔۔۔ اگلے چند ہفتوں میں اس نے بخوبی جان لیا کہ وہ لاکھ کوشش کر لے، مگر نہ تو وہ دل نور کے بغیر رہ سکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی اور کا ہوتا دیکھ سکتا ہے۔ اس نے دل نور کو بھلانے کی ہر کوشش کر ڈالی تھی۔ مگر ناکامی ہی ہاتھ آئی تھی۔

ڈرنک کے نشے میں دھت ہو کر بھی اس کے دل دو مانغ پہ فقط اسی کا خیال مسلط رہتا تھا۔ پارٹیز میں جگمگاتا ہر چہرہ دل نور کے تلخ چہرے میں ڈھل جاتا تھا۔ بہر حال ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد اس نے ہار مان لی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یارا میں ایک بابا جی کو جانتا ہوں جو گارنٹی دیتے ہیں کہ ”سگنڈل سے سگنڈل محبوب آپ کے قدموں میں۔“ سفر کی بات پہ بیزاری سے لینا فاروق ایک دم سیدھا ہوا تھا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

”سلوئی فیروز یاد ہے تمہیں؟ وہ جو بائنی ڈیپارٹمنٹ کی تھی اور ارسلان حسن کے بغیر تقریباً پاگل ہو گئی تھی؟“ وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ”وہ انہی بابا جی کے پاس گئی تھی اور دیکھ لو، آج ارسلان حسن کی چہیتی بیوی ہے۔“

فاروق کی بھی آنکھیں ایک دم روشن ہوئی تھیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ اگلے ہی لمحے وہ اسفر کو کھینچ کر گاڑی کی طرف جارہا تھا۔

پھر وہ عامل کے پاس پہنچ گئے۔ ساری باتوں کے بعد عامل بولا۔

”عمل بظاہر آسان ہے مگر۔۔۔۔۔ بے حد خطرناک ہے۔ یہ کسی خاموش جگہ کرنا ہوگا اور ہنا کوئی بھی آواز نکالے۔۔۔۔۔ کوئی بھی منظر ہو، تمہیں اف بھی نہیں کرنا۔۔۔۔۔ اگر تم نے منہ سے ذرا بھی آواز نکالی تو۔۔۔۔۔ جان سے جاؤ گے۔“ وہ اسے عمل کی بابت مزید

بتانے لگے کہ اس کے تصور میں مطلوب چہرہ ہی رہنا چاہئے۔ نیز ہر سانس اور ہر دھڑکن کو اسی کا نام لینا چاہئے۔۔۔۔۔ عامل نے مزید بتایا کہ ”یہ عمل ٹھن دن کا ہے۔ ایک رات ویرانے میں یا جنگل میں اور دوسری دو راتیں قبرستان میں کرنا ہوگا۔ اس نے اس عمل سے کامیاب ہونے والوں کے نام گنوائے۔ جو آج اپنی محبت کو پاپکے تھے۔

☆.....☆.....☆

گھور اندھیروں کی بستی میں، جس ہنر غلام کریں پھر سے ہم یہ آنسو بچھیں، روشنیاں غلام کریں اک دنیا ہے دشمن اپنی، ایک زمانہ قاتل ہے کس کس کے سر تہمت باندھیں؟ کس کس کو بدنام کریں؟

دھوپ سے اجلا روپ ہے اس کا، سونے جیسی صورت ہے ہم اجڑی تقدیروں والے، کیسے اس کو رام کریں۔۔۔۔۔

اک اڑتے بادل کا سایہ، کب تک ساتھ بھائے گا۔۔۔۔۔

پھر بھی کچھ سستائیں یاد آ رہی ہیں آرام کریں گو کہ وہ ”دشمن جاں“ ہے مگر پھر بھی ہماری ”جان“ ہے زیست کے یہ آخری لمحات بھی، آؤ اسی کے نام کریں معلوم ہمسیر، ہے کہ ہماری یاد اسے بل بھر کو بھی نہ چھوٹی ہوئی پھر بھی ہر بل سوجھیں اس کو، اس کے عشق میں صبح و شام کریں

تار کی آسمان پہ چمکتے تاروں کے باوجود بے حد مہیب تھی۔ خاموشی کسی جھنستی ہوئی بدروح کی مانند قبروں کے بیچ چکراتی پھرتی تھی۔ اس نے ننگے پاؤں سے سبے انداز میں اٹھتے اور پڑتے تھے، خاموشی کو گمان تھا کہ وہاں صرف اس کی حکومت ہے۔ وہاں اور کوئی نہیں۔۔۔۔۔

مگر اسے غلط لگتا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔۔۔۔۔ وہاں تین ”میسز“ تھیں۔۔۔۔۔ اور چوتھی میم کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہاں! وہاں ایک عدالت بھی تھی۔ ایک فیصلہ ہوتا تھا۔ وہاں مقدر منصف تھا۔۔۔۔۔

فیصلہ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں محبت اک شان ہے نیازی سے براجمان تھی۔۔۔۔۔ وہاں موت ایک جھماڑی کے عقب میں محو انتظار تھی۔ موقع کی تاک میں تھی کہ

کب اسے موقع ملے اور وہ کسی چپے کی طرح جھپٹ کر اپنے شکار کو دیوچ لے..... اور وہ سب تیسری میم یعنی "مانگنے" والے کا، فاروق کا انتظار کر رہی تھیں، وہ آج پھر مانگنے آ رہا تھا..... اب پتہ نہیں اسے آج کیا ملنے والا تھا۔ لیکن وہ بے خبر تھیں کہ وہاں ایک پانچویں میم بھی موجود ہے..... اور وہ ان سے بھی زیادہ شدت سے آنے والے کا انتظار کر رہی ہے.....

دفعتاً خاموشی کے قدم تھم گئے۔۔۔ آنے والا آ رہا تھا..... قدموں کی موہوم سی آہٹ اس کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ آج قبرستان میں خشک پتوں کی بہتات تھی۔ دور کہیں کیدڑ بین کر کے رونے لگا۔ اس کی منخوس چیخوں نے خاموشی کے کانچ کے نازک وجود میں گویا پتھر دے مارا۔ خاموشی کا وجود ترخ گیا اور اس میں دراڑیں پڑ گئیں..... جیسے بھر زمین میں پڑی ہوتی ہیں..... پھر برگد کے درخت پہ الو چلایا تو خاموشی کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ فاروق کے قدم خشک پتوں پہ پڑے تھے اور خاموشی کی سسکیاں خشک پتوں کی کراہوں میں ڈوب ڈوب جاتی تھیں۔

نارج کا روشن دائرہ کل والی جگہ آ کر تھم گیا۔ خوف گویا ہر قبر سے سر باہر نکال رہا تھا۔

فاروق نے حصار کھینچا اور محصور ہو گیا۔ خاموشی کے وجود کے بکھرے ریزے..... جو کہ ریت کی مانند بکھر چکے تھے، یکا یک یکجا ہو گئے۔ یوں کہ جیسے کبھی بکھرے ہی نہ تھے۔ اب "خاموشی" چپ چپ، دم سادھے، فاروق کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں "سلوت" تھا مگر "سکون" نہیں تھا..... بے چینی حصار کے گرد تیزی سے چکرار ہی تھی..... بے قراری ہر قبر پہ بیٹھی رو رہی تھی اور خوف..... خوف اثر دے گا روپ دھارے سارے میں بل کھا رہا تھا۔ ستارے گا بے بگا ہے پلکیں جھپکتے تھے۔ چاند کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

فاروق..... محو التجا تھا..... محو ندا تھا..... محو صدا تھا..... محو دعا تھا..... لمحے ایک ایک کر کے قبروں پر سے پھسلے رہے..... آج رات زیادہ سخت تھی مگر فاروق بنا

ڈرے بیٹھا تھا..... سانپوں کا خوف، قبرستان کے تمام مردے جو کہ یکبارگی قبریں پھاڑ کر باہر نکل آنے والے تھے، ان کا خوف، حتیٰ کہ موت کا خوف بھی اس کے پاس نہ پھٹکا تھا..... بس اب کچھ ہی دیر جاتی تھی اسے منزل ملنے والی تھی..... سر پر براجمان مقدر نے قلم تھاما اور فیصلہ کھینچ ڈالا..... مگر وہ فیصلہ کیا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا سوائے اللہ کے..... اور اللہ تو ہر چیز سے بخوبی واقف ہے ہی۔

دفعتاً ایک زبردست گونج پیدا ہوئی..... جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں..... جیسے آسمان یکلخت گر پڑے ہوں..... جیسے زمین یکا یک "دولخت" ہو گئی ہو..... جیسے سورج کا گولہ پھٹ گیا ہو..... فاروق کی بھارتوں نے دیکھا کہ ایک طویل ترین سایہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ نجانے کیوں مگر اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک اٹھا۔ سایہ قریب آتا گیا۔ اس کا چہرہ تیرگی کے وجود میں بھی واضح تھا اور اس کے خدو خال..... بے حد عجیب اور دہشت آمیز تھے، اسے دیکھ کر خود بخود ہی دل پر اس کی نوکیلی جھاڑی سے جا الچھتا تھا، اس کی سرخ آنکھوں میں آگ دھک رہی تھی اور پشت پہ بکھرے لمبے بال ہو اسے مسلسل لہرا رہے ہوں..... "یہاں میری حکمرانی ہے۔ کیوں میری سلطنت میں آیا ہے؟" اس نے غرا کر کہا۔ اس کی غراہٹ کسی درندے کی دھاڑ سے مشابہہ تھی۔

فاروق جو اب خاموش رہا..... اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں کیوں آیا یہاں؟" وہ چلا اٹھی۔

مگر نتیجہ صد صحر ا۔

"تو تو نے یہ طے کر رکھا ہے کہ نہیں بولے گا؟" دیکھ اب کیسے بولتا ہے تو..... اس آواز کی رعد کی سی کڑک تھی۔ وہ ایک دم پلٹی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی گئی۔ وہ بے نیازی سے بیٹھا رہا.....

مگر..... اگلا لمحہ ایسا تھا کہ وہ "بے نیازی" کو

بھول گیا۔ وہ طویل نسوانی پیکر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی تھا اور..... اور وہ "کوئی" دل نور تھی۔ ہاں بلا شک دلاریب وہ دل نور ہی تھی۔

تارکی کے اندھے وجود کی کوکھ میں بھی وہ دل نور کو..... دیکھ سکتا تھا۔

"باہر آ کر اسے بچا سکتے ہو، تو بچالو....." خاموشی غرائی۔

اس نے اپنا منہ کھولا..... اس کے لبے..... کموار کے سے دانت چمکے..... دل نور سہم گئی۔ "مم..... مجھے بچالو فاروق۔" اس کی آواز دہشت زدہ تھی۔

فاروق کی رگوں میں بہتا سارا خون یکبارگی اضطراب میں ڈھل گیا، خاموشی نے اپنی نوکیلی انگلیوں سے دل نور کے نازک وجود کو دبوج لیا۔

"فاروق.....!" دل نور بے قراری سے پکار اٹھی۔ وہ "یقرا" تھی تو پھر فاروق کیسے "قرا" سے رہ سکتا تھا؟

"او کے! تم شاید اسی لئے یہ عمل کر رہے ہو کہ میں مرجاؤں، تو ٹھیک ہے، مجھے مرنے دو۔" دل نور نے کہا اور وہ تڑپ اٹھا۔

"دل نور....." اس کے لب بے ساختہ پکار اٹھے۔ اس کی یہ حرکت قطعاً شعوری تھی..... وہ بھول گیا تھا کہ اسے دوران عمل بالکل خاموش رہنا تھا..... وہ بھول گیا تھا کہ دکھائی دینا منظر نظر کا فریب ہے۔ اسے یاد رہا تھا تو صرف اتنا کہ دل نور مشکل میں ہے۔

خاموشی اب دل نور کا گھا دبوچ رہی تھی۔ "دل نور....." وہ بے اختیار اٹھ کر اس کی جانب لپکا۔

"عمل....." اس کے بولنے سے ٹوٹ گیا تھا۔

"حصار" اس کے باہر نکلنے سے ٹوٹ گیا..... خاموشی کے ہاتھ ساکت رہ گئے..... دل نور کسی بے جان شے کی طرح اس کی گرفت سے پھسل کر گر گئی..... شان بے نیازی سے بیٹھی محبت منائے میں رہ گئی..... مقدر دلچسپی سے دیکھے گیا..... عین اسی لمحے..... موت نے کسی چپتے کی سی پھرتی سے جھپٹا مارا اور فاروق کا گھا دبوچ لیا۔

وہ سانس لینے کے لئے تڑپنے لگا..... اس کا دم گھٹتا جاتا تھا..... دل رقص بگل کر رہا تھا..... سانس، سانس لینے کی طلب میں بری طرح تڑپ رہی تھی..... پیچھے بڑے جواب دے رہے تھے..... کافی دیر زندگی اور موت کے بیچ کشمکش جاری رہی..... سانس نے اپنا زخم زخم وجود موت کے سفاک پنجوں سے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی..... مگر بے سود..... سانس، سانس لینے کی کوشش میں بری طرح ہانپ رہی تھی..... تڑپ رہی تھی.....

پھر "نیم جان" سانس "بے جان" ہو گئی..... زندگی کا تڑپتا وجود موت کی سفاک آغوش میں جا کر ساکت ہو گیا..... ایک میم "مانگنے والے" کی صورت مر گئی تھی، دوسری میم "موت" نے اپنا پیٹ بھر لیا تھا..... تیسری میم "مقدر" اپنے فیصلے پہ مطمئن تھی..... اس نے مانگنے والے کی طلب کی شدت کو پرکھا تھا، پھر ہی فیصلہ کیا تھا۔

اسے غصہ تھا کہ مانگنے والے نے اللہ سے مانگنے کے بجائے اوروں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلائے تھے؟ بھلا اللہ کسی کو خالی ہاتھ لوٹاتا ہے؟ نہیں..... تو پھر.....؟ کیا جو شے اللہ نہ دینا چاہے، وہ "کوئی اور" دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں..... تو پھر.....؟ ہاں کسی سے اپنے لئے "دعا کروانا" جائز ہے..... مگر "مانگنا" نہیں.....

اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ "اے موسیٰ! مجھ سے اس زبان سے دعا مانگا کرو، جس زبان سے تم نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔"

حضرت موسیٰ نے عرض کی۔ "یا اللہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اللہ نے فرمایا کہ "تم دوسروں سے اپنے لئے دعا کروایا کرو، کیونکہ "ان" کی زبان سے "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" تو پھر دعا کروانا اچھا ہے۔

مگر مانگنا تو صرف اللہ ہی سے چاہئے ناں! دینے والا صرف وہی ہے..... ارشاد باری تعالیٰ ہے، "کیا جانتا ہے، جو کہتا ہے میرے سوا کسی چیز کو، ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے؟ پس میری طلب کر، پالے گا۔"

سواگر ہم اللہ سے طلب کریں تو پالیں گے اور

اگر کسی اور سے طلب کریں تو نہیں پائیں گے۔ لہذا
مقدور مطمئن تھا چوتھی میم "محبت" اپنا لہو لہو وجود لئے ماتم
کنناں تھی..... اور پانچویں میم..... فی الحال تو انتظار
تھی..... خاموشی سینے پر ہاتھ باندھ کر جا کر برگد کے
تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

عین اسی جگہ فاروق حیدر کی قبر تھی۔ جہاں کل
رات وہ منگتا بنا بیٹھا تھا اور وہ پانچویں میم "مٹی"
تھی..... قبر کی مٹی..... جو شدت سے اس کی آمد کی منتظر
تھی۔ قبر جسے ہم دن میں ایک بار بھی یاد نہیں کرتے اور
جو ہمیں دن میں ستر بار یاد کرتی ہے..... کچھ دیر قبل،
جب فاروق ابھی "دن" نہ ہوا تھا، تب دل نور آئی
تھی..... وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اسے یکا یک
فاروق حیدر سے محبت ہو گئی تھی۔

ان کو ہم سے محبت کا احساس جب ہوا
ہمارے پاس آ کر وہ دیر تک روتے رہے
اور ہم بھی کتنے "بے حس" لکھے یارو.....!
کہ منہ کفن میں چھپائے چپ چاپ سوتے رہے۔
اور کفن میں لینے لوگ بھی بھلا کبھی بولے ہیں؟
اور اب..... فاروق حیدر کو دفن کر کے سب لوگ دعائے
مغفرت کر کے چلے گئے تھے.....

خاموشی کی حکومت پھر قائم تھی مگر وہ پھر بھی سو گوار
تھی۔ قدموں کی چاپ ابھری خاموشی نے ناگواری
سے دیکھا..... دل نور لٹی لٹی سی آرہی تھی..... چہرے پہ
آنسوؤں کی لکیریں، کھڑے بال، زمین پہ کھسکتا
دوپٹہ..... اس کی اجڑی بجزی حالت پہ خاموشی کو بے
اختیار ترس آ گیا..... اس کی متلاشی نظریں موت کو جا بجا
بکھری موت کو بے قراری سے ٹول رہی تھیں۔ بالآخر
انہیں "منزل" مل گئی۔ سرخ گلابوں سے ڈھکی قبر پہ جا کر
وہ یوں رونے لگی گویا سب کچھ ختم ہو گیا ہو..... اور جب
سب چھمن جائے، پوری کائنات لٹ جائے تو رونا تو بنتا
ہی ہے..... اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ دل نور رو رہی تھی.....
اور..... اور خاموشی بھی اس کے ساتھ سکھنے لگی تھی..... اس

سے قبل ہمیشہ اسے "آوازوں" سے وحشت ہوتی تھی۔
اس قدر وحشت کہ اس کا دل کرتا تھا کہ ساری آوازیں
مر جائیں..... چار سو خاموشی ہو..... صرف اس کی
حکومت..... اور وہ ہر آواز کو "ماز" بھی دیتی تھی۔ لیکن آج
..... آج وہ خود دل نور کے اجڑنے پر افسردہ تھی۔

دل نور رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی..... فاروق حیدر
کو بے قراری سے پکار رہی تھی..... اس کی متلاشی نظریں
بار بار قبر کی مٹی پر عالم وحشت میں سر پختی تھیں..... مٹی کے
ذروں سے لپٹتی تھیں۔ اسی ایک چہرے کو ڈھونڈتی
تھیں..... اور ہر بار نا کام لوٹ آتی تھیں.....

اپنی آنکھوں پر بھی اس دن رحم سا آیا مجھے
کچھ نہیں تھا سامنے، جب "دیکھنا" آیا مجھے.....
اور یہ نا کامی انہیں بار بار نمکین سمندر میں تبدیل
کر دیتی تھی..... فاروق حیدر "مجبور" تھا۔ وگرنہ بھلا وہ
ایسا کر سکتا تھا دل نور..... اس کی دل نور رو رہی ہے.....
اور..... اور وہ "بے حس" بنا رہے..... پتھر بنا رہے.....؟
وہ مجبور تھا..... ورثہ.....

میرا جسم ہو چکا تھا خاک، اپنی خاک میں
جب مقدر کا ستارہ ڈھونڈتا آیا مجھے.....!
خاموشی وہاں سے اٹھ گئی..... دل نور بھی جانے
کے لئے اٹھ گئی..... وہ قبرستان سے "باہر" نہیں جا رہی تھی،
وہ قبرستان کو اپنے "اندز" اٹھائے جا رہی تھی۔ اس کا دل
قبرستان بن گیا تھا اور قبرستان تو صرف موت کی علامت
ہوتے ہیں..... دل نور کو بھی اب ساری زندگی "موت" کی
پناہوں میں گزارنی تھی..... اور موت کی "پناہ" بھلا کیسی
ہوتی ہے؟ سرد، ٹھنڈی، والی، روح تک کو منجمد کر دینے
والی..... دل جب قبر بن جائے تو زندگی قبرستان میں بھٹکنے
والی روح کی طرح ہی گزرا کرتی ہے.....

دل نور جا چکی تھی..... ایک قبرستان کو وہ اپنے
ساتھ لے گئی تھی اور..... دوسرے قبرستان میں خاموشی.....
برگد کے تنے اور شاخوں سے لپٹ کر سسک رہی تھی۔



خوف و ہراس کی وادی میں خراماں خراماں سرگرداں دل گرفتہ دل شکستہ حالات سے ہر اپنی نوعیت کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش حالات سے دو چار عجیب و غریب دل و دماغ کو مسوستی حیرت سے روشناس کراتی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے ویران و اجاڑ وادی کے نشیب و فراز میں جنگھاڑتی و دندناتی ذہن سے محو نہ ہونے والی ایڈونچر شاہکار کہانی

اچھی کہانیوں کے مٹلاشی قارئین کیلئے حیرت انگیز خوفناک حیرتاک حقیقی کہانی

لگیں۔ ”مگر یہ سب کس نے کیا، کوئی دکھائی کیوں نہیں دے رہا اور کہاں ہے وہ لڑکی تم جس کی بات کر رہے تھے۔“
”آپ نے ویڈیو فور سے نہیں دیکھی۔“ یہ کہہ کر ساحل نے ویڈیو کو تھوڑا سا ریورس کیا۔

اس نے سکرین پر انگلی رکھی۔ ”یہ دیکھیں آنتی ماریہ کی گردن کے قریب یہ ستارہ سا ٹٹمار ہا ہے تھوڑی سی دیر میں ان کی گردن سے لہو بہنے لگتا ہے۔ آپ اپنی نظریں روشنی کے اس ڈاٹ ڈاٹ پر مرکوز رکھیں۔“ اس نے ایک بار پھر روشنی کے اس ڈاٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دیکھو یہ ہوا میں حرکت کرتا ہوا اسی جگہ لوہے پر نیچے حرکت کر رہا ہے جہاں میں نے اس قتل کو دیکھا تھا۔“

زیر اور تو قیر کی آنکھوں میں حیرت اور خوف تھا، زیر نے تو قیر کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہ نظر انداز کیا جانے والا کوئی روشنی کا ڈاٹ نہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دور سے دکھائی دینے والا ٹٹمار ہوا ستارہ۔ جس میں آگ دھبہ رہی ہو مگر یہ ہے کیا؟“

ساحل ویڈیو بند کر کے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”میں جو کہنے جا رہا ہوں، آپ کے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے لیکن یہ سب سچ ہے۔“

میں نے خود ایک لڑکی کو سفید فرائ میں آنتی ماریہ کے قریب دیکھا تھا جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ

ساحل نے بے چینی سے اہرا اہر دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔ ”میں آپ کو جو بتانا چاہتا ہوں۔ وہ آپ کو اس طرح سمجھ نہیں آئے گا جس وقت آنتی ماریہ کا قتل ہوا تو میں گاڑی سے ان کا موبائل نکال رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لڑکی کو جو سفید فرائ میں ملبوس تھی ان کے قریب دیکھا، میں اس لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا، اس لڑکی نے آنتی ماریہ کی گردن پر اپنے دانت نصب کر دیئے جو نئی خون اس کے منہ سے نکلا، اس کی فرائ سات رنگ کی دھاریوں کے ڈیزائن میں بدل گئی اور پھر اچانک غائب ہو گئی۔ میں نے آنتی کو سنبھالا تو میں نے ہوا میں کسی قتل کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھا اس کے پردوں میں وہی سات رنگ تھے جو اس لڑکی کے فرائ میں تھے۔“

وہ بہت بڑا سرا رہی، وہ میری آنکھوں کے سامنے غائب ہوئی۔ جب اس لڑکی نے آنتی پر حملہ کیا تو میرا ویڈیو کیمرہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ کیمرہ آن تھا اس وقت جو ویڈیو میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ساحل نے چنڈی کیم کی ویڈیو کمپیوٹر پر چلائی۔ اس نے غیر ضروری سین پاس کرتے ہوئے وہیں سے ویڈیو چلائی جہاں سے ماریہ کا قتل ہوا۔ اس روح فرسا منظر پر سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ فکر کی بے چینی آنکھیں سکرین ٹوٹنے



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رہا ہوں، تم کس سوچ میں گم ہو۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ساحل اور عارفین کے علاوہ اور کون جوان ہو سکتا ہے تو مجھے پروفیسر حسان کا خیال آیا ہے۔ ہمیں ویسے بھی سارا معاملہ ان سے ڈسکس کرنا چاہیے، ہم نے انہیں بالکل بلا تعلق کر رکھا ہے، وہ ہماری بہت مدد کر سکتے ہیں۔“

توقیر کی اس بات پر ظفر نے کہا۔ ”یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ ویسے بھی میرے ذہن میں کتنے ہی سوال اٹھے ہیں جس کا جواب پروفیسر حسان ہی دے سکتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ پروفیسر کو شک تھا کہ ہمارے بچوں نے میزیم سے کچھ Stuffed چرائے ہیں۔ اگر وشاہ خیام نواد اور حور یہ نے وہ Stuffed چرائے ہوں تو انہوں نے اس کا کیا ہوگا۔“

ایک جھرجھری سی جیسے ساحل کے پورے وجود سے گزر گئی وہ تھر تھرتی آواز میں بولا۔ ”ہاں..... ان Stuffed میں ایک تپلی بھی تھی۔“

ظفر نے سوالیہ نظروں سے ساحل کی طرف دیکھا۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ ہمیں ان دیسپارز کا پتہ لگانا ہوگا جو لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔“

ساحل نے کہا۔ ”مگر ہم کس طرح ان دیسپارز تک پہنچ سکتے ہیں۔“

زبیر نے پوچھا۔ ”حور یہ کے ذریعے ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔“

ساحل نے ہر یقین لہجے میں کہا۔ ”مگر حور یہ؟“

ظفر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”تم نے کہا تھا کہ ہم حور یہ کو ساحل کے پاس لے جائیں گے۔ تم اپنی بات پر قائم رہو، ساحل جو کچھ بھی کرے گا ہمارے سامنے کرے گا، حور یہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب بہت ضروری ہے تم اس بات پر یقین کر لو کہ حور یہ جی سرفیض نہیں ہے۔“

توقیر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ظفر نے دوبارہ بات شروع کی۔ ”ہم خواتین کو اس مشن سے دور ہی رکھیں گے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کل ہی پروفیسر حسان اور عارفین سے ساری بات کریں گے۔ یہاں سے تقریباً تین

جونہی اس لڑکی کے دانتوں پر لہو لگا اس کا لباس سات رنگوں میں بدل گیا اور پھر وہ ایک خوبصورت تپلی کا روپ دھار گئی، اس تپلی کے پردوں پر بھی وہی سات رنگ تھے جو اس لڑکی کے لباس پر تھے۔ سیٹ اس کی نہ اسرار لڑکی کے جوہ کی نشاندہی کر رہا ہے۔“

توقیر نے ساحل کی بات کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی۔ ”تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ جوئل ہو رہے ہیں، ان کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ مافوق الفطرت مخلوق ہے جیسے سیب پارح یا کوئی شیطانی طاقت۔“

ظفر بھی کسی گہری سوچ میں کھویا کھویا بولا۔ ”ساحل ٹھیک کہہ رہا ہے کیونکہ میں نے شمعوں کی گردن پر وہی دو دانتوں کے نشان دیکھے تھے جو ماریہ کی گردن پر تھے۔ شمعوں کی اور اس کے ساتھیوں کی اموات بھی بہت بڑا سرار تھیں۔ ان کے جسم بھی مجلس مئے تھے کوئی ان کی موت کی وجہ نہیں جان سکا اور تابش اور مہک کی اموات بھی اسی طرح سے بہت عجیب تھیں۔ اور پھر حور یہ کا اس واقعہ کا ذکر کرنا جب ایک مردہ لڑکی میں زخمانہ نے حور یہ کی آواز سنی..... کسی بڑے انداز کی طرف اشارہ ہے۔“

زبیر جو خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا، ظفر سے مخاطب ہوا۔ ”کوئی رائے قائم کرنے کے لیے یہ سب باتیں کافی نہیں ہیں۔ یہ سب قتل کرنے والا کوئی انسان ہے، ورنہ وہ یا کوئی ہوائی مخلوق، یہ جاننے کے لیے ہمیں کوئی ٹھوس ثبوت ڈھونڈنا ہوگا۔“

ساحل نے زبیر کی طرف دیکھا۔ ”قتل کرنے والا چاہے انسان ہو یا روح، ہمیں ایک ٹیم بنانی ہوگی، پولیس پر بھروسہ کر کے ہم نے کتنا وقت برباد کیا، ہم خود اس معاملے کی تہہ تک پہنچیں گے۔“

ظفر نے بھی ساحل کی تائید کی۔ ”میرا خیال ہے کہ ساحل بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ایک ٹیم بنانی ہوگی یہ کام بڑے خطر بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ میں توقیر اور زبیر تو اتنے پھر تیلے نہیں، میرا خیال ہے کہ ساحل اور عارفین کو ہم بھاگ دوڑ کا کام سونپیں گے باقی جو ہم کر سکے کریں گے۔“

ظفر نے اسے ٹوکا۔ ”تم سن رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ

گھنٹوں کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے وہاں ایک بزرگ ہیں، ہم نے کافی سنا ہے ان کے بارے میں..... ہم حور یہ کو وہاں لے جائیں گے، حور یہ کو شک نہ ہو اس لیے رخسانہ اور تو قیر کو جانا ہوگا ساتھ میں بھی چلا جاؤں گا۔“

تو قیر رضامند ہو گیا۔ وہ سارے آدھا گھنٹہ اور گفتگو میں مصروف رہے پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اگلی صبح بارہ کے قریب دوپہر تک ظفر اور راحت مہمانوں میں اور کچھ مذہبی رسومات میں مصروف رہے۔ تو قیر، زبیر اور وقار احمد کی فیملیز بھی وہیں تھیں۔

دوپہر کے بعد ظفر نے ان سب کوڑکنے کے لیے کہا اور سارے دھوم سے اور خدشات بیان کیے جو ان اموات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ جو کچھ ظفر کہہ رہا تھا وہ بھیا تک حقائق سب کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔

بحر حال عارفین ان کی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ تقریباً چار بجے وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر تو قیر اور رخسانہ، حور یہ، ظفر کے گھر ہی تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد تو قیر، رخسانہ اور حور یہ کے ساتھ ظفر اس گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے جہاں اس بزرگ کی حویلی تھی۔

تین گھنٹے کا سفر کافی زیادہ تھا۔ ظفر پچھلی سیٹ پر حور یہ کے ساتھ بیٹھا تھا حور یہ اس طرح منہ بنائے بیٹھی تھی جیسا سے شک ہو گیا ہو۔

حالات اور واقعات کی وجہ سے سب ویسے ہی پریشان تھے اور یہ کی مسلسل خاموشی ایک خوف سا پھیلائے ہوئے تھی۔ سفر میں خواجہ خواجہ کی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں، تین گھنٹے کا سفر چار گھنٹے کا بن گیا تھا۔ بزرگ رحمان سائیں کی حویلی پہنچے تو انہوں نے ان سب کو مہمان خانہ میں بٹھایا۔ ملازم نے چائے پیش کی تو رخسانہ نے ملازم سے پوچھا۔

”سائیں کی فیملی بھی یہیں رہتی ہے۔“

”نہیں..... بیگم صاحب! یہاں سائیں جی اور ان کے ملازم رہتے ہیں۔ سائیں جی کے گھر والے تو دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں آپ بس یہ چائے پیئیں، سائیں جی آ رہے ہیں۔“

ملازم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سائیں جی مہمان

خانہ میں داخل ہوئے۔ سائیں جی کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی حور یہ نے دروازے پر ٹھٹھکی باندھ لی تھی۔ اسے جیسے سائیں جی کی آمد کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ سائیں جی بھی کمرے میں داخل ہوتے ہی جیسے پتھر کے ہو گئے وہ مسلسل حور یہ کی طرف دیکھتے رہے اور حور یہ بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اس طرح گھیر رہی تھی جیسے اسے دھمکی دے رہی ہو کہ وہ اس کا راز افشا نہ کرے۔

تو قیر نے حور یہ کو ٹوکا۔ ”حور یہ نظریں نیچے کرو بزرگوں کو اس طرح دیکھتے ہیں؟“

سائیں رحمان مسکراتے ہوئے قتل سے بڑھ گئے۔ ”اسے کچھ مت کہیں، یہ آپ کی تابع نہیں ہے۔“

ظفر نے اور رخسانہ نے سائیں کو سلام کیا اور پھر اپنے آپ کا موقف بیان کیا۔ بزرگ نے انہیں اشارہ کیا کہ حور یہ کے سامنے حریف کچھ اور نہ بتائیں۔ پھر انہوں نے حور یہ کی آنکھیں دیکھیں، اس کی بغض چٹک کی اور رخسانہ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ جی کو حویلی دکھائیں۔“

رخسانہ سمجھ گئی کہ سائیں ظفر اور تو قیر سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حور یہ کو لے کر باہر چلی گئی۔ سائیں، تو قیر سے مخاطب ہوا۔ ”اب آپ مجھے سب تفصیل سے بتائیں۔“

تو قیر نے سب کچھ سائیں کو بتایا۔ سائیں ساری صورت حال جان کر پریشان ہو گئے۔ ”میں حور یہ کو دیکھ کر کچھ باتیں تو جان گیا ہوں لیکن ابھی میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا، آپ مجھے حور یہ کی تاریخ پیدائش لکھوادیں۔ میں اس کا حساب نکال لوں تو پھر میں خود آپ لوگوں سے رابطہ کروں گا آپ سب بہت بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں۔ بہت اچھا کیا جو میرے پاس آ گئے، مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے مٹی کی ہانڈی سے کچھ تعویذ نکالے اور وہ تعویذ ظفر کے ہاتھ میں دے دیے۔ ”میں آپ کو ایک مشورہ دوں آپ سب دوست اپنی فیملیز سمیت ایک ہی جگہ ٹھہر جائیں۔ یہ تعویذ پانی میں بھگو کر گھر کے سارے کونوں میں چھڑک دیں، خدا کے فضل سے جو بھی بلا ہے وہ اس گھر میں آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گی جب تک کوئی واضح حقیقت

سامنے نہیں آ جاتی، آپ لوگوں کو ایک ہی جگہ رہنا چاہیے آج رات حور یہ کا حساب نکال کر میں کل خود آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ مجھنا گھر سمجھا دیں۔“

ظفر نے بزرگ کو اپنا گھر سمجھا دیا اور پھر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔



اگلے روز تو قیر اور زخسانہ حور یہ کے ساتھ ظفر کے گھر پر ہی تھے۔ حور یہ اندر لیونگ روم میں بیٹھی تھی۔ ظفر نے تو قیر اور زخسانہ کو باہر لان میں بیٹھنے کے لیے کہا، ابھی صبح کے نو بج رہے تھے۔ باہر بیٹھنے کے بعد زخسانہ نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ کہیں حور یہ ان کے پیچھے باہر تو نہیں آ رہی پھر اس نے ظفر سے بات شروع کی۔ ”ظفر بھائی رات تو ہم آپ کے گھر اس لیے ٹھہر گئے تھے کہ سفر میں دیر ہو گئی تھی مگر اب ہمیں چلنا چاہیے۔ بزرگ کی یہ بات ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم سب اپنے گھر چھوڑ کر ایک ہی جگہ پر رہیں۔“

”مگر بھائی اس بزرگ نے کوئی ایسی بات محسوس کی ہو گی جب ہی تو ایسا کہا ہے یہ ضروری ہے کہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں تو ہی اسے سمجھیں۔ ہم احتیاط تو کر سکتے ہیں۔“

تو قیر جو خاموشی سے ظفر کی بات سن رہا تھا زخسانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ظفر اور ہم لوگ اسٹے رو لیں اور زبیر اور وقار احمد کی نیپلی ایک ساتھ رہ لیں۔“

زخسانہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”کوئی تمہاری بات نہیں مانے گا، بس بنیاد پر کوئی یہ فیصلہ لے گا صرف ایک وہم کی بنیاد پر۔“

ظفر نے ہاتھ سے بحث کو ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ ”یہ فیصلہ ہم بعد میں کر لیں گے، ابھی تو میں سائیں رحمان کو اپنے گھر آنے کے لیے کہہ چکا ہوں، جب تک وہ نہیں آتے آپ لوگ یہیں ٹھہریں، وہ پہر تک باقی سب بھی آ رہے ہیں، ایک بار بزرگ کی بات سن لیں پھر آگے کا سوچیں گے۔“

زخسانہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ”وہ بزرگ میری حور یہ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔“ ظفر نے اسے تسلی دی۔ ”وہ صرف حور یہ سے بات کریں گے، دُور نے کی ضرورت نہیں ہے۔“

تو قیر خاموشی کی کھری سوچ میں گم تھا۔ ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“ ظفر نے تو قیر سے پوچھا۔

”ویسے یہ عجیب بات ہے، سائیں نے یہ کیوں کہا کہ نواد اور خیام کے گھر والے بھی موجود ہوں، عامل تو ایسے کاموں میں تنہائی چاہتے ہیں اور حور یہ بھی شاید پسند نہ کرے۔“ تو قیر نے کہا۔

”اس میں اتنا سوچنے والی کیا بات ہے۔ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے اس کا تعلق وشاء، نواد اور خیام سے بھی ہوگا شاید ان کے بارے میں ہمیں علم ہو جائے گا۔ ویسے بھی جب بزرگ چاہیں گے تو ہی ہم ان کے پاس جا میں گے۔“

تو قیر جلدی سے بولا۔ ”زخسانہ اور میں حور یہ کے پاس ہی رہیں گے۔“

”ہاں..... تم لوگ حور یہ کے پاس ہی رہنا۔“ ظفر نے تو قیر کو تسلی دی۔

دوپہ تک ان کے دوسرے دوست اور ان کی فیملیز بھی آ گئیں۔ تقریباً چار بجے تک قرآن خوانی ہوتی رہی۔ پانچ بجے کے قریب سائیں جی کے خاص بندے کا فون آیا کہ سائیں جی تقریباً سات بجے کے قریب آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔ ظفر کو یہ جان کر تسلی ہو گئی کہ سائیں جی کے آنے تک خاص دوستوں کے علاوہ باقی سب لوگ جا چکے ہوں گے۔

ظفر کے گھر ایک بڑا سا نچو ہوا تھا وہ خود ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں آ سکا تھا مگر ان کی چھٹی حس انہیں اشارہ کر رہی تھی کہ خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے اس لیے وہ اس خطرے سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کرنے لگے تھے۔

سورہ یاسین الماری میں رکھنے کے بعد زخسانہ بھی ابھی ہی تو قیر کے پاس آ بیٹھی۔ ”حور یہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا بس گم صدمی بیٹھی ہے۔ یہی کہتی ہے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ نہ ہاتھ منہ دھویا ہے نہ بال سنوارے ہیں، عجیب سی حالت بنائی ہوئی ہے۔“

”کوئی جوں و قیر وہ دے دیا پھل دے دو۔“ تو قیر نے کہا۔

”جوں بھی لے گئی تھی اور پھل بھی کمرے میں رکھ دیئے ہیں مگر وہ کچھ نہیں لے رہی..... آپ جائیں شاید وہ آپ

”سائیں جی آپ نے حور یہ کا حساب نکالا تھا، کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔“

سائیں نے تشویش بھری نظروں سے رُخسانہ کی طرف دیکھا۔ ”آپ مجھے بتائیں کہ آپ نے حور یہ کی تاریخ پیدائش اور دوسری معلومات درست دی تھیں۔“

”جی سائیں! اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔“ توقیر نے کہا۔

بزرگ نے تاسفانہ انداز میں نگاہیں جھکا لیں۔ ”میرے حساب کے مطابق تو حور یہ کو مرے ایک سال ہو گیا ہے۔“

رُخسانہ ٹپ کر رہ گئی، جیسے کسی نے اس کے سینے میں حجر کھوپ دیا ہو۔ ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

بزرگ کی اس بات سے سب چونک گئے۔ ساحل بزرگ کے قریب آیا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔ ”جو حور یہ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے وہ کون ہے۔“

”میں اسی کا تو پتہ لگانے آیا ہوں۔۔۔۔۔۔“

توقیر اشتعال انگیزی میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ بزرگ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں اسی لیے کہتا تھا کہ ان بزرگوں کے پکر میں نہ پڑیں۔ میری حور یہ زندہ ہے اور ہمارے ساتھ ہے۔“

ظفر نے توقیر کو شانوں سے پکڑتے ہوئے بٹھایا۔ ”سائیں جی کو حور یہ سے بات تو کرنے دو، اس طرح بولو گے تو سائیں جی اپنا کام کیسے کریں گے۔“

توقیر چیخ چیخ کر بولنے لگا۔ ”یہ میری حور یہ کو اذیتیں دیں گے، مجھے حور یہ کو انہیں نہیں دکھانا۔“

سائیں جی نے اپنا ہاتھ ہوا میں اکڑا لیا۔ ”اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہو جو زندہ ہی نہیں ہے۔“

ظفر نے توقیر کو سمجھایا اور زبیر اور مایہن نے رُخسانہ کو سمجھایا اور انہیں بمشکل آمادہ کیا کہ سائیں جی کو حور یہ سے بات کرنے دیں۔ سائیں جی درخت کے قریب، گھسی چار پائی پر بیٹھ گئے اور ظفر سے گویا ہوئے۔ ”حور یہ کو ادھر لے آؤ، مکلی ہوا میں، درختوں کے قریب اس سے پوچھنا زیادہ بہتر ہوگا۔“

رُخسانہ اندر سے حور یہ کو لے آئی۔

کی بات مان لے۔“

توقیر اندر کمرے میں حور یہ کے پاس گیا۔ وہ واقعی عجیب سی حالت میں دیوار سے سر نکالے بیٹھی تھی۔ توقیر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے حور یہ یہاں کیا حال بند کھا ہے۔“ حور یہ نے غصیلی نظروں سے توقیر کی طرف دیکھا۔ ”آپ لوگ مجھ سے جھوٹی ہمدردیاں نہ کیا کریں۔“

”بیٹی یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، تمہارے اندر تو ہماری جان بخشی ہے۔“

”بھوت بولتے ہیں آپ اگر مجھ سے پیار کرتے ہیں تو سائیں کو کیوں بلارہے ہیں۔ وہ مجھ اذیتیں دے گا۔“

”وہ تمہیں بھلا کیوں اذیتیں دے گا۔ میں اور تمہاری امی تمہارے پاس ہوں گے۔ وہ بس تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ رُخسانہ اور منج جوں نے کرکمرے میں داخل ہوئی۔

”یہ لیں اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھ سے جوں پلائیں۔“ توقیر نے جوں کا گلاس لیا اور حور یہ کی طرف بڑھایا۔ حور یہ نے آرام سے جوں پی لیا۔

توقیر نے اس کے سر پر پیار دیا۔ ”گڈ گرل“ رُخسانہ کو بھی کچھ تسلی ہو گئی۔ توقیر اور رُخسانہ سب کے ساتھ باہر لان میں بیٹھ گئے۔ لان میں نواز کے والدین وقار احمد اور امین اور خیام کے والدین زبیر اور مایہن سب موجود تھے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی خوف کا سناٹا کو گشت تھا۔

کسی کے پاس جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جن کے ذہنوں میں بے شمار سوالات تھے مگر ان کے جواب کسی کے پاس نہ تھے۔ سب کے من کو ایک کھٹکا لگا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ملازم نے ظفر کو بتایا کہ باہر کوئی بزرگ آئے ہیں۔ ظفر نے ملازم سے انہیں اندر بلانے کو کہا۔ سائیں رحمان اپنے دھرمیوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ظفر نے انہیں باہر لان میں ہی بٹھایا۔ اس نے گھنے درختوں والی سائڈ کی طرف ایک چار پائی بچھا دی۔ انہوں نے ان کی خاطر تواضع کرنی چاہی تو انہوں نے ہر چیز سے منع کر دیا صرف سادہ پانی مانگا۔۔۔۔۔ اور بہت جلد ہی وہ اصل بات کی طرف آ گئے۔ ”مجھے حور یہ سے ملنا ہے۔“

توقیر اور رُخسانہ، سائیں کے قریب ہو کے بیٹھ گئے۔

سائیں جی کی چار پائی کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر حور یہ بیٹھ گئی۔

سائیں جی نے سب کی طرف نظر دوڑائی۔ زخسانہ، توقیر، ساحل اور ظفران کے قریب ہی بیٹھے تھے باقی لوگ کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ بابا جی نے کسی کو بھی جانے کے لیے نہیں کہا۔

انہوں نے حور یہ سے بہت پیار سے پوچھا۔ ”آپ کا کیا نام ہے بیٹی۔“

حور یہ نے انتہائی معصومیت سے کہا۔ ”یہ سب کہتے ہیں کہ میرا نام حور یہ ہے اس لیے آپ بھی سمجھ لیں کہ میں حور یہ ہوں۔“

”آپ کے ذہن میں کیسا خاکہ ہے آپ کے گھر آپ کے والدین کا۔“

”میرے والدین اور میرے گھر کا جس طرح کا خاکہ ہم سائیں جی نے ذہن میں ہے وہ نہ تو ان لوگوں جیسا ہے اور نہ اس گھر جیسا۔“ حور یہ نے اُداس لہجے میں کہا۔

سائیں جی نے اپنے تھیلے سے سفید رنگ کی پانی کی بوتل نکالی اور توقیر سے ایک کرسی منگوائی۔ توقیر کرسی لے آیا۔ سائیں جی نے وہ کرسی حور یہ کی کرسی کے قریب رکھی اور پانی کی بوتل لے کر حور یہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں جو پڑھ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔“ یہ کہہ کر سائیں جی نے سورہ بقرہ کی آیت پڑھنا شروع کی۔

وہ بوتل کو اپنے منہ کے قریب لے جا کے اس طرح آیتیں پڑھ رہے تھے کہ آواز سے بوتل کے پانی میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔

حور یہ سکتے کی سی کیفیت میں آیتیں سنتی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سائیں نے لہجے بھر کے لیے پڑھنا چھوڑا اور توقیر سے کہنے لگا۔ ”دو خواتین حور یہ کے قریب کھڑی ہو جائیں۔“

زخسانہ اور ایمین حور یہ کی کرسی کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ سائیں جی نے پھر دوبارہ اسی انداز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

زخسانہ کی نظر حور یہ کے بازوؤں پر پڑی، بوتل کے

پانی جیسی تھر تھراہٹ اس کے جسم میں بھی گئی۔ اس کے بازوؤں کی جلد اس طرح کانپ رہی تھی کہ زخسانہ نے خوفزدہ ہوتے ہوئے ایمین کی طرف دیکھا۔ ایمین نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ رفتہ رفتہ حور یہ کے پورے جسم میں تھر تھراہٹ محسوس ہونے لگی، مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر اس کا جسم کرسی پر سے پھسلتا ہوا زمین کی طرف ڈھیر ہونے لگا۔

زخسانہ آگے بڑھ کر حور یہ کو پکڑنے لگی تو سائیں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے ابھی کوئی ہاتھ نہ لگائے وہ مسلسل اونچی آواز میں سورۃ بقرہ کی آیتیں پڑھتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے مرید کو کچھ اشارہ کیا۔

مرید اپنی جگہ سے اٹھا اس نے تھیلے سے ایک چاک نکالا اور جہاں سب لوگ کھڑے تھے وہاں منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے چاک سے دائرہ کھینچ دیا اور ظفر سے مخاطب ہوا۔ ”سائیں جی چاہتے ہیں کہ جو یہاں رُکنا چاہتا ہے وہ اس دائرے میں آجائے۔“

ان سب نے سائیں کی بات مانی اور سب اٹھ کر ایک ہی دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ حور یہ زمین پر لیٹی کانپ رہی تھی۔ پھر ایک دم اس کے جسم سے کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔ جس کے ساتھ ہی سائیں نے پڑھنا چھوڑ دیا اور حور یہ کو ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں ڈالی کر اس زنجیر کا سرادشت سے بانڈھ دیا۔ توقیر چلا کر بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔؟“

سائیں نے سختی سے اپنا ہاتھ اکڑایا۔ ”دائرے سے باہر مت آنا، میں اسے کوئی اذیت نہیں دے رہا، اب میرے عمل کے دوران مت بولنا ورنہ نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

ظفر نے توقیر کو شانوں سے پکڑ کے روکا اور اسے سمجھایا۔ سائیں زمین پر حور یہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حور یہ کی پیشانی پر انگلیوں سے کھانا کھانا کر دیا۔ کسی نے اس کی پیشانی پر دھکتا کوئلہ کھدایا ہو۔

سائیں اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ”کون ہو تم؟“ حور یہ نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں بے حسی اور جارحانہ پن تھا۔

”کون ہوا تم؟“ سائیں نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں حور یہ ہوں۔“ وہ ڈٹل آواز میں بولی۔ ایک

سوئی اور ایک باریک۔ اس کی آواز میں سیٹی کی سی چیخ تھی جو بات ختم ہونے کے بعد میں فضا میں گونجتی رہتی تھی۔

”مجھے سچ بتاؤ ورنہ میں تمہیں نقصان پہنچا سکتا

ہوں۔“

سائیں کی اس دھمکی پر وہ اونچا اونچا ہنسنے لگی۔ ”میں

حور یہ ہی ہوں مگر میرے پاس وہ باتوں کمزور جسم نہیں جسے تم

نقصان پہنچا سکو، میں تو ہوا ہوں، شیطانی طاقتوں کی ملک، کسی

بھی وقت کہیں بھی کوئی بھی روپ دھار سکتی ہوں۔ میرے

معاملات میں دخل اندازی مت کرو ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ

دھو بیٹھے گے۔“

حور یہ کی زبان سے یہ سب سن کے رُخسانہ اور توقیر پر

سکتہ طاری ہو گیا۔

وائرے میں کھڑے ہوئے سب لوگ ہی حواس

باختر تھے۔ سائیں نے ایک بار پھر پانی کی بوتل میں پڑھنا

شروع کر دیا۔ حور یہ کسی جانور کی طرح دھاڑیں مارنے لگی اور

اپنے جسم کو زور زور سے پیٹتے ہوئے زنجیریں توڑنے کی

کوشش کرنے لگی۔ رُخسانہ تو منہ پر روپوش کھے پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگی۔

سائیں جی جوں جوں پڑھتے جا رہے تھے حور یہ کی

تڑپیں بڑھتی جا رہی تھی۔ سائیں نے بوتل میں سے تھوڑا سا

پانی نکال کر اس کے چہرے پر چھڑکا تو اس کی دلخراش چیخیں

فضا میں گونجنے لگیں۔ اس نے انکھروں کی طرح دہکتی

آنکھیں سائیں کے چہرے پر کاڑ دیں۔

”تو نے زنجیریں اس لڑکی کے جسم پر ڈالی ہیں، مجھ پر

نہیں، ایک بار مجھے اس جسم سے باہر آنے دے، مجھ پر سے اپنا

عمل ختم کر دے ورنہ میں اس لڑکی کو ختم کر دوں گی۔“

سائیں نے اپنے لہجے کی نفی تھوڑی کم کی اور تحمل سے

کہا۔ ”تم میرے چند سوالات کے جواب دے دو پھر تم اس جسم

سے چلی جانا۔ اگر تم ہوا ہو تو اس باتوں جسم کی مالک لڑکی کون

ہے اور اس کا چہرہ تمہارے جیسا کیسا ہے۔“

حور یہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”یہ شاء ہے، میں

نے اپنی طاقت کے بل پر اس کے چہرے کو اپنا روپ دے

دیا۔ میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں، تمہیں اندازہ نہیں ہے۔“

سائیں نے پھر دو بارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ

پڑھنا شروع کر دیا۔ سائیں کے دونوں مرید بھی کتابیں

کھولے خاص کلام پڑھ رہے تھے۔ پورے ماحول میں خوف

دہراں پھیلا ہوا تھا۔

حور یہ کے چہرے کی جلد پتھر ملی اور بے جان دکھائی

دے رہی تھی۔ کسی مردے کی طرح اس کے پورے جسم کی

رنگت سیاہی مائل ہو رہی تھی۔

”خیام ہوا اور وشاہ کہاں ہیں؟“

سائیں کے پوچھنے پر حور یہ نے قہقہہ لگایا۔ ”ہم

چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ تینوں خود

یہاں آ جائیں گے، پھر دیکھ لیں کہ وہ کیسے ہیں۔ جب بھی

ہم میں سے کوئی مصیبت میں ہوتا ہے ہمیں خبر ہو جاتی ہے اور

ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں۔“

تھوڑی دیر کے لیے تو سائیں کے چہرے پر خوف

کے تاثرات عیاں ہو گئے مگر اس نے خوف کو خود پہ حاوی کیے

بغیر پانی کی بوتل میں سورۃ کی آیات پڑھنا شروع کر دیں،

پانی کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ حور یہ کے جسم کی کپکپاہٹ

بھی بڑھ گئی۔

اس کا مقصد حور یہ کی روح کو اس معصوم لڑکی کے جسم

سے باہر نکالنا تھا۔ سائیں کا عمل جاری تھا۔ ایرے میں

کھڑے ہوئے لوگ سکتے کی سی کیفیت میں یہ سب کچھ دیکھ

رہے تھے۔

اچانک لان کے پھولوں پر ایک خوبصورت تیلی

منڈلانے لگی اور ساتھ سیاہ دھوئیں کی بدلی ہوا میں نمودار

ہوئی۔ پڑھتے پڑھتے جیسے سائیں کی زبان پہ مل آ گیا، ان

کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے، کسی

بڑا سرار نبی طاقت کی آمد کا انہیں احساس ہو گیا۔ چند

ساعتوں کے لیے ہی ان کا حور یہ پر سے دھیان ہٹا تو حور یہ

کی روح اس لڑکی کے جسم سے نکل گئی اور وہ لڑکی شاء اب

اپنی اصل شکل میں تھی۔ سائیں نے جلدی سے اٹھ کر اسے

مرد ہے۔

دشاہ اپنے ہوائی وجود کے ساتھ ہوا میں پرواز کرتی ہوئی سائیں کے قریب آئی اور اس نے اپنے سامنے کے دو لمبے نوکیلے دانت سائیں کی گردن میں بیوست کر دیئے۔ سائیں کی جھپٹیں فضا میں گونجنے لگیں۔ فواد نے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ سے سائیں کے سریدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہوا میں پھونکا۔

دونوں آدمی نہ دکھائی دیئے والی آگ میں جھلنے لگے۔ کچھ لوگ بے اختیار دائرے سے باہر نکلنے لگے تو سائیں نے تڑپتے تڑپتے بھی انہیں نہ کرنے کا اشارہ کیا اور زمین پر گرتے گرتے بھی اس نے اپنی قوت مجتمع کی اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”دائرے سے مت نکلتا۔ یہ دشاہ، فواد اور حور یہ کی رو میں۔۔۔۔۔ ان کے ہمزاد ہیں۔ جن کی طاقت عام روح اور جنات سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی اموات کے بعد کی رسومات پوری کرو۔“ زندگی نے سائیں کو اتنی ہی سہولت دی کہ وہ اتنا ہی بتا سکے پھر لقمہ اجل ہو گئے۔ ان کے سرید بھی مجلسِ کرز میں پرواز ہو گئے۔

حور یہ، فواد اور دشاہ نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور غائب ہو گئے۔

○ ○ ○ ○ ○

اس بھیا تک واقعہ کو روز گزر گئے۔ سب کا ایک جگہ پر رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ زندگی کے معمولات سے ہٹ کر اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو گئے تھے۔ ایک انجانا سا خوف ہر انسان کے جسموں میں لہو کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔

اپنی لولا دول کو اس طرح شیطانی روپ میں دیکھ کر وہ جیتے جی ہی مر گئے تھے۔ مگر ایک سوال سب کے ذہنوں میں گونج رہا تھا۔ خیام کہاں ہے، حور یہ کے مطابق وہ چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں تو خیام ان لوگوں میں کیوں نہیں تھا۔

ساحل اور ظفر اکٹھے بیٹھے تھے۔ ظفر جبیں پیمائی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اتنا بڑا شیطانی کھیل، یہ سب تو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم میم بھی بنالیں تو بھی ہم اس جنگ میں جیت نہیں سکتے۔ کون ہے جو ان شیطانی طاقتوں سے مقابلے میں ہماری مدد کرے گا۔ سائیں رحمان اور اس کے

چمک کیا تو وہ مر چکی تھی۔

حور یہ اسے ختم کر کے اس کے جسم سے نکل چکی تھی۔ سائیں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ تو مر چکی ہے۔“ تو قیر اور رخصانہ حقیقت سے بے خبر چیختے ہوئے لڑکی کی لاش کی طرف بڑھے۔

سائیں ہمیشہ دیوار کی طرح لاش کے آگے کھڑا ہو گیا۔ ”تم لوگوں کو دائرے سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ادھر بہت زیادہ خطرہ ہے۔“

تو قیر حسبِ عادت طیش میں بولنے لگا۔ ”نہ جانے کیا جادو منتر کر کے تم ہمیں یہ قوف بنارہے ہو اور اب تم نے ہماری بیٹی کو ہی مار ڈالا۔“

سائیں لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ دیکھو کیا یہ تمہاری بیٹی ہے؟“

تو قیر پور رخصانہ نے اس لڑکی کو قریب سے دیکھا۔ ”یہ تو ہماری حور یہ نہیں ہے۔ مگر یہ سب۔۔۔۔۔ رخصانہ نے پریشانی میں کہا۔

سائیں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ دشاہ ہے جس کے جسم میں حور یہ کی روح داخل ہوئی تھی اور اسے اپنا روپ دے دیا تھا۔ اب وہ اس کے جسم سے نکلی تو اسے قتل کر کے۔“

اچانک ہی رخصانہ کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں وہ چیختے لگی۔ تو قیر نے اسے شانوں سے پکڑتے ہوئے سنبھالا تو اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ سامنے حور یہ سفید لباس میں ملبوس ہوا میں معلق تھی اس کا جسم ہوائی تھا۔ تو قیر رخصانہ کا ہاتھ کھینچتا ہوا اسے دائرے میں لے گیا۔

سائیں اپنے عمل کا جاپ کرنے لگا تو حور یہ شیطانی انداز میں جیتے لگی۔۔۔۔۔ ”اب تمہارا یہ عمل کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اب میں انکیلی نہیں ہوں۔“ چند ہی ساعتوں میں حور یہ کے ہوائی جسم کے دائیں طرف ایک تھلی پھڑپھڑانے لگی اور بائیں جانب سیاہ دھوئیں کی بدلی سی نمودار ہو گئی۔ سب کی آنکھوں کے سامنے تھلی دشاہ کے روپ میں بدل گئی اور سیاہ دھواں فواد کے روپ میں۔

تینوں کے چہروں کے نقوش وہی تھے مگر ان کے چہرے اس طرح بھیا تک تھے جیسے قبر کے گلے سڑے

مرید ہمیں بچاتے بچاتے خود موت کے منہ میں چلے گئے۔“
ساحل نے ظفر کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ ”جنگ
لڑنے سے پہلے ہی آپ نے شکست قبول کر لی۔ بے شک
ہمیں شیطانی طاقتوں سے لڑنا نہیں آتا مگر کوشش کر رہے
ہیں۔ آپ جانتے ہیں تاکہ کالے جادو کا تو قرآن پاک
سے کیا جاتا ہے۔ ہم بھی ہمت نہیں ہاریں گے، آپ کی
پروفیسر حسنان سے بات ہوئی تھی؟“

”ہاں..... میں نے عارفین سے بھی بات کی ہے۔
پروفیسر حسنان اور عارفین ابھی کچھ دیر میں یہاں آنے والے
ہیں۔ پورا ایک سال ہم ان چاروں کو ڈھونڈتے رہے۔ کیا
معلوم تھا کہ وہ اس روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ میں
تو اس آس پہ زندہ تھا کہ میری وشا واپس ضرور آئے گی۔ میں
نے تو ایک پل کے لیے بھی اپنے ذہن کو یہ سوچنے کی جسارت
نہیں دی کہ میری بیٹی مر گئی ہے۔“ ظفر کی آنکھیں اشک بار ہو
گئیں اور وہ چہرہ چھپانے دوسری طرف منہ کر کے بٹھ گیا۔

ساحل نے ان کے شانے کو تھپتھپایا۔ ”ہمت کریں
انگل۔ انگل تو قیر، آنٹی رُخسانہ، انگل زبیر، آنٹی مابین،
انگل وقار احمد اور آنٹی ایمین، ان سب کا اور آپ کا دکھ ایک
ہے، ان کی بھی اُمید آپ کی طرح ٹوٹی ہے۔ وہ بھی خود کو
سنبھال نہیں پارے مجھے تو اس بات کا شک اسی روز ہو گیا تھا
جب آنٹی ماریہ کا قتل ہوا کہ وشا اور اس تلی کا کوئی تعلق ہے۔
مگر میرا ذہن اس محیر العقول سچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا
کہ وہ تلی وشا کا ہی روپ ہے۔“ بات کرتے کرتے ساحل
کسی خیال سے چونک گیا۔ ”ہمزاد۔“ کے بارے میں
سائیں رحمان کیا کہہ رہے تھے۔“

”ہمزاد کے بارے میں، میں بھی کچھ نہیں جانتا
میں نے کل پروفیسر حسنان سے اس بارے میں بھی بات کی
تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس کچھ ایسی کتابیں ہیں
جن کے مطالعہ سے کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔“ اسی
دوران باہر بیل ہوئی ساحل نے دروازہ کھولا تو پروفیسر
حسان اور عارفین تھے۔

ساحل انہیں اندر لیونگ روم میں لے آیا جہاں ظفر
بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ظفر کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ انہوں نے

سارے معاملے پر انتہائی رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ ساحل ان
کے لیے کولڈ ڈرنکس لے آیا۔

پروفیسر حسنان نے ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کیا۔ ”ہمارا
اس وقت کچھ بھی کھانے پینے میں دل نہیں ہے۔ اتنے لوگوں
کی اموات ہو گئی مگر آپ نے ہم سے رابطہ نہیں کیا۔“

پروفیسر کے اس گلے پر ظفر نے بتایا۔ ”ہم خود اس
خوفناک حقیقت سے بے خبر تھے۔ ہم تو اسی اُمید پر حور یہ کو
پہاڑی علاقے میں لے گئے کہ وہ ہمیں وشا، خیام اور فواد کے
بارے میں کچھ بتائے گی۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ جسے ہم حور یہ سمجھ
رہے ہیں وہ حور یہ کی روح ہے۔ ہم تو اپنے بچوں کے زندہ و
سلامت واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے ہمیں کیا معلوم تھا کہ
وہ نہیں بلکہ ان کی روحیں بھٹک رہی ہیں۔“

ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔
پروفیسر حسنان نے ظفر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”ہمت رکھو یہ
دکھ صرف تمہارے ساتھ نہیں خیام، فواد اور حور یہ کے والدین
بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ مگر اس وقت آپ اپنے اس
دکھ کو نظر انداز کر کے یہ سوچیں کہ وہ ہرے لوگوں کی زندگیوں کو
ہم ان شیاطین سے کیسے بچائیں۔“

سائیں کے کہنے کے مطابق فواد، حور یہ اور وشا
جنہیں تم لوگوں نے دیکھا ہے اصل میں وہ ان کے ہمزاد
ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں، کسی بڑے عامل نے ان کے
مردہ جسموں سے ان کے ہمزاد سخر کیے ہیں۔ وہ عامل اب
چاہے جس طرح چاہے ہمزاد سے کام کروا سکتا ہے۔ جس
طرح حور یہ کے ہمزاد نے وشا کے جسم میں داخل ہو کے
حور یہ کا روپ لے لیا اسی طرح کسی بھی وقت یہ ہمزاد ہمیں
دھوکہ دے سکتے ہیں۔

ہمارے جسم میں نہائی کی ترفیب دینے والے جن
ہمزاد کو موت کے بعد اگر کوئی عامل سخر کر لے تو وہ ہمزاد
سینکڑوں آسیدوں کی طاقت رکھتا ہے۔ اگر کسی عامل کا
کنٹرول ہمزاد پر سے ختم ہو جائے تو وہ ہمزاد عاموں کو بھی
ختم کر دیتا ہے۔“

”آپ ہمیں کچھ تفصیل سے بتائیں گے ہمزاد کے
بارے میں۔“ ساحل نے بے چینی سے پوچھا۔

پروفیسر حسنان نے لہا سانس کھینچا۔ ”ہمزاد جسے عبرانی میں ”لطیف“ عربی میں ”قرین“ یا ہزرات، فارسی میں ہمزاد، اردو میں ہمسایہ یا ہم نام شکریت میں سایہ اور انگریزی میں Duplicat spiritual body۔ جبکہ اسلامی ماہرین روحانیت اسے ”جسم لطیف“ یا ”جسم مثالی“ کہتے ہیں۔

روحانیت کی رُو سے ہر کسی کے دو جسم ہوتے ہیں، ایک مادی، مرنی، کثیف اور ظاہری جبکہ دوسرا روحانی غیر مرنی، لطیف اور باطنی جسم ہوتا ہے اسی روحانی، غیر مرنی، لطیف اور باطنی جسم کو ہمزاد کہتے ہیں۔ جو مادی، مرنی، کثیف اور ظاہری جسم کی موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

کیونکہ ہمزاد جسم لطیف ہوتا ہے لہذا یہ زمان و مکان "Timed and space" کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اپنی اس خوبی کی وجہ سے ہمزاد دنیا کے کسی بھی گوشے میں پہنچ سکتا ہے اور ہر قسم کی خبر اپنے عامل کو لا کے دے سکتا ہے۔ بعض عملیات کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے ہمزاد اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ دُنی سے دُنی چیز اٹھا سکتے ہیں، عامل کو دنیا کی سیر کرا سکتے ہیں۔ جو چاہے روپ لے سکتے ہیں۔

لہذا ہر دور میں لوگ ہمزاد کی تسخیر کرتے آئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہمزاد تسخیر کر لے تو وہ دنیا کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ساری صورت حال کا جائزہ لے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خیام نامہ اور دُشاء اور عور یہ نے سپر پاور بننے کے لیے زندگی کو نظر انداز کر دیا۔ لوگوں کے دل دُماغ پر حکومت کر کے اپنا آپ منوانے کے لیے وہ کالے جادو جیسے علم کی طرف مائل ہو گئے۔ اس بھیا تک علم کی گرفت نے انہیں گمراہ کر دیا انہوں نے میوزیم سے کچھ Stuffed چرائے۔ جن میں ایک تھلی بھی تھی۔ ان کی گمراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی عامل نے ان کے ہمزاد تسخیر کر لیے اور ان کے مادی وجود کو موت کی نیند سلا دیا۔ ہمیں کسی طرح اس عامل کو ڈھونڈنا ہوگا۔

”ابھی فی الحال ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“ ظفر نے اپنے

دونوں ہاتھ اکٹرا لیے۔

پروفیسر نے ساحل اور ظفر کی طرف دیکھا۔ ”سب ہو سکتی ہے۔“

Dar Digest 226 May 2015

سے پہلے وہ کام کرو جو سائیں نے کہا تھا۔“

”کیا.....؟“ ساحل نے پوچھا۔

پروفیسر نے متاسفانہ انداز میں آنکھیں جھکا لیں۔ ”اپنے بچوں کی اسوات کو دل سے تسلیم کر کے ان کی آخری رسومات ادا کرو۔ پھر سوچیں گے۔ آگے کیا کرنا ہے۔“

”ان سارے واقعات میں ہم نے خیام کو کہیں بھی نہیں دیکھا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خیام زندہ ہو۔“ ساحل نے پروفیسر حسنان سے کہا۔

پروفیسر حسنان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ عارفین ساحل سے مخاطب ہوا۔ ”میرے خیال سے ہمیں اس پتھر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ خیام زندہ ہے یا نہیں، ہمیں اس کی آخری رسومات ادا کر دینی چاہئیں۔“

حسنان نے عارفین کی تائید کی۔ ”عارفین درست کہہ رہا ہے، اگر خیام زندہ ہوتا تو عور یہ یہ کیوں کہتی کہ ہم چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں یقیناً وہ انہی میں سے ہو گا۔ ہمارے مذہب کے مطابق مُردے کی تدفین و تکفین کی خاص رسومات سے روح بھٹکتی نہیں بلکہ اپنے خاص مقام پر پہنچ جاتی ہے ان چاروں کے ہمزاد کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، آخری رسومات کا کچھ نہ کچھ اثر ان پر ضرور ہوگا۔ جتنا سوچتے جائیں گے، اتنا ہی بھٹکتے جائیں گے، ہمیں فی الحال ان چاروں کی آخری رسومات کی تیاری کرنی چاہیے۔ ہمیں فوری کسی عامل سے رجوع کرنا چاہیے۔ ان آخری رسومات میں کسی عامل کا ہونا ضروری ہے۔

میں عاملوں کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن ایک سائیکا ٹرسٹ ہیں مگر علامہ وہ عالمہ بھی ہیں۔ ان کا اپنا کلیٹک ہے وہ اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں مگر میں نے سنا ہے کہ اس طرح کے روحانی معاملات وہ بخوبی حل کر لیتی ہیں۔ میں ان سے ملاتا تھا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ بھی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب اس کی ضرورت ہوا تو اسے فون کر لیا جائے۔“

ساحل نے متعجب نظروں سے حسنان کی طرف دیکھا۔ ”اس قدر خطرناک معاملات سے ایک لڑکی کیسے خبردار رہا

ہو سکتی ہے۔“

پروفیسر حسان نے ٹھنڈی آہ بھری اور معنی خیز انداز میں بولے۔ ”یہ معاملات جسمانی طاقت سے نہیں ذہانت سے لڑے جاتے ہیں۔ پرسوں جمعہ کے روز ہم ایک ہی گھر میں ان چاروں کی آخری رسومات ادا کر لیتے ہیں۔ میں مس عمارہ کو اطلاع دے دوں گا۔“

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، ہمیں سب سے بات کرنی ہوگی، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ تقریباً ایک گھنٹہ وہ سب گفت و شنید میں مصروف رہے پھر عارفین اور حسان وہاں سے چلے گئے حسان کے جانے کے بعد ظفر نے فون کر کے خیام، فواد اور حور یہ کے والدین کو کھل اپنے گھر آنے کے لیے کہا۔

ظفر کے گھر اسٹے ہو کر باہم مشورے سے سب نے یہ طے کیا کہ ظفر کے گھر ہی سارا انتظام کیا جائے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس طرح سکے اور تڑپنے کے بجائے اپنے بچوں کی اموات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی آخری رسومات ادا کر دی جائیں۔

ویسے بھی خدا کے احکامات میں بے پناہ راز پوشیدہ ہیں، تہ فہن و مخفین کی خاص رسومات کے بعد لواحقین کو خدا کی طرف سے ڈھارس مل جاتی ہے۔ بروز جمعہ ظفر کے گھر میں رونے کی، بین کرنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ عزیزو اقارب بھی جمع تھے۔ جان پہچان والے لوگوں میں جس جس کو فواد، حور یہ، وشاء اور خیام کی اموات کا پتہ چل رہا تھا وہ غمزدہ ہو کے چلے آ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک ہیوم تھا ظفر کے گھر پر۔ لوگ دریوں پر بیٹھے تسلیات اور قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھے۔

اس ساری صہرت حال کا علم زرعام کو ہو چکا تھا وہ بے چینی سے اپنے گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔ پھر درخت کے قریب کھڑے ہو کے کسی سے باتیں کرنے لگا شاید نہ دکھائی دینے والے لطیف جسم سے۔ ”پہلے ہی میں خیام کی وجہ سے پریشان ہوں اوپر سے یہ ان چاروں کی اموات کی آخری رسومات، اس کا اثر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ ان چاروں کے گھر والوں کو موت کی خیمہ سلا دوں مگر ابھی وقت نہیں۔ سب سے پہلے تو میں ظفر اور ساحل کو ٹھکانے لگاؤں گا۔“

ابھی میری ساری توجہ خیام کی طرف ہے۔ تم کسی بھی طریقے سے خیام کا پتہ لگاؤ ورنہ میری ساری محنت دایمگاں جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے دروازے سے پتھروں کی انگوٹھیاں نکالیں اور تیزی سے اپنی ساری انگلیوں میں پہن لیں اور بیڈ پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس کے شیطانی دماغ نے کچھ طے کیا اور وہ نہانے کے لیے ہاتھ روم چلا گیا۔

فواد، حور یہ، وشاء اور خیام کے گھر والوں کے آنسو تھے کہ تمہیں کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک سال سے دردِ غم کا رُکا ہوا آتش فشاں لاوا برسا رہا تھا۔ آج اُمید اور آس کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ سینے میں سوائے درد کے اور کچھ نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رو کے اپنا غم بانٹ رہے تھے۔ مگر غم تھا کہ غم حال کیسے جا رہا تھا۔ ان کے گھروں کے چراغ بجھ گئے تھے، آنکھیں مایوسوں کے اندھیروں میں ڈوب گئی تھیں۔

ان کے پیاروں کی میتیں بھی ان کے سامنے نہیں تھیں ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھ کر رو کے وہ اپنے غم کا کچھ بوجھ کم کر سکتے تھے۔

○ ○

باہر لان میں مردوں کے لیے بندوبست کیا گیا تھا اور اندر گھر میں زمین پر دریاں بچھا کے خواتین بیٹھی تھیں اور قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھیں۔ ظفر بھی دوسرے مردوں کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھا۔ ساحل بھی اس کے قریب بیٹھا تھا۔

ظفر کے موبائل کی رینگ بجی، اس نے موبائل سنا۔ ”جی بہتر میں باہر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ ”کس کا فون تھا؟“ ساحل نے تیس پڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”عمارہ کا فون تھا، وہی سائیکارٹ جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا وہ باہر آ گئی ہیں۔ میں انہیں گھر کی خواتین سے ملوا کے آتا ہوں۔“

ظفر نے اپنا پارہ میز پر رکھا اور چلا گیا۔ عمارہ ابھی تک گاڑی پارک کر رہی تھی۔ اس نے مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی اور پھر گاڑی سے باہر نکلی۔ 28 سالہ عمارہ دہلی پٹی

اور انتہائی خوبصورت تھی۔ چہرے کی رنگت صاف اور نقوش
تکھے اور پُرکشش تھے۔ اس نے ریز لائن قمیص اور ٹراؤزر کے
ساتھ سکارف اوڑھا ہوا تھا۔

اس نے سکارف سے اپنے بال چھپا رکھے تھے سیاہ
سکارف نے اس کی خوبصورتی کو بڑھا دیا تھا اس نے ظفر کو
سلام کیا۔

”علیکم السلام! بہت شکریہ آپ کے آنے کا۔۔۔ میں تو
سوچ رہا تھا کہ شاید آپ ہمارے لیے وقت نہ نکال سکیں۔“ ظفر
نے اس کے ہاتھ سے اس کا سامان لیتے ہوئے کہا۔
عمارہ نے ایک نظر پوری کوٹھی پر ڈالی اور پھر مسکراتے
ہوئے گویا ہوئی۔ ”میں اپنی زبان کی پکی ہوں، میں نے آپ
سے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔“

”آئیے میں آپ کو اندر کا راستہ دکھاتا ہوں۔“
ظفر اسے رخسانہ اور ایمین کے پاس لے گیا عمارہ، رخسانہ
کے پاس بیٹھ گئی۔

ظفر نے رخسانہ سے کہا۔ ”یہ عمارہ ہیں۔ میں
تفصیل سے ان کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔۔۔
فی الحال یہ ہماری مہمان ہیں۔“ یہ کہہ کر ظفر باہر چلا گیا۔

رخسانہ اور ایمین رو رو کے غڈ حال تھیں۔ ان کی
آنکھوں کے نیچے زخم بن گئے تھے۔ عمارہ نے ان کا یہ حال
دیکھا تو اس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے میز سے پارہ لیا
اور پڑھنا شروع کر دیا۔

○ ○ ○ ○ ○

عارفین، حسنان اور سائل کو ارد گرد کے ماحول پر نظر
رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ گھر سے باہر لان میں ٹہل رہے
تھے۔ انہیں خاص تاکید کی گئی تھی کہ کوئی مشکوک شخص دیکھیں
یا کوئی عجیب اقلقت مخلوق تو فوراً رپورٹ ہو جائیں۔ وہ ایک میم
کی طرح کام کر رہے تھے ان کے موبائل ایک دوسرے سے
مسلک تھے۔

عمارہ کے ہاتھ میں دواں پارہ تھا۔ تمام خواتین قرآن
پاک پڑھنے میں مشغول تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کی مسود
مکن آوازوں نے فضا میں ایسا سکون سراپت کر دیا تھا کہ کسی
کے بھی ذہن میں خوفِ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

عمارہ نے اپنا پارہ مکمل کیا تو اس نے رخسانہ کے ہاتھ
پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”جو غم دیتا ہے وہ مرہم بھی رکھتا ہے۔ حقیقت تو
یہی تھی مگر آپ لوگوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بہت
وقت لگا دیا۔ شاید اگر یہ سب پہلے ہو جاتا تو وہ شیطانی طاقتیں
اس قدر نہ بڑھتی۔“

”آپ۔۔۔؟“ رخسانہ نے سوالیہ نظروں سے عمارہ کی
طرف دیکھا۔

”میں ایک سائیکا ٹرسٹ ہوں اور Exorcist
بھی ہوں۔ میں زیادہ دعوے نہیں کرتی مگر جو کچھ بھی مجھ سے
ہو سکا میں کروں گی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کا گھر
دیکھ لوں۔“

”ہاں کیوں نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی
ہوں۔“ رخسانہ اپنا پارہ میز پر رکھ کر کھڑی ہوئی۔ عمارہ نے اپنے
بیک سے چھوٹی سی کتاب اور تسبیح نکالی۔ ”آپ مجھے صرف
دشا کا کمرہ دکھادیں باقی میں خود دیکھ لوں گی۔“

رخسانہ، عمارہ کے ساتھ گئی اور اسے دشا کے کمرے
میں لے گئی۔ دشا کے کمرے میں داخل ہونے پر عمارہ کے
چہرے کے تاثرات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اسے سب
کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ اس نے تسبیح پڑھنا شروع کی اور ساتھ
پورے کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔

رخسانہ نے تسبیحی آہ بھری۔ ”دشا جو جو چیز جہاں
جہاں رکھتی تھی، سب کچھ دیسے ہی ہے۔ ظفر بھائی نے کوئی
تبدیلی نہیں کی۔“

عمارہ نے سائینڈ ٹیمبل سے ایک فوٹو فریم اٹھایا۔
رخسانہ نے عمارہ کے ہاتھ میں تصویر دکھائی تو تاسف بھرے
انداز میں بولی۔ ”یہ ان چاروں کی تصویر ہے۔“ پھر اس نے
تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا۔

”یہ دشا اور حور یہ ہیں اور یہ دونوں فواد اور خیام ہیں۔“
عمارہ نے دشا کی تصویر پر انگشت رکھی۔ ”میری
معلومات کے مطابق دشا، حور یہ اور فواد کو آپ لوگوں نے دیکھا
ہے مگر خیام کو نہیں دیکھا۔“ پھر اس نے خیام کی تصویر پر انگلی
رکھی۔ ”یہی خیام ہے۔“

رخسانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں یہی خیام ہے۔“

”یہ تصویر میں اپنے پاس رکھ سکتی ہوں۔“

”رکھ لیں۔“

عمارہ نے تصویر فریم سے نکالی اور اپنے بیک میں ڈال لی، پھر وہ رُخسانہ سے مخاطب ہوئی۔ ”اگر آپ ماسٹرنڈ کریں تو کچھ دیر کے لیے مجھے کیلا چھوڑ دیں۔“

رُخسانہ اسے وثناء کے کمرے میں چھوڑ کر دوبارہ خواتین کے ساتھ بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنے لگی۔ عمارہ، وثناء کے کمرے سے باہر آگئی اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے گھر کے باقی کمروں کا جائزہ لینے لگی، وہ پورے گھر میں پھری مگر اس نے ایسی کوئی غیر معمولی حرکت محسوس نہیں کی۔ ظفر اور حسان گھر میں داخل ہوئے تو عمارہ پورچ میں کھڑی تھی۔

وہ عمارت کے قریب آئے۔ ”سب ٹھیک ہے۔“

”فی الحال تو آپ کے گھر میں کوئی عجیب اقلقت مخلوق نہیں ہے مجھے ان چیزوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں ہوا۔ مگر ان بدردہوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ لیکن یہ تسلی رحیم۔ گھر میں قرآن پاک پڑھا جا رہا ہے کوئی شیطانی مخلوق آپ کو ایذا نہیں دے سکتی۔ اس ناگہانی آفت سے نبرد آزما ہونے کے لیے جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھیں، میں شام تک اصراری ہوں۔ آپ بلا خوف اپنی رسومات پوری کریں۔“

اس نے اپنے بیک سے ”A-meter“ لگا لے، ایک اس نے داخلی دروازے کے قریب پڑے ہوئے گیلے کے پیچھے نصب کر دیا اور دوسرا اس نے ظفر کو دیا۔ ”اسے باہر لان میں کسی درخت کے ساتھ لگا دو، جو بھی کوئی عجیب اقلقت مخلوق اس گھر میں داخل ہوگی A-meter کی سوئیاں ہلنے لگیں گی۔“

اس کے کہنے پر ظفر نے باہر لان میں انار کے درخت کے ساتھ A-meter لگا دیا۔ عمارہ رُخسانہ کے پاس آئی۔ ”خیام کی والدہ کہاں ہیں؟“

”وہ ماسٹرنڈی رنگ کے جوڑے میں جو خاتون ہیں وہ ماہین ہیں خیام کی والدہ۔۔۔۔۔“ رُخسانہ نے اُنکی سے اشارہ کیا۔

عمارہ ماہین کے پاس گئی۔ ماہین گھٹلیاں پڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ گھٹلیاں پڑھنے

لگی۔ ”آپ کیا پڑھ رہی ہیں۔“

”دوسرا کلمہ۔“ ماہین دھیمے سے لہجے میں بولی۔ عمارہ بھی گھٹلیوں پر دوسرا کلمہ پڑھنے لگی۔ نوکری میں پڑی ہوئی گھٹلیاں پڑھی گئیں تو عمارہ، ماہین سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ خیام کی والدہ ہیں۔“

ماہین نے اثبات میں سر ہلایا، خیام کا نام سنتے ہی اس کی آنکھیں بجلیک گئیں، اس نے بھیگی آنکھوں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ”معذرت چاہتی ہوں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

عمارہ نے اپنی مہین سی آواز میں کہا۔ ”کیسے پہچانیں گی میں آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ میرا نام عمارہ ہے پروفیشن میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں مگر عالمہ بھی ہوں شاید میں آپ لوگوں کے کام آسکوں۔“

”کب کیا کسی نے ہمارے کام آنا، ہماری تو دنیا ہی لٹ چکی ہے۔“

”اس حادثہ کے بعد کیا آپ کو کبھی خیام دکھائی دیا جس طرح باقی لوگوں نے وثناء، فواد اور خور کو دیکھا۔“

ماہین کی نظریں کسی ایک جگہ پے ٹھہر گئیں۔ ”سب کہتے ہیں کہ وہ چاروں دوست ایک ہی کڑی میں بندھے ہیں۔ خیام کو کسی نے نہیں دیکھا مگر سب کا کہنا ہے کہ خیام بھی ان تینوں جیسا ہوگا۔“

عمارہ نے ماہین کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور قضا میں انہیں گھمانے لگی۔ ”مگر خیام ان جیسا نہیں ہوگا تو پتہ چل جائے گا اس کا ہمزا داکر نیکی کے کاموں کا نمائندہ ہوا تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔“

ماہین نے بے چمن ہو کر عمارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں اسے دیکھ سکوں گی؟“

عمارہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”روح کو دیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر کسی نہ کسی چیز کی غیر معمولی حرکت روح کی موجودگی بتا دیتی ہے۔“

یہ کہہ کر عمارہ دوبارہ گھٹلیاں پڑھنے لگی۔ لان میں اشخاص کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ خواتین بھی کمروں میں کھپا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ابھی مزید لوگ بھی آرہے تھے۔ ساحل اور

عارفین کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ گیت سے داخل ہونے والے لوگوں پر نظر رکھیں۔

لیکن یہ کام ان کے لیے انتہائی مشکل تھا۔ ظفر، وقار، زبیر اور توقیر کے جان پہچان والے سب ادھر ہی آ رہے تھے، جن میں سے زیادہ تر لوگوں کو ساحل اور عارفین نہیں جانتے تھے۔ بس وہ اتنا ہی خیال رکھ رہے تھے کہ اگر کوئی مشکوک شخص نظر آئے تو چوکنا ہو جائیں۔

تقریباً ایک بجے کے قریب ایک بوڑھا شخص کو بھی میں داخل ہوا۔ ساحل اور عارفین نے اسے بھی ان لوگوں کی طرح نظر انداز کیا جنہیں وہ جانتے نہیں تھے۔ وہ بوڑھا شخص دوسرے مردوں کے ساتھ درمی پڑ بیٹھ گیا اور گھٹلیاں پڑھنے لگا۔ جس جگہ وہ بوڑھا شخص بیٹھا تھا، اس کے بالکل سامنے ساحل اور عارفین کرسیوں پر بیٹھے آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔ بوڑھے شخص کی نظریں ان دونوں پر ٹھہر گئیں۔ "اے اپنے اپنے اٹھارہ اٹھارہ پھینک رہا تھا مگر اس کی زبان پہ کوئی اغزش نہیں تھی اور کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔"

ساحل نے تاسف بھرے انداز میں ارد گرد کے ماحول پر نظر دوڑائی اور ٹھنڈی آہ بھر کر تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "ہم کیسے ان شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کریں گے جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب اس قدر رازیت ناک ہے کہ اس کا خیال ایک بل کو سونے نہیں دیتا اور نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ مادی وجود رکھنے والے حریف کو تو ہتھیار سے چھلنی چھلنی کیا جاسکتا ہے مگر یہ سفید پیو لے جو موت کے سائے بن کے ہمارے اندر درخشاں رہے ہیں انہیں کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔"

عارفین نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "جنگ صرف ہتھیار سے نہیں لڑی جاتی۔۔۔ جنگ تو جذبات کی بھی ہوتی ہے۔۔۔ قلم کی بھی۔۔۔ تصورات کی بھی۔۔۔ مگر ہر جنگ میں راہ دکھانے والی ذات اس پروردگار کی ہی ہے۔۔۔ اس پر بھروسہ رکھو۔ مایوسی ہمت توڑتی ہے، خدا پر بھروسہ ہی راہ دکھاتا ہے۔ ہمیں بھی کوئی نہ کوئی راہ مل جائے گی۔ جس سے ہم ان بدردھوں سے نجات حاصل کر سکیں گے۔" ساحل اور عارفین کی نظر اس بوڑھے شخص کی طرف نہیں تھی۔

بوڑھا شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر ایسی جگہ پر بیٹھا جہاں سے ہال کا داخلی دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہال میں خواتین بیٹھی تھیں۔ ساحل عارفین سے باتیں کر رہا تھا اور عارفین خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں A-meter کی طرف تھیں۔ A-meter کی سوئیاں بالکل ساکن تھیں۔ اچانک ہی A-meter کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں۔

عارفین کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی اس نے ساحل کے شانے کو جھٹکا دیا اور A-meter کی طرف اشارہ کیا۔ ساحل نے جنبش کرتی ہوئی سوئی کی طرف دیکھا تو اس نے موہاں نکالا اور فوراً عمارہ کلون کیا۔

عمارہ نے فون سنا اور آہستگی سے بولی۔ "ٹھیک ہے تم ظفر اور حسنان کو بتا دو اور بہت محتاط ہو کے ارد گرد کے ماحول پر نظر رکھو۔" یہ کہہ کر عمارہ نے موہاں بند کر دیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے ہال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ اس جگہ پہنچی جہاں A-meter لگا تھا A-meter کی سوئیاں جامہ تھیں۔ اسے اس بات کی تسلی ہوئی۔ موقوف الفطرت مخلوق جس کا اشارہ باہر ہوا ہے وہ ابھی ہال میں داخل نہیں ہوئی۔



مشکوٰۃ بوڑھا شخص اپنی جگہ پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کوئی خاص اطلاع مل گئی ہے وہ تیز قدم چلتا ہوا لوگوں کے بیچ میں سے گھٹتا ہوا غیٹ سے باہر آ گیا۔

اس کی متلاشی نگاہیں چاروں اور کھومنے لگیں۔ اس وقت وہ لوگوں کی نظروں سے بے نیاز، بے خوف و خطر کسی کی تلاش میں تھا۔ وہ کسی جوان کی طرح مستعد تھا۔ ایک دم سے اس کے بوڑھے جسم میں کسی نو جوان جیسی توانائی اور پھرتی آ گئی تھی، مگر وہ ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا جیسے اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو مگر ارد گرد لوگوں کی موجودگی میں وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ عمارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہال کے داخلی دروازے کے قریب ہی

کھڑی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی قوت اس کا خدا پر بھروسہ اور حوصلہ ہی تھا اور نہ اس طرح کے معاملات کا اس کے پاس کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔
وہ جس طرح بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ عورتوں کی نظروں اس پر ٹھہر گئی تھیں۔ ان میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔
ماہین اور رُخسانہ اس کے پاس آئیں۔ ”خیریت ہے۔“ رُخسانہ نے پوچھا۔

عمارہ کے چہرے سے پریشانی صاف عیاں ہو رہی تھی اس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”نہیں خیریت نہیں ہے۔ باہر A-meter کی سوئیاں بتا رہی ہیں کہ کوئی نہیں مخلوق ان میں موجود ہے۔ شاید گھر کے دوسرے حصوں میں بھی ہو۔“

پھر اس نے کپے کے پیچھے لگے ہوئے A-meter کی طرف اشارہ کیا، اگر وہ بھی مخلوق اس کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں گی۔

ماہین اور رُخسانہ کی خوف سے آنکھیں پھیل گئیں۔
”اب کیا ہو گا، اگر ان شیطانی طاقتوں نے ادھر حملہ کر دیا تو یہاں تو لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہم کیسے لوگوں کو ان بدروحوں سے بچائیں گے۔“

رُخسانہ کے لہجے میں بھی کپکپاہٹ تھی۔ عمارہ نے تسبیح پڑھتے ہوئے ایک نظر رُخسانہ کی طرف دیکھا۔ ”اس طرح کی باتیں کر کے آپ میرا حوصلہ کم نہ کریں بس دعا کریں۔ سورۃ النہل پڑھیں وہ شیطانی مخلوق ہمارا کچھ نہیں اُکاڑ سکے گی۔ ویسے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی مخلوق شیطانی مخلوق ہی ہو۔“

اس دوران میں A-meter کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں۔ کپکپاہٹ کا جھٹکا رُخسانہ کے وجود سے گزر گیا اور ماہین بھی خوف سے جیسے پتھر کی ہو گئی۔ عمارہ نے فوراً ظفر کو فون کیا۔ چند ساعتوں میں ہی ظفر اور حسنان ہال میں پہنچ گئے۔
تو قیر اور وقار گھر کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔
وہ سب پورے گھر میں تقسیم ہو گئے۔ ابھی تک یہی مخلوق کا بس اشارہ ملا تھا مگر کوئی عجیب حرکت سامنے نہیں آئی تھی۔ ظفر عمارہ کے پاس آیا تو عمارہ نے گھبراہٹ سے کہا۔ ”وہ بھی مخلوق ہال میں داخل ہو گئی ہے۔“

”بست سے کام لیں، عورتوں پر نظر رکھیں، ہم دونوں ادھر ہی ہیں۔“

عورتوں تک یہ بات پہنچ گئی۔ ان میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بوڑھا شخص تیزی سے ہال کی طرف بڑھنے لگا تو ساحل کی نظر اس پر پڑ گئی۔ ساحل تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”بابا جی آپ اندر کہاں جا رہے ہیں؟“
”اندر میری بیوی ہے، اسے بلانا تھا۔“

”آپ اپنی بیوی کا نام بتائیں، میں بلاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ساحل نے اسے قریب سے دیکھا تو اسے بوڑھے کا چہرہ مصنوعی سا لگا۔ اس نے بہت ہوشیاری سے اس کے چہرے پر چٹکی بھردی۔ بوڑھے نے ساحل کا ہاتھ پیچھے کیا تو اس کے چہرے کا ماسک ساحل کے ہاتھ میں آ گیا۔ زرغام بے نقاب ہو گیا۔

زرغام برقی سرعت سے وہاں سے بھاگا، ساحل اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ زرغام لوگوں کو دھکیلتا ہوا، گرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔... ساحل بھی لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ساحل کے لیے اسے پکڑنا مشکل تھا لیکن وہ ساحل کی نظروں سے دور نہیں گیا تھا۔ ساحل مسلسل اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ شخص اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ”اوہ شٹ“ ساحل نے بدست سے رکا ٹکرایا۔ وہ کچھ دیر تک اسے ڈھونڈتا رہا پھر اسے ہال کا خیال آیا کہ خواتین کسی مشکل میں نہ ہوں۔ وہ تیزی سے واپس ہال کی طرف بڑھا۔ اندر ہال میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ساری خواتین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ظفر، وقار احمد اور عارفین بھی اندر ہال میں ہی تھے۔ باقی ساتھی باہر ان میں تھے۔ عمارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ کچھ پڑھتے ہوئے ہال میں گشت کر رہی تھی۔ پھر وہ ہال کے وسط میں کھڑی ہو گئی اور اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔
”کون ہو تم، ہمارے سامنے آؤ۔۔۔۔۔“

عمارہ نے یہ بات تین بار دہرائی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے لہجہ سانس کھینچا اور ایک بار پھر بلند آواز میں بولی۔
”میں جانتی ہوں کہ تم یہاں ہال میں موجود ہو اگر سامنے نہیں آتا

کے احساسات اور آنکھوں میں چاہت کی تڑپ تھی۔ ماں کو سامنے کچھ کر دہ زرع غم جیسے حریف کو بھول گیا تھا۔

ماہین جذبات کی رو میں بہتی ہوئی اس سپید سائے کی طرف بھاگی جو چند ساعتوں میں ہی غائب ہو گیا۔ وقار احمد آگے جا کے اسے لے آیا۔ ”خود پر قابو رکھو۔ تمہاری غفلت سب کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔“

زرع غم تفتیش میں اپنے اصل روپ میں آ گیا۔

”جن طاقتوں پر تجھے اتنا گھمنڈ ہے یہ میری ہی دی ہوئی ہیں، مجھ سے آنکھ پھولی نہ کھیل اگر واقعی طاقتوں کا حامل ہے تو آج مجھ سے مقابلہ کر۔“ ہوا میں ایک روشنی کی شعاع ظاہر ہوئی اور چھت کی طرف بڑھتی ہوئی غائب ہو گئی۔

زرع غم سمجھ گیا کہ خیام نے اس کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ وہ ہال کے دروازے کی طرف بھاگا اور ہال سے باہر نکل کر کھلے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ روشنی کی شعاع ایک بار پھر ظاہر ہوئی اور زرع غم کے سامنے زمین کی طرف بڑھتی ہوئی خیام کے وجود میں تبدیل ہو گئی۔ اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ چیختے چلاتے پیچھے ہٹنے لگے۔ ہال میں موجود تمام لوگ باہر آ گئے۔

یہ سنسنی خیز منظر دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ بیٹے کو سامنے دیکھ کر ماہین اور وقار احمد تڑپ کر رہ گئے۔ عمارہ نے تذبذب سی کیفیت میں ساحل کی طرف دیکھا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے یہ دوسرا شخص کون ہے ہم ان دونوں میں سے کس کو اپنا دوست سمجھیں۔“

”میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال آج بہت بڑے راز سے پردہ ہٹ جائے گا۔“

○ ○

زرع غم نے قہقہہ بلند کیا۔ ”مجھے پوری امید تھی کہ تم مجھے یہاں ضرور ملو گے۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ورنہ تم میرے اشاروں پہ چلنے پر کبھی انکار نہ کرتے۔“

”میرا راستہ وہ نہیں جو تُو نے وشاء، فواد اور حور یہ کو دکھایا تھا میرا ہمزاد مسخر کر کے بے شک تم نے مجھے بہت سی طاقتیں دی ہیں مگر مجھ پر تیرا عمل اُلٹا ہو گیا۔ میرے ساتھ جو روحانی طاقتیں ہیں وہ شیطانی نہیں ہیں۔ مجھ ب نے تیری موت کے لیے چنا ہے شاید اسی لیے مجھ سے میرا ماوی وجود

چاہتے تو ہمیں اپنی موجودگی کا ثبوت دو۔۔۔۔۔۔“

ہال کی چھت پر لگا ہوا کرشل کا قانونس بڑی طرح جھولنے لگا۔ جو خواتین اس قانونس کے نیچے تھیں وہ تیزی سے وہاں سے پیچھے ہٹ گئیں۔ قانونس زور دار دھماکے کے ساتھ زمین پر آگرا اس پر لگی کرشل کی گولیاں دور دور تک بکھر گئیں۔ عورتیں چلتی چلاتی ہال سے باہر بھاگنے لگیں۔ عمارہ انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ ”آپ اس طرح باہر نہ جائیں باہر بھی آپ کی جان کو خطرہ ہے، آپ اسی جگہ پر رہیں تو میں آپ کی جانیں بچانے کی کوشش کروں گی۔“

مگر عورتیں عمارہ کی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ پانی کے ریلے کی طرح باہر نکلتی عورتوں میں کب زرع غم اندر گھس آیا کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ کچھ خواتین نے عمارہ کی بات سمجھ لی اور وہیں رک گئیں۔ زرع غم بے خوف سب کے سامنے آ گیا اس نے اپنی جیب سے لوہے کی چمچی نکالی۔

”کون ہو تم۔۔۔۔۔؟“ ساحل اشتعال میں زرع غم کی طرف بڑھنے لگا تو ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ جو کوئی بھی جہاں سے کرنے دو جو وہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی ایسی ایسی بات ہوئی تو وہ ہماری دسرس سے باہر نہیں ہے۔“ وہ لوہے کی چمچی کو مختلف زاویوں میں حرکت دینے لگا۔

ایک خاص سمت کی طرف وہ لوہے کی چمچی اپنے آپ بجنے لگی۔ زرع غم نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ڈب نکالا، اس نے جلدی سے اس ڈبے سے چمچی بھر راکھ نکالی اور اسے اس سمت میں اچھال دیا۔

چمچی بجنا بند ہو گئی اور اس کا رخ خود بخود دوسری جانب ہو گیا اور وہ پھر سے بجنے لگی۔ زرع غم نے ایک لمبے کی تاخیر کے بغیر اس سمت میں راکھ اچھال دی۔۔۔۔۔۔ راکھ کے ذرات میں غیر مرئی وجود ظاہر ہو گیا۔

ماہین چیخ اٹھی۔ ”خیام! میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔“ فضا سے راکھ جھڑتے ہی وہ روحانی جسم غائب ہو گیا زرع غم نے پھر اپنی چمچی کو حرکت دی اور خیام کی موجودگی ظاہر ہونے پر اس نے منجھی بھر راکھ ہوا میں اچھال دی۔

خیام کا ہوا میں معلق روحانی جسم ایک بار پھر ظاہر ہو گیا۔ اس بار اس کی نظریں ماہین کی طرف تھیں۔ چہرے پہ دفا

لے لیا ہے۔

زرغام نے تسخراں انداز سے خیام کے روحانی جسم کو دیکھا جس میں سے آر پار کی چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

”اگر مجھ سے مقابلہ کرنا ہے تو مادی وجود میں آؤ۔“

خیام نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑا اور اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔ وہ ایک بھیا تک بھیڑیے کی صورت اختیار کر گیا ایسا بھیڑیا جس کا جسم تو انسان جیسا تھا مگر اس کی بالوں والی جلد اور چہرہ بالکل بھیڑیے جیسا تھا۔ زرعغام نے بھی وہی عمل دہرایا اور ویسا ہی روپ دھار گیا۔ وہ خونخوار بھیڑیے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

لوگوں نے خوفزدہ ہو کر بھاگنا شروع کر دیا، وہ ظفر کے گھر سے جلد از جلد باہر نکلنا چاہتے تھے لوگ اپنی اپنی سواریوں میں برقی سرعت سے وہاں سے نکل گئے۔ تھوڑے سے لوگ چونچ گئے تھے وہ دہشت سے ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔

دو خون آشام بھیڑیے دھاڑتے ہوئے اپنے لمبے لمبے نوکیلے دانت ایک دوسرے کے جسم میں پیوست کر رہے تھے۔ ظفر نے ساحل سے اپنی پسٹل لانے کے لیے کہا ساحل جلدی سے اس کی پسٹل لے آیا اور اس کے ہاتھ میں تھادی۔ اس نے پیٹ کی جیب میں پسٹل ڈال لی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ان خونخوار بھیڑیوں کے قریب پہنچ کے ظفر نے اپنی پسٹل نکال لی اور بہت احتیاط سے لوگوں کے پیچھے چھپتے ہوئے اس نے اپنی پسٹل کا نشانہ سیٹ کیا۔ وہ بھیڑیے بن مانسوں کی طرح پھلتائیں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ وہ خنجر جیسے نوکیلے پنجوں سے ایک دوسرے کو زمین پر پٹختے۔

ظفر نے تذبذب سی کیفیت میں ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ ”پتہ ہی نہیں چل رہا کہ ان دونوں میں سے زرعغام کون ہے۔“

ساحل نے ان کی پسٹل کی نال کو پیچھے کر دیا۔ ”آپ اپنی پسٹل جیب میں واپس ڈال لیں۔ ہمیں زرعغام کو زندہ سلامت پکڑنا ہوگا۔“ ایک خونخوار بھیڑیا ہوا میں اڑتا ہوا گھر کی

چھت پر جا کھڑا ہوا۔ دوسرا بھی دھاڑتا ہوا ہوا میں اڑتا ہوا چھت پر چلا گیا اور پھر ان کی خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ فضا میں خوفناک غرغراہٹ اور دلخراش چیخیں گونجنے لگیں، بالکل ایسے ہی جیسا ایک درندہ مارے تکلیف کے تڑپتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ساحل اور ظفر بے چینی سے انہیں ڈھونڈنے لگے مگر اب وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ساحل دوڑتا ہوا پورچ کی طرف بڑھا۔ وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ وہ ظفر کی گاڑی میں خاموشی سے بیٹھ گیا، اس کی نظر کبھی بائیں اطراف کی گاڑیوں کی طرف جاتی تو کبھی بائیں طرف کھڑی گاڑیوں کی طرف جاتی۔

کچھ ہی دیر بعد زرعغام زخمی حالت میں اسے گاڑیوں کے قریب نظر آیا۔ وہ سلور کلر کی کلئس میں بیٹھا اور اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال کر وہاں سے نکل پڑا۔ ساحل نے فوراً اپنی گاڑی پارکنگ سے نہیں نکالی تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی گاڑی وہاں سے نکالی اور بہت ہوشیاری کے ساتھ زرعغام کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔

وہ زرعغام کا ٹھکانا جانتا چاہتا تھا جہاں پر وہ کے وہ یہ شیطانی کھیل کھیلتا تھا۔ زرعغام کی گاڑی کے پیچھے ایک گاڑی تھی، اس کے پیچھے ساحل کی گاڑی تھی۔ اس لیے زرعغام کو شاید شک نہ ہو وہ کافی دور تک زرعغام کا پیچھا کرتا رہا۔

مگر اشارے کے لیے ٹریفک سگنلز پر گاڑیاں رکیں تو زرعغام کو سائینڈ مرر سے ساحل کی گاڑی نظر آ گئی۔ گرین سگنل کا اشارہ ملتے ہی گاڑیاں دوڑنے لگیں، زرعغام انتہائی تیز سپید سے وہاں سے نکل گیا ساحل نے دوسری گاڑیوں کو کڑھ کر کے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

CNG کی ریڈ لائٹ اشارہ دینے لگی کہ CNG ختم ہو گئی ہے، گاڑی پٹرول پر کرنی ہوگی ساحل نے گاڑی پٹرول پر کرنی مگر کچھ گزیر ہو گئی، گاڑی جھٹکے کھانے لگی اور پھر بند ہو گئی ساحل نے گاڑی دوبارہ سٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر گاڑی تو جیسے جام ہو گئی۔ اس نے اسٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”لوہ میرے خدایا! یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔“ زرعغام وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

عمارہ نے وہاں پر موجود مردوں اور خواتین کو تسلی دی۔ ”آپ سب اطمینان سے بیٹھ جائیں، خطرہ ٹل گیا ہے۔“

اس نے خواتین سے التماس کی کہ وہ ہال میں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھیں۔ ”یہ قرآن پاک کی برکت ہی ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہم سب محفوظ ہیں۔ آئیے ہم سب خدا کی عبادت کر کے دعا مانگتے ہیں کہ خدا ہمیں ان شرابی طاقتوں سے بچنے کا راستہ بتائے۔“

رُخسانہ لوراہین نے بھی خواتین کو حوصلہ دیا اور وہ سب دوبارہ ہال میں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنے لگیں۔

کوئی نہیں جان سکا کہ جیت خیاں کی ہوئی یا زرغام کی۔ سب کے دل و دماغ میں بس تجسس بھرا خوف رہ گیا۔ بچنے کی راہ ملی بھی اور گم بھی ہو گئی۔ خیاں کی جھلک دیکھنے کے بعد سے ہی ماہین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈیپریشن سے اس کا بلڈ پریشر مائی ہو گیا۔ وقار احمد نے اسے بیڈ پر لٹایا، اسے میڈیسن دی۔ عمارہ بھی ماہین کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ بات تو آپ نے تسلیم کر لی تھی تا کہ خیاں اب دنیا میں نہیں ہے۔ مگر آپ کو اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ خیاں کی روح ٹیک مقصد کی طرف سفر ہے۔ وہ ان بدروحوں میں سے نہیں ہے جو لوگوں کو موت کے کھاٹے اتار رہی ہیں بلکہ شاید وہ ہم سب کے لیے سیاحان کے آیا ہے۔“

پھر عمارہ نے ساحل کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے تھے تا کہ ہم بغیر ہتھیار کے جنگ لڑ رہے ہیں اور ہمیں وہ راہ بھی معلوم نہیں جس سے ہم دشمن تک پہنچ سکیں۔ اب ہمارے پاس ہتھیار بھی ہوں گے اور وہ راستے بھی جن سے ہم اپنے دشمن تک پہنچ سکیں گے میں دھیان گیان کے ذریعے خیاں کی روح سد اہل کروں گی۔“

”تم روح کا نام لیتی ہو تو میرا کلیجہ کتنا ہے میری آنکھوں میں میرا جیتا جاگتا خیاں ہی بسا ہے۔ رب میری جان لے لیتا مگر میرے بیٹے کو کچھ نہ ہوتا۔“ ماہین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وقار احمد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ظفر اور عمارہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے، وقار احمد نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”نا سمجھ عورت! خدا سے گلے کر رہی ہے۔ فواد، حوریہ،

وشاء اور خیاں تو حرام موت مرے ہیں۔۔۔ ان کی موت خود کشی ہی ہے نہ ہی ان کی روحوں کو چمکن آئے گا اور نہ ہمیں۔“ ظفر نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”ماہین تو عورت ہے کمزور ہے تم تو حوصلہ کھو۔“

پھر ظفر، عمارہ سے مخاطب ہوا۔ ”تم جو بات کہہ رہی تھی وہ ٹھیک ہے لیکن میرے خیال میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج کے عمل کے بعد وہ بدروحیں ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں یا نہیں۔ ہمیں انہیں خود سے چھیڑنا نہیں چاہیے۔ اگر ہمیں ان کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہو تو ہم کوئی اقدام کریں گے۔“

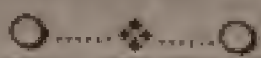
عمارہ تسخراً میز انداز میں مسکرائی۔ ”روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والی بدروحیں ہمیں اتنی مہلت نہیں دیں گی کہ ہم کوئی اقدام کر سکیں۔ آپ لوگ بس اتنا کریں کہ روزانہ قرآن پاک پڑھیں نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ مجھے جو کتا ہے وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ جب بھی آپ کو کوئی خطرہ محسوس ہو آپ نے مجھ سے رابطہ کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر عمارہ نے اپنا کارڈ ظفر کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں میرے کلینک کا بھی نمبر ہے اور گھر کا بھی۔“ ساحل، عمارہ کی طرف بڑھا۔ ”آپ تو ابھی کچھ دیر زکیں کی نا۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے جانا ہوگا، میں نے ایک Patient کو وقت دیا ہے۔ وہ کلینک میں میرا ویت کر رہا ہوگا آپ لوگ مجھ سے ہر وقت رابطہ رکھیں جب کہیں گے، میں آ جاؤں گی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ لوگ کس قدر گھبر مصورت حال سے گزر رہے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔“

عمارہ نے چلتے ہوئے پاٹ کر ساحل کی طرف دیکھا۔ ”تم نے زرغام کا پتہ لگاتا ہے ہمارا اس تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔“

”اس شیطانی درندے کا پتہ تو میں ضرور لگاؤں گا۔ میں اور عارفین مل کر یہ کام کریں گے۔“ ساحل نے کہا۔

عمارہ وہاں سے چلی گئی۔ رُخسانہ، ماہین کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر دابنے لگی۔ رُخسانہ کی اپنی بھی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ان سب کا درد مشترک تھا۔



عمارہ کے والد فوت ہوئے نو برس ہو چکے تھے۔ وہ اپنی

والدہ کا واحد سہارا تھی۔ ظفر کے گھر سے وہ سیدھی اپنے کلینک گئی۔ دو خواتین مریضہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو باری باری چیک کیا۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی اسٹنٹ سے چائے منگوانے کو کہا۔ اس کی اسٹنٹ غبر اس کے لیے چائے لائی تو عمارہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔

”خیریت ہے، آپ پریشان لگ رہی ہیں۔“ غبر نے پوچھا۔

عمارہ نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کے پوٹوں کو دھیر سے دھیر سے دباؤ دیا اور اپنے سر کو کرسی کی پشت سے نکال دیا۔

”بہت پیچیدہ مسئلہ ہے، میں نے اپنی آٹھ سال کی پریکٹس میں ایسا مسئلہ handle نہیں کیا۔ مگر وہ خاندان اتنی مشکل میں ہے کہ میں ہر حال میں ان کی مدد کروں گی۔“

”آخر ایسا کیا معاملہ ہے؟“

”بتاؤں گی تمہیں۔ کیونکہ مجھے تمہاری مدد بھی چاہیے ہوگی۔“

اسی دوران عمارہ کے گھر سے فون آ گیا۔ اس کی والدہ رابعہ آن لائن تھیں۔

”جی امی جان.....“ عمارہ نے فون ریسیو کیا۔

”امی کی جان! تم نے پورے سات بجے گھر آ جانا ہے..... کسی مریض کو چیک نہیں کرنا..... تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری امی بالکل اکیلی ہوتی ہے۔“

عمارہ نے ہونٹوں کو چباتے ہوئے غبر کی طرف دیکھا اور بھونڈوں کو اچکاتے سوچنے لگی کہ ماں کو کیسے مناؤں کہ آج اسے نو بجے تک کلینک میں ہی رہنا ہے۔ اس نے ہمت کر کے بات شروع کی۔

”امی جان! آپ کی بات درست ہے، میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ سات بجے آپ کے پاس پہنچ جاؤں مگر کبھی کوئی ایسا مریض آ جاتا ہے کہ کتنا پڑتا ہے، آپ سے بڑی معذرت چاہتی ہوں، مجھے نو بجے تک کلینک میں رکنا ہوگا، بہت ضروری کام ہے۔ میں گھر آ کے آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گی پلیز امی جان..... آپ کے پاس ماما رہے ہنا، آپ اسے نو بجے سے پہلے گھر مت بھیجنا۔“

”جو مریضی کرو، تمہارے پاس اپنی ماں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔“ رابعہ نے غلطی سے فون بند کر دیا۔

”امی.....“ عمارہ بس بولتی ہی رہ گئی۔ اس نے رسیور رکھا اور بک سیلف سے کوئی کتاب ڈھونڈنے لگی۔

اسے اپنی مطلوبہ کتاب مل گئی۔ وہ کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ غبر الماری کی کتابیں ترتیب سے رکھنے لگی عمارہ نے ترچھی نظر سے غبر کی طرف دیکھا۔ ”تم ایسا کرو سٹور روم میں جتنی بھی ہمزاد سے متعلق کتابیں ہیں سب لے آؤ۔“

غبر نے بھونڈوں کو اچکاتے ہوئے پھنی پھنی آنکھوں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ”ہمزاد.....؟“ عمارہ باجی! آپ کس قسم کا کیس بینڈل کر رہی ہیں۔“

”فی الحال میں نے جو تم سے کہا ہے وہ کر دیا باقی باتیں میں تمہیں بعد میں سمجھا دوں گی۔“ عمارہ کتاب کے صفحات تیزی سے پلٹ رہی تھی شاید اسے وہ موضوع نہیں مل رہا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ غبر کمرے سے جا چکی تھی اسے سٹور روم میں کتابیں ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ گیا۔ عمارہ نے اتنی دیر میں بک سیلف سے وہ کتابیں اور نکال لیں۔

غبر دھول سے آئی ہوئی چار کتابیں لے کر آفس میں داخل ہوئی تو عمارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ غبر خود دھول سے آئی آثار قدیمہ کا کوئی مجسمہ دکھائی دے رہی تھی۔

”ہنس لیں آپ اتنا تو ہوتا نہیں کہ ماما سے کہہ کے سٹور روم کی صفائی کروالیں۔“

اس نے ٹھپ سے دھول سے آئی کتابیں میز پر رکھ دیں عمارہ ضروری سے کھانسنے لگی۔ ”کتابیں تو صاف کر دیتیں، سارا ٹیبل کندا ہو گیا ہے۔ مجھے کپڑا دے میں صاف کر دیتی ہوں۔ تم جا کے اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔“

غبر وہاں سے چلی گئی۔ عمارہ نے کتابیں صاف کیں اور پھر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غبر بھی آ گئی۔ عمارہ نے ایک کتاب غبر کی طرف بڑھائی۔ ”تم یہ کتاب پڑھو، کوئی خاص بات نظر آئے تو مجھے بتانا۔“ غبر بھی عمارہ کے ساتھ مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔

عمارہ نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور خاص خاص معلومات جو اس نے کتابوں سے اکٹھی کیں لیپ ٹاپ میں

Save کرنے لگی۔

عمر نے کتاب عمارہ کی طرف بڑھائی۔ ”یہ دیکھو، ہمزاد مسخر کرنے کا طریقہ۔“

عمارہ نے کتاب سامنے رکھی اور وہ معلومات بھی Save کر لی۔ اس نے کتاب عبر کی طرف بڑھائی۔ ”اس کتاب میں ڈھونڈو کہ شیطانی عملوں میں سرگرم ہمزاد کو کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے۔“

عمر نے کتاب لی اور دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے تقریباً پوری کتاب کا مطالعہ کیا مگر اسے ایسی کوئی معلومات نہ ملی۔ اس نے کتاب بند کی اور عمارہ سے مخاطب ہوئی ”تم شیٹ پر ڈھونڈو۔۔۔۔۔“

”شیٹ پر کام تو میں گھر جا کے بھی کر سکتی ہوں۔ مجھے بس آفس کی کتابیں چیک کرنی ہیں۔“ عمارہ Keyboard پر انگلیوں کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ اسی مصروفیات میں کب آٹھ بج گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ عمارہ اپنے ٹینک کا پکڑ لگا کے دوبارہ آفس میں آکر بیٹھ گئی۔

عمر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہم دونوں اکیلے اس ٹینک میں کیا کریں گے تم نے Reception والوں کو اور Gate keeper کو بھیج دیا ہے۔ یہاں تک کہ میڈ۔ مسز کے شور میں بھی کوئی نہیں ہے۔“

عمارہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دھیرے دھیرے سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ ”جو کام ہم نے کرنا ہے اس کے لیے تہائی بہت ضروری ہے۔ تم نئی ہو اس لیے گھبرا رہی ہو، تم نے تو اسی کمرے میں رہتا ہے بس یہ خیال رکھنا ہے کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ٹینک کو کھلا دیکھ کر کوئی بھی آسکتا ہے۔۔۔ اور پھر جو کام میں کرنے چاہی ہوں، اس میں کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔“

عمارہ نے اپنا کوٹ اتارا اور اپنا وہ پتہ سر پر اوڑھ لیا اس نے آفس کی دیوار میں لگا دروازہ کھولا اور اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ جو اس نے خاص طور پر روحانی علاج کے لیے مخصوص کیا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر قرآنی آیات آویزاں تھیں۔ کمرے میں کوئی ایکسٹرنل لائٹ آن نہیں تھی۔ بڑی کینڈلا

جیٹل کے اور کلکزی کے اسٹینڈز پر لگی ہوئی تھیں۔ زمین پر بھی دائروں میں بے شمار دیے اور کینڈلز پڑی ہوئی تھیں کمرے میں خاص فریج نہیں تھا۔

ایک دیوان شیٹ تھا اور ایک سنگل پلیٹ جس پر مریض کو لٹا کے عمارہ روحانی اور نفسیاتی دونوں طرح کے علاج کرتی تھی۔ عمارہ کینڈلز جلائے لگی۔ عمر اس کے کہنے کے مطابق اس دوسرے کمرے میں ہی بیٹھی تھی۔ کمرے میں کچھ روشنی ہو گئی تو عمارہ نے دروازہ بند کر لیا اور باقی کینڈلز بھی جلائے لگی۔ کمرے میں اس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

ساری کینڈلز جلانے کے بعد وہ دائرے میں پڑے ہوئے دیوں اور کینڈلز کی طرف آئی۔ اس نے دیے روشن کیے اور کینڈلز بھی جلا دیں۔ پورے کمرے میں موم بتیوں کی ٹنگی سی ہوا سرد روشنی پھیلی گئی۔

عمارہ موم بتیوں اور دیوں کی روشنی سے جھلکتے ہوئے دائرے میں داخل ہو گئی اور پھر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس ہی ایک شیشے کا گلاس اور تاش کے پتے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر اس سامان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح کچھ پڑھتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس نے زمین پر ایک چھوٹی سی شیٹ بچھائی۔ شیٹ پر کچھ زاپے سے کھینچے ہوئے تھے۔ اس نے شیٹ کے درمیان میں شیشے کا گلاس رکھ دیا اور اس کے چاروں طرف تاش کے پتے رکھ دیئے تاش کے پتوں کو اس نے اس طرح رکھا کہ Kings کی تصاویر اوپر تھیں اور تاش کے نمبر اور پان والی سائیڈ نیچے تھی۔

اس نے تاش کے پتوں کے اوپر اپنی انگلیاں رکھیں اور پتوں کے اوپر اپنی انگلیوں کو اس طرح حرکت دینے لگی گویا کہ وہ پانوں بجا رہی ہو۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھی۔ اس کے عمل کے مطابق اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکت کے ساتھ تاش کے پتوں میں بھی حرکت ہونی چاہیے تھی مگر تاش کے پتے ساکت ہی رہے۔ پھر اس نے اٹنے رکھے ہوئے گلاس کے اوپر اپنی انگشت رکھی اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی وہ خاصی دیر تک اپنا خاص

عمل پرمختی رہی مگر کلاس میں بھی کوئی حرکت نہیں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مبہوت نظروں سے گلاس اور تاش کے پتوں کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس طریقے سے میں نے کئی بار روحوں سے بات کی ہے مگر آج کیا بات ہے میرا عمل کام نہیں کر رہا۔“

اس نے وہی سارا عمل دوبارہ دہرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا آخر کار وہ مایوس ہو کے اٹھ گئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ساری کینڈلز بجھا دیں۔ وہ ہنچھی بگھی سی کمرے سے باہر نکلی تو قبر نے حیرت سے پوچھا۔ ”اتنی جلدی عمل ختم ہو گیا۔“

”بات نہیں بنی، سات دن کے بعد دوبارہ کوشش کروں گی۔ اب گھر چلتے ہیں۔“ عمارہ نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔

عزیز نے سکھ کا سانس لیا۔ ”شکر ہے.....“ عمارہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”پلیز اس طرح گھور کر مت دیکھو یوں لگتا ہے کہ آپ کے اندر کوئی روبرو آگئی ہے۔“

عزیز نے آنس کا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

”بکواس بند کرو اور جلدی چیزیں سمیٹو۔“ عمارہ نے کہا اور پھر خود بھی اس کی مدد کرنے لگی۔

دونوں نے مل کر ساری چیزیں سمیٹیں اور پھر آفس بند کر کے دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں، عمارہ گاڑی ڈرائیوگر رہی تھی۔ وہ سارے راستے خاموش ہی رہی۔ اس نے پہلے عزیز کو ڈراپ کیا اس کے بعد اپنے گھر کے راستے کی طرف چل پڑی۔

اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک جال سا بن گیا تھا جس میں وہ ابھی جا رہی تھی۔

عمارہ اپنے دھیان میں گاڑی چلا رہی تھی کہ اچانک اس کا ذہن سو گیا..... اس کے اعصاب جیسے کسی لور کے ذہن کے تابع ہو گئے۔ اس نے گاڑی کسی اور سمت موڑ لی۔

شہر کی آبادی سے دور اس کی گاڑی دھول اڑاتی ہوئی کچی زمین میں رُک گئی۔ خواب سے بیدار ہونے جیسی کیفیت میں اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

اس نے اپنے چاروں لور دیکھا تو خوف و ترس تھا بہت کی جھرجھری اس کے پورے وجود سے گزر گئی۔ وہ قبرستان میں تھی۔ اس نے اسٹیرنگ پر کھاپے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں کیسے آگئی.....“ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ریورس گیر لگایا مگر اس کے ذہن میں خیال سا ابھرا۔ ”کہ کوئی طاقت ہے جو اسے یہاں تک لائی ہے اسے کچھ دیر یہاں رکھنا چاہیے۔“

اس نے گاڑی روک لی اور گیر نارمل کرتے ہوئے ہینڈ بریک کھینچ لیا۔ وہ گاڑی سے اتری تو ایک بار پھر قبرستان کے خوفناک سناتے نے اس کے قدم ہروکے۔

اس نے حوصلے کا لہبا سانس کھینچا اور چل پڑی۔ قبرستان میں خوف سے ترسراتی خاموشی، گیسٹر تارکی اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی سناتے کو چیرتی ہوئی نرمی نرمی آوازیں گونج رہی تھیں۔

جانم کی چودھویں رات تھی، اتنی روشنی تھی کہ عمارہ باسانی چل سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ڈارچ تھی مگر اسے ابھی اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔ وہ فضا میں بھی نظریں گھماتے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ تنگ کچا راستہ تھا جس کے دونوں اطراف قبریں تھیں۔ وہ بہت احتیاط سے چل رہی تھی۔ وہ اپنی طور پر کسی بھی بد اسرار قوت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ اسے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی بوکھلائی ہوئی بولی۔

”کون جہاں.....؟“ وہ آواز قبرستان کے دائیں جانب سے آئی تھی۔ وہ دائیں جانب کی قبروں کی طرف بڑھنے لگی۔ اس جگہ چلنا بہت مشکل تھا۔ قبریں بہت قریب قریب تھیں اس کا پاؤں کبھی کسی قبر پر اور کبھی کسی قبر پر رکھا جاتا۔

وہ اپنے قدموں کو سکیڑ کر احتیاط سے چلنے لگی۔ کافی دیر چلنے کے بعد اسے ایک قبر دکھائی دی جس کے اوپر چراغ جل رہا تھا۔ اس قبر کے آس پاس کافی کھلی جگہ تھی۔ وہ قبر عمارہ کی توجہ کا مرکز بن گئی وہ اس قبر کے قریب گئی۔ قبر کے اوپر تازہ پھول کی پتیوں تھیں۔

اس نے پھول کی پتوں کو ہاتھ میں لیا۔ "گلتا ہے کہ یہ قبر آج ہی بنی ہے۔ مگر لڑکی کے چیخنے کی آواز کہاں سے آئی تھی۔"

یہ سوال اس کے ذہن میں گونج ہی رہا تھا کہ لڑکی کی چیخ کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے نکل آئی۔ اس بار وہ آواز اس کے پیروں کے پاس سے زمین سے آرہی تھی۔

وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اپنے قدموں کو پیچھے کیٹنے لگی کہ اچانک اس کے قدموں کے قریب زمین کے نیچے سے درجنوں بلیاں اٹھنے لگیں۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو رہا تھا کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ بلیاں زمین سے سوراخ کر کے نکل رہی ہیں یا زمین سے اُبھر رہی ہیں وہ خونخوار بلیاں اس پر چھپٹ پڑیں۔ عمارہ سر کے بل زمین پر گر پڑی۔ بلیوں کے ناخن چھری کی دھار جیسے تیز تھے۔

کچھ بلیاں اس کے پیروں کو چٹنی ہوئی تھیں، کچھ اس کے بازوؤں پر اور دو بلیاں اس کی گردن پر چھپٹ پڑیں۔ عمارہ نے اپنے بازوؤں پر چٹنی بلیوں کو جھٹکنے سے دور پیچھا اور اپنے گلے میں چٹنی ہوئی بلیوں کو ہاتھوں سے کھینچنے لگی۔ اس کے گلے سے خون بہنے لگا اور پاؤں بھی زخمی ہو گئے۔

عمارہ ساتھ ساتھ خاص آہٹیں پڑھنے لگی آہستہ آہستہ وہ خونخوار بلیاں غائب ہو گئیں۔

عمارہ کھانسی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ اس کے جسم کے سارے زخم اس طرح بھر گئے تھے گویا کہ زخم گئے ہی نہ ہوں۔ اس نے بھی بھی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھا اور اسی جگہ یوگا کے سٹائل میں آلتی پالتی مار کے اپنے بازوؤں کو گھٹنوں سیدھا کر کے اپنی بڑی انگلی اور انگوٹھے کو آپس میں جوڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے پہلے کہ اس پر کوئی اور حملہ دیتا اس نے دھیان لگانا شروع کر دیا۔

اس نے اپنی کمر اور سر کو سیدھا کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس نے اپنا سارا دھیان اپنی سانسوں کی طرف کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو گئی اور روحانی دنیا میں داخل ہو گئی۔ اس کا مادی وجود بے وقعت ہو گیا اور لطیف وجود حرکت میں آ گیا۔ اس نے اپنے من کی آواز سے کسی سے بات کی۔ "تم جو کوئی بھی ہو، میرے سامنے آؤ، مجھ

سے بات کرو اس طرح چپ چپ کر مجھ پر وارنہ کرو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

عمارہ کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کی وجدانی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھی تھی اس جگہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس بات کے جواب میں کوئی سامنے نہیں آیا، اس نے ایک بار پھر سب کچھ ایسے ہی دہرایا۔

اس کے سامنے درخت سے ایک شعاع زمین کی طرف بڑھی اور پھر وہ شعاع خیام کے روحانی وجود میں تبدیل ہو گئی۔ ایسا روشنی کا وجود جس سے اس کے پیچھے کی چیزیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔۔۔۔۔ جس سے آ رہا پار جایا جاسکتا تھا۔ عمارہ دھیرے سے مسکرائی۔

"اچھا تو یہ تم ہو۔۔۔۔۔" خیام تسخرانہ انداز میں مسکراتا ہوا عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"مجھ پر اس طرح حملہ کرانے کا مقصد۔۔۔؟" عمارہ نے سوال کیا۔

خیام ابھی بھی تسخرانہ انداز میں عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمارہ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ "مجھ پر حملہ کیوں کرایا۔"

خیام نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "آپ اس چھوٹے سے واقعے کو حملہ کیوں کہہ رہی ہیں۔۔۔ میں تو صرف دیکھ رہا تھا کہ جس لڑکی نے زرغام سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہے وہ کتنی حوصلہ مند ہے۔"

عمارہ نے اپنی سانسوں کی مشق جاری رکھی۔ "میں حوصلہ مند ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ بس ایک ارادہ لے کر نکلی ہوں اور پُر امید ہوں کہ خدا میرا ساتھ دے گا۔ کوشش ہے اور ہمارے لیے بس اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ مجھ اپنی زندگی پیاری نہیں۔ نیک مقصد کے لیے جان چلی جائے تو چلی جائے۔ تم بتاؤ کہ زرغام کے خلاف اس جنگ میں ہمارا ساتھ دو گے۔"

خیام کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔ "میں تو اس میدان جنگ میں اس وقت سے ہوں جب آپ نہیں آئی تھیں۔ میں زرغام کے خلاف کیسے لڑتا ہوں کیسے نہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔ یہ نیک ہمزاد کی شیطان ہمزاد سے جنگ ہے۔ آپ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ اور آپ کی ٹیم کی ہر لمحے کی خبر ہے جس وقت آپ کو میری

ضرورت ہوگی میں خود آ جاؤں گا۔ آپ مجھے بلائے گی
کوشش مت کرنا۔“

”کیوں۔؟“ عمارہ نے پوچھا۔

”روحانی دنیا بہت پیچیدہ ہے، راز و گیان کی باتیں
آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ اب گھر جائیں۔“ یہ کہہ کر خیام
نائب ہو گیا۔

عمارہ نے بھی آنکھیں کھول لیں۔ وہ جلد از جلد
قبرستان سے نکل گئی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

○ ❖ ○

چھ ماہ گزر گئے۔ سب دوست معمولات زندگی میں
مصروف رہے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ عمارہ
نے بھی ان دوستوں کے ہاں کئی بار چکر لگایا مگر کسی بھی مخلوق یا
روحانی اجسام کی موجودگی کے کوئی اثرات نہیں ملے۔

ان سب کو ایک المیہ نمان سا ہو گیا کہ شاید و شہاء، فواد،
حور یہ کی رو میں آخری رسومات کے بعد کسی خاص مقام پر چلی
گئی ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر محیط و رابھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن
انہوں نے خود فریبی کے احساس میں اپنا دھیان روزمرہ کے
کاموں میں لگا لیا تھا۔ عمارہ انہیں یہی سمجھاتی تھی کہ وہ تبھی بھی
اچڑا رہے ہوں۔ وہ تین ہزار کسی بھی وقت دوبارہ ان کی زندگی
میں آ سکتے ہیں۔

مگر وہ جیسے ذر کے احساس سے نکل کر دوبارہ اس میں
جیتا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ جتنے عرصے میں انہوں نے زرخام
کا پتہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

خیام کے منع کرنے کی وجہ سے عمارہ نے بھی اسے
بلائے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی اپنے کلینک میں مصروف ہو
گئی۔ عمارہ اپنے کلینک میں مصروف تھی۔ کوئی خاتون نہیں جو
اپنے کسی نفسیاتی مسئلے کے سلسلے میں آئی تھیں، عمارہ اس خاتون
کی گفتگو بہت توجہ سے سن رہی تھی کہ اس کی دوست کا فون آیا۔

عمارہ نے فون سنا۔ ”میں ابھی مصروف ہوں، کچھ دیر
کے بعد میں خوفون کروں گی۔“

”پلیز فون بند نہ کرنا، میں تمہارا زیادہ نام نہیں لوں گی
صرف تمہیں یہ بتانا ہے کہ رومان ہوٹل میں مصوری کی نمائش
ہے۔۔۔۔۔۔ سنا ہے کہ بہت اچھی اچھی پینٹنگز لگانی ہیں انہوں نے

نمائش میں۔۔۔۔۔۔ شام چار بجے کا وقت ہے بس تم نے میرے
ساتھ چلنا ہے۔“

عمارہ نے دوست سے معذرت کے ساتھ کہا۔ ”آج
تو رات تک میرے پاس وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ تم کسی اور کو لے
جاؤ۔“

اس کی دوست نے غصے سے فون بند کر دیا۔ عمارہ نے
خفیف سے انداز میں سر کو جھٹکا اور پھر اس خاتون کے ساتھ
مصروف ہو گئی۔

رومان ہوٹل شہر کا مہنگا ترین ہوٹل تھا اس لیے یہ نمائش
بھی خاص تھی۔ باذوق لوگوں کے لیے جنہیں آرٹ سے خاص
لگاؤ تھا۔ لوگ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس نمائش
میں جانے کے لیے تیار تھے۔ نمائش کا وقت شام چار بجے سے
لے کر رات دس بجے تک تھا۔

چار بجے تک تو ہوٹل میں دو یا تین لوگ ہی پہنچے تھے مگر
آٹھ بجے ہاں لوگوں سے نل تھا۔

نمائش میں تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں
کی تعداد زیادہ تھی۔ شائقین بہت دلچسپی سے پینٹنگ دیکھ رہے
تھے۔ پینٹنگز مختلف موضوعات کی، دکائی کر رہی تھیں کچھ کا
مطلب صاف اور واضح تھا، مگر کچھ تصاویر مخفی خصوصیات کی
حامل تھیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے
تھے۔ ان میں زیادہ تر پینٹسٹر ایک آرٹ کا نمونہ تھیں۔

چائے کا بندوبست ہوٹل والوں کی طرف سے تھا جس
کے ساتھ sweets اور ٹیکری کی اشیاء تھیں۔ باقی لوگوں کی
اپنی مرضی تھی وہ ہوٹل سے کچھ بھی آرڈر کر سکتے تھے۔ تین
پینٹنگز خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

ایک پینٹنگ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے فیشن کی
وکاس تھی۔ جس کا عنوان رنگ اتاج تھا۔ رنگوں کو مختلف زاویوں
سے پھینک کر ایک لڑکی کا سراپا ہر جوڈ ظاہر کیا گیا تھا۔ مصوری
تحلیلی صلا جیتیں نکھر کر سامنے آ رہی تھیں۔ دوسری پینٹنگ میں
غروب آفتاب کا منظر تھا جس میں زندگی کی رعنائیاں دم توڑتی
وکاسی گئی تھیں، کیسے سورج اپنی چلچلاتی روشنی سمیٹ کر بھیگی
آنکھوں جیسی سرخی فضا میں بھر دیتا ہے۔ سرفی مائل سورج کا
عکس جھیل پر پڑ رہا تھا، گویا جھیل اس کی ٹم ٹم تھی، نزدیک ہی

ایک چھوٹی سی کنیا تھی جس کے اس پاس سرکنڈے کی فصل تھی۔ اس نظارے میں خاص مقناطیسیت تھی۔

تیسری خوبصورت پینٹنگ میں صبح کا منظر تھا۔ اس کلچر پینٹنگ میں گاؤں کا ماحول دکھایا گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ پرندوں کے غول کے غول مستی میں مخمور ہو پرواز تھے۔ تصویر بول نہیں سکتی مگر مصور نے فضا میں سروں کے نشان دے کر ظاہر کیا تھا کہ پتہ سرت سب پرندوں کی چچہاہٹ سے بھرپور ہے۔ بھرے بھرے کھیتوں میں لوگوں کو اپنے کاموں میں مشغول دکھایا گیا تھا۔

خواتین بھی مختلف کاموں میں مشغول دکھائی گئی تھیں۔ اس نمائش میں دو اخباروں کے صحافی بھی موجود تھے جو ان پینٹنگ کی تصاویر لے رہے تھے۔ عمارہ کی دوست نوشی بھی اس نمائش میں موجود تھی۔ پانچ منزل عمارت کا یہ ہوٹل روڈشیوں سے جگہ لگا ہوا تھا۔

سب سے اوپر کی منزل بالکل خالی تھی وہاں ہاتھ روم اور سنور روم کے علاوہ کوئی کمرہ نہیں تھا کھلی چھت میں خوبصورت پودوں کی بہترین کولیکشن تھی۔ چھت پر بے شمار گیلے تھے۔ اس بلند بالا عمارت کے اس حصے سے شہر کا نظارہ بہت خوب دکھائی دیتا تھا۔ مگر رات کے اس پہ میں یہ حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہوٹل کے نچلے حصوں میں لوگوں کی چہل پھل اور رونق تھی جبکہ اس حصے میں سناٹے کی سرسراہٹیں تھیں۔ صحافی مائیک نے کرنوشی کی طرف بڑھا۔ ”آپ کا نام۔“

”میرا نام نوشی ہے۔“

”آپ کیا کرتی ہیں۔“

”جی میں بی کام کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب۔۔۔۔۔ ہم ایکسپریس نیوز کے لیے

ریکارڈنگ کر رہے ہیں۔ آپ کا اس نمائش کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

نوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج کی نمائش بہت زبردست ہے۔ مجھے ساری پینٹنگز ہی بہت اچھی لگی ہیں لیکن حامد صاحب اور وجاہت صاحب کی پینٹنگز منفرد ہیں۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان میں ایک پیغام بھی ہے۔“

”آپ ہماری ٹیم کے ذریعے کوئی پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہیں۔“

نوشی نے کیرے کی طرف دیکھا۔ ”اس طرح کی exhibitions منعقد کر کے ہمیں آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، اس طرح نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آئے گا بلاشبہ یہ لوگ بھی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم ہوں گے۔“

”Thanks۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر express news

کا نمائندہ دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے ان کی رائے معلوم کرنے لگا۔ نوشی کے موبائل کی رنگ بجی۔ نوشی نے موبائل دیکھا تو سکرین پر عمارہ کا نام تھا۔۔۔۔۔ اس نے منہ سیرتے ہوئے کال کاٹ دی۔

عمارہ نے پھر نمبر ملایا۔ نوشی نے ہونٹ جھنجھتے ہوئے اس کا فون سنا۔ ”اب کیوں فون کیا ہے جب میں نے آنے کو کہا تو صاف انکار کر دیا۔“

عمارہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”اتنی جلدی تھا ہو جاتی ہو میں جو نئی فارغ ہو جاؤں گی، تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤں گی۔“

”ہاتھ لگانے آؤ گی تو ایسا آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”ابھی مریض بیٹھے ہیں، میں کوشش کروں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں ایک گھنٹے تک ادھر ہوں اگر تم آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ میں گھر چلی جاؤں گی۔“ نوشی نے موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

عمارہ نے فون بند کر دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کچھ لوگ نمائش دیکھ کر جا رہے تھے اور کچھ آ رہے تھے۔ دھیمی دھیمی موسیقی نے فضا میں سرور بھردیا تھا۔ لوگ خوشگوار ماحول میں اس تقریب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہوٹل کی آخری منزل جہاں سناٹے اور تاریکی کا راج تھا دیوار پر لگے الیکٹریک ساکٹ سے شعلے نکل رہے تھے۔ جس کا تعلق خلی منزلوں سے تھا۔

سب سے نچلے حصے کا میٹر الگ تھا مگر اوپر کی منزلوں میں بجلی کم تیز ہونے لگی تھی۔ چھت پر لگے الیکٹریک ساکٹ کے شعلے بڑھنے لگے تھے، ہوٹل کے فرنٹ پر چھت کی طرف لگی ہوئی ڈیکوریشنز لائٹ بجھ گئی تھیں۔ ہوٹل کا اوپر کا حصہ باہر سے بھی اندھیرے میں ڈوبا گیا تھا۔

اندھیرے میں ڈوبی ہوئی چھت کے اوپر آسمان میں عجیب پراسرار سی حرکات ہو رہی تھیں، روشنی کے تین دائرے ایک دوسرے کے آگے پیچھے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ روشنی کے وہ دائرے چھت کی طرف بڑھنے لگے اور پھر چھت کے وسط میں روشنی کے تین ہالے نمودار ہوئے۔

ہوٹل کی درمیانی منزل میں بجلی کبھی بند ہو جاتی اور کبھی آ جاتی، ان جلتی بجھتی روشنیوں میں لوگوں نے شور مچا دیا۔ الیکٹریشن اپنے لوازم لے کر چھت پر پہنچے اور ساکٹ بورڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگے، الیکٹرک ساکٹ سے پنکھاریاں نکل کر دور دور تک گر رہی تھیں۔

بالآخر مین سوئچ زوردار دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ چلی دونوں منزلیں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ ان حالات میں تو جزیرہ چلایا جاسکتا تھا اور نہ ہی UPS استعمال ہو سکتا تھا۔ ایمر جنسی لائٹس استعمال کر کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی جانے لگی۔

ہوٹل کے دوسرے حصوں میں لوگوں کو منتقل کیا جانے لگا۔ الیکٹریشن اپنے کام میں مصروف تھے مگر اب ان کا کام لمبا ہو گیا بجلی کی دوبارہ بحالی کے لیے اب انہیں خاصا وقت درکار تھا۔ پینٹنگز کی نمائش اسی طرح جاری تھی لوگ بہت دلچسپی سے یہ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ پینٹنگز کے ساتھ ان کی قیمت بھی درج تھی۔ بہت سی پینٹنگز لوگوں نے خرید لی تھیں، مگر نمائش ختم ہونے تک وہ پینٹنگز اپنی جگہ پر ہی دہنی تھیں۔

دو لڑکیاں بیک اسٹیج کے عنوان سے لگی پینٹنگ کے بارے میں اپنا اظہار خیال ایک دوسرے سے شیئر کر رہی تھیں۔ اچانک وہ دونوں لڑکیاں اپنے منہ پر ہاتھ رکھے چیخنے لگیں۔ لوگ ان کی چیخ و پکار سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ پہنی پھٹی آنکھوں سے پینٹنگ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

لڑکیوں کے گرد جمع ہونے والے لوگ بھی اپنی جگہ جامد ہو کے رہ گئے تھے۔ پینٹنگ میں جو ایک لڑکی کا محض سر پایا دکھایا گیا تھا وہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر میں بدل گیا تھا جس کے ہڈ بھی تھے۔ پوری تصویر میں خون کے چھینے تھے۔ نمائش میں آئے ہوئے تقریباً سبھی لوگ اس پینٹنگ کے گرد جمع تھے۔

صحافی بھی اس پینٹنگ کی تصاویر لے رہے تھے، لوگ خوفزدہ سبے سبے کھڑے تھے۔ مگر روشنی جس پینٹنگ کے سامنے کھڑی تھی، اس کے قدم وہیں منجمد ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا، اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھی کہ آرٹ گیلری میں کیا ہو رہا ہے اس کی تو نظریں اپنے سامنے والی پینٹنگ میں جڑی تھیں۔ کسی خوفناک مصور نے اس پینٹنگ کا منظر ہی بدل دیا تھا۔

وہ پینٹنگ جس میں غروب آفتاب کا منظر تھا ایک تخت دیکتی آگ کے منظر میں بدل گیا۔ سرکڈے کی فصل کو آگ لگی ہوئی تھی اور اس کا سیاہ دھواں پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جس نے ہر جگہ سیاہی بھر دی تھی۔

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک شخص کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اس کے قریب آ کر وہ پینٹنگ دیکھی، وہ بے ساختہ چلایا۔ ”یہ کیکس اس پینٹنگ کا منظر بھی تبدیل ہو گیا ہے۔“

کچلی پینٹنگ کو چھوڑ کے لوگ اس پینٹنگ کے گرد جمع ہو گئے، مگر روشنی پتھر کی بنی اپنی جگہ پر ہی کھڑی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں تجسس بھی تھا اور خوف بھی، صحافی بھی دھڑا دھڑا تصاویر کھینچ رہے تھے۔ ابھی لوگ اپنے دلوں کو سنبھال بھی نہ پائے تھے کہ ہال میں دل کو دھڑکھڑانے والی خوبصورت نسوانی آواز گونجنے لگی۔

کوئی لڑکی اپنی سمجھ کن آواز میں کوئی گیت گارہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو کھینچ رہا تھا مگر وہ زبان سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جس میں وہ گیت گارہی تھی۔ اس آواز میں ایسی کشش تھی کہ لوگ دیوانوں کی طرح اس آواز کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔

اس آواز کے پیچھے چلتے ہوئے لوگ اس پینٹنگ تک پہنچ گئے جس میں گاؤں کے فطری ماحول کی عکاسی کی گئی تھی مگر اب اس پینٹنگ کا منظر بیت ناک تھا۔ پینٹنگ میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکھائے گئے لوگ خون میں لت پت گرے ہوئے تھے۔ پرندے بھی زخمی حالت میں آسمان سے زمین کی طرف گر رہے تھے۔

یہ خوفناک بدلا ہوا منظر لوگوں کو حیران نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ سب لوگ جاوہری آواز کے سحر میں مبتلا تھے۔

جواب دیا۔

عمارہ نے التجا کی۔ ”پلیز آپ مجھے اندر جانے دیں۔“
انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم کسی کو اندر نہیں بھیج سکتے، پولیس کی کارروائی ہو رہی ہے۔“

عمارہ نے اپنا کارڈ دکھایا۔ ”میں ایک ڈاکٹر ہوں، آپ لوگوں کی مدد کر سکتی ہوں۔“

انسپکٹر نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی اور اسے بمشکل زنجیر میں سے گزاردیا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی کہیں بیٹھا دور ہاتھ اور کوئی کہیں، مگر عمارہ کو کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا کہ آخر ہو کیا ہے۔ ایک پولیس سولجر عمارہ کے پاس سے گزرا تو عمارہ نے اسے بلایا۔ ”ایکسیو زی!“
وہ عمارہ کے قریب آیا۔ ”جی فرمائیے۔“

”میں اندر جانا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر عمارہ نے اسے اپنا کارڈ دکھایا۔

سولجر نے وہ کارڈ لے لیا۔ ”آپ ابھر ہیڑکیں میں پرمیشن لے کر آتا ہوں۔“

عمارہ اسی جگہ کھڑی رہی۔ کچھ بر کے بعد وہ سولجر عمارہ کے قریب آیا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“

عمارہ اس شخص کے پیچھے چل پڑی۔ وہ شخص ہال کے قریب جا کے ٹک گیا۔ ”آپ اندر جائیں۔“

یہ کہہ کر وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔ اندر کا ہولناک منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سر چکرایا اور وہ لڑکھڑاکے رہ گئی۔ ہال میں لوگوں کی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر پینٹنگ لگی تھیں مگر فرش لوگوں کے خون سے رنگا ہوا تھا۔

ہال میں Investigation کے لیے پولیس کے چار افراد اور دو ڈاکٹرز تھے۔

لوگوں کی اموات بہت عجیب طریقے سے ہوئی تھیں۔ کسی کے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ٹاک سے بھی بہہ رہا تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی موت دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہوئی ہے، کسی کی گردن پر دو دانتوں کے نشان تھے جس سے اس کا جسم اس طرح نیلا پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو اور کوئی اٹھسا ہوا تھا۔

عمارہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے مگر وہ دل

عمارہ اپنی مریضہ کے ساتھ مصروف تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نوشی کے نمبر پر فون کیا۔ نکل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ”کیسی لاپرواہی کی ہے۔“

عمارہ نے دوبارہ فون ملایا مگر اب بھی یہی صورت حال تھی۔ اس نے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ ”اوہ نو بج گئے ہیں آج تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔“ اس نے غبر کی مدد سے آفس کا سامان سمیٹا اور پھر وہاں سے نکل گئی۔ غبر بھی اس کے ساتھ تھی حسب معمول اس نے پہلے غبر کو ڈراپ کیا پھر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

گھر پہنچ کر اس نے پھرتی سے اپنے کپڑے چینچ کیے، اپنا ہینڈ بیگ لیا اور اپنی والدہ کو بتا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راجا اس کے پیچھے پیچھے پورج تک آگئیں۔ ”اتنی دیر سے جارہی ہو اب وہاں زیادہ وقت نہ لگانا اور گاڑی آہستہ آہستہ چلانا۔“

”لو کے ماما!“ عمارہ نے مسکراتے ہوئے گاڑی ریورس کی اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ اسے بھی پینٹنگ سے خاصا لگاؤ تھا۔ وہ ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔ وہ ہوٹل کے قریب پہنچی تو اس کا دل دھک سے بندھ گیا۔

ہوٹل کے آگے لوگوں کا ہجوم تھا۔ 1122 کی گاڑیاں، پولیس کی گاڑیاں، ایسویس گائیاں لوگوں میں گھرنی کھڑی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم کو پولیس والوں نے لوہے کی زنجیر سے روکا ہوا تھا۔

کچھ لوگ جو امدادی کارروائیوں میں مدد کر رہے تھے کسی نہ کسی طریقے سے اندر چلے گئے تھے۔ عمارہ کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا وہ گاڑی بند کر کے لوگوں کے ہجوم کی طرف بڑھی۔ وہ لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں اس کی سماعت سے نکل رہی تھیں۔

”میرا بیٹا اندر ہے۔۔۔ پلیز آپ مجھے اندر جانے دیں۔“ کوئی اپنی بہن کے لیے رو رہا تھا، اس کا تو بس دل گھبرا رہا تھا جو کسی خطرے کی طرف اشارہ تھا۔ وہ لوگوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی لوہے کی زنجیر کے قریب پہنچ گئی اور انسپکٹر سے کہنے لگی۔

”یہ سب کیا ہے؟ اندر کیا ہوا ہے؟“

”ابھی ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔“ انسپکٹر نے

پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ چلتے چلتے ایک دم اس کے قدم زک گئے وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اونچا اونچا روئے لگی۔ نوشی خون میں لت پت زمین پر ڈھیر تھی۔ اس کی بھی موت دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہوئی تھی۔ وہ اس لاش کے قریب دو زانو بیٹھ گئی۔

”مجھ سے ایسی بھی کیا ناراضگی کہ اتنی دور چلی گئی۔“

ایک آفیسر عمارہ کے قریب آیا۔ ”یہ آپ کی کیا لگتی ہیں۔“

”یہ میری دوست ہے۔“ عمارہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

”آپ خود کو سنھالیں، آپ جیسے لوگ بھی ہمت چھوڑ

دیں گے تو کمزور دل لوگوں کو کون سنھالے گا۔ آپ ان کے گھر والوں کو بھی اطلاع کر دیں۔ پچاس لوگوں کا مرزہ ہوا ہے،

صورت حال بہت گھبر ہے۔ پولیس کی ضروری کارروائی پوری

ہو جائے تو لاشیں ان کے لواحقین کے سپرد کر دی جائیں گی۔“

یہ کہہ کر وہ آفیسر اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ دوبارہ

Discussions میں مصروف ہو گیا۔ نوشی کی آوازیں

ابھی بھی عمارہ کے ذہن میں گونج رہی تھیں کہ کس طرح وہ اسے

نمائش میں آنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔

وہ کچھ دیر نوشی کی لاش کے پاس بیٹھی رہی پھر اٹھ کر

باقی لاشوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے صرف اپنی دوست کی

موت کا غم نہیں تھا، مرنے والے تمام لوگوں کے لیے اس کا دل

پتھر پتھر تھا۔ جسم اس طرح غمزداد تھا جیسے وہ اپنے قدموں کو

تھکستے ہوئے چل رہی تھی۔ اس نے اپنا زمین پر ٹکلتا ہوا دودھ

اکٹھا کیا تو اس کا دودھ سیاہ راکھ سے بھر گیا، اس نے اپنے

دو پٹے کو چھو تو اس کے ہاتھ بھی سیاہ ہو گئے۔

اس نے سر اسیمہ نکالوں سے چاروں اور دیکھا۔ ہال

کی کتنی ہی چیزیں سیاہ دھوئیں سے کالی ہو گئی تھیں۔ اس نے

گردہ کی شکل میں کھڑے ہوئے آفیسر سے بلاتال پوچھا۔

”ادھر آگ لگی تھی؟“

آفیسر نے فوری جواب دیا۔ ”نہیں۔“ پھر وہ عمارہ کے

قریب آیا۔ ”اس طرح معلوم ہو رہا ہے جیسے سیاہ دھواں

کھڑکیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہوا ہے جبکہ نہ تو باہر آگ

لگی ہے اور نہ ہی اس ہوٹل کے آس پاس اور نہ ہی الیکٹرک تار

جلی ہے۔ کوئی ایک شخص بھی نہیں بچا جس سے پوچھا جائے کہ

آخر ہوا کیا تھا، اس کیس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جس سے عقل دنگ رہ جاتی ہے ابھی کچھ دیر پہلے آرٹسٹ آئے تھے جن کی پینٹنگ کی نمائش تھی۔ ان میں سے ایک دو اشخاص نے تو سب کو حیران کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ تین پینٹنگز کے مناظر چھینچ ہو گئے ہیں۔ یہ کام اس قدر صفائی سے کوئی انسان نہیں کر

سکتا۔ آپ ایک عالمہ بھی ہیں آپ ہماری مدد کریں۔“

وہ آفیسر عمارہ کو ان پینٹنگز کے پاس لے گیا۔ عمارہ

نے وہ تینوں پینٹنگز دیکھیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔ تینوں پینٹنگز میں ایک خوفناک پیغام تھا، پردوں والی

لڑکی، آگ سے اٹھتا سیاہ دھواں اور موت کی نیلہ سلاوینے والی

خوبصورت آواز۔

عمارہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ ”مارنے

والوں نے ان پینٹنگز کے ذریعے پہلے ہی موت کا اعلان کر

دیا تھا۔“

آفیسر بوکھلا سا گیا۔ ”کیا آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ یہ

قتل کیسے ہوئے؟“

”میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتی سوائے اس کے کہ یہ

سب کالے جادو سے کیا گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں

سے داخل دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ گروپ میں کھڑا ہوا

ایک آفیسر تھکیک آمیز انداز میں مسکرایا۔ ”ہم یہاں قاتل ڈھونڈ

رہے ہیں کہ اسے جھکڑی پہنائی جائے اور آپ کالے جادو کی

بات کر رہی ہیں۔“

عمارہ نے باہر کی طرف جاتے ہوئے قدم ردک لیے

اور پلٹ کر آفیسر کی طرف دیکھا اور فنی خیز انداز میں بولی۔

”قتل کرنے والا کوئی انسان نہیں جسے آپ جھکڑی پہنا دیں وہ

ایک ہمزاد ہے۔“

عمارہ خوف سے تھر تھراتا ہوا اس فقرے کا تیرہا میں

چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس ساری صورت حال میں فی دی

چیل کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی، کیمرہ آن تھا۔ میڈیا کے

ذریعے یہ خبر لوگوں میں پھیل گئی۔ لوگ خوفزدہ ہو کے من گھڑت

کہانیاں گھڑنے لگے۔ ہمزاد موت کا سایہ بن کر ہر ایک کے

حواس پر سوار ہو گیا۔

ظفر، تو قیر اور اس کے دوسرے دوستوں نے بھی یہ

ریکارڈنگ دیکھی، ان کی تو جیسے بیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ظفر نے عمارہ سے رابطہ کیا۔ عمارہ نے موبائل اٹھایا اور جھکے جھکے لہجے میں بولی۔ ”وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ زرغام نے ان تینوں کے ہمزاد کو اپنے خطرناک مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ خوف و ہراس ایک شیطان کی طاقت کو بڑھاتا ہے۔ اتنے لوگوں کے قتل کے بعد بھی ان کی طاقتیں بڑھ گئی ہوں گی۔ آپ وشاء، فواد اور دور یہ کے گھر والوں کو یہ ہدایت کریں کہ محتاط ہو کر رہیں آپ اور ساحل میرے گھر آئیں۔“

یہ کہہ کر عمارہ نے فون بند کر دیا۔ عمارہ نے صوفے سے پشت لگالی اور سر کو جھکے سے پیچھے کی طرف رکھ دیا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد ظفر اور ساحل اس کے گھر آ گئے۔ عمارہ نے انہیں جہان خانہ میں بٹھایا عمارہ کی والدہ بھی وہیں آ گئیں۔ وہ بھی اس خوفناک واقعہ پر بہت رنجیدہ تھیں مگر اصل حقائق سے بے خبر تھیں۔ ”تم عمارہ سے باتیں کرو میں ملازمہ کے ہاتھ چائے پیجکتی ہوں۔“

یہ کہہ کر عمارہ کی والدہ وہاں سے چلی گئیں۔ ساحل نے عمارہ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی دوست کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔“

عمارہ کا ہنسی آواز میں بولی۔ ”وہ پچاس لاشیں ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے آ رہی ہیں، ان کے لواحقین کے بین ابھی بھی میری سماعتوں میں گونج رہے ہیں۔ میں نے آپ دونوں کو اس لیے بلایا ہے کہ کسی بھی طریقے سے ہمیں زرغام تک پہنچنا ہے۔ ہمارے لیے ہمزاد سے مقابلہ کرنا مشکل ہے مگر مادی وجود رکھنے والے ایک انسان کو تو ہم قابو کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس شخص کو ختم کر دیا تو یہ قتل و غارت بھی ختم ہو جائے گی۔“

ساحل کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ”اس خبیث کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ظفر نے فوراً ساحل کو ٹوکا۔ ”یہ معاملے جوش سے نہیں ہوش سے ہینڈل کیے جاتے ہیں۔“

ساحل ایک بار پھر تپ کر بولا۔ ”ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھیرے پیٹھے ہیں اور خون آشام ورنہ سرغام پھر رہا ہے۔ ایک

دفعہ ہی موقع ملا تھا زرغام کے ٹھکانے تک پہنچنے کا، نہ جانے کیسے وہ چند منٹوں میں نظروں سے لاپتہ ہو گیا، کتنی عجیب بات ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان پچاس لوگوں کا قتل و شاء فواد اور دور یہ نے کیا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتے۔“

عمارہ نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”ساحل یہ بھی یاد رکھو کہ وہ تینوں مر چکے ہیں اور مرے ہوئے لوگوں پر پولیس کیس نہیں کرتی۔ مجھے آپ لوگوں سے بس یہی کہنا ہے کہ کچھ بھی تدبیر سوچیں مگر ہمیں زرغام تک پہنچنا ہے۔ اتنے بڑے واقعہ کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کا اگلا نشان کون ہوگا۔“

”ایک اور پریشانی کی بات ہے۔“ ظفر نے جیسے پتائی کی۔

”کیا.....؟“ عمارہ نے پوچھا۔

ظفر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”وینا کے والدین نے وینا اور عارفین کی شادی کی تاریخ رکھ دی ہے اسی صبیٹے کی پندرہ تاریخ۔“

”اور میرے خدایا! آج جمعرات ہے اور اگلے جمعہ کو وینا کی شادی ہے۔ ان حالات میں انہیں تاریخ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اس مسئلے کا کوئی حل تو ڈھونڈ لیتے۔“

”وہ لوگ کہتے ہیں کہ عارفین نے انگلیٹڈ جانا ہے۔ شادی جلدی کرنا ان کی مجبوری ہے۔“ ساحل نے کہا۔

عمارہ بے چینی سے چہل قدمی کرنے لگی۔ ”بے شک عارفین شادی کے بغیر انگلیٹڈ چلا جاتا، وہ لوگ کوئی بھی حل نکالتے مگر ابھی وینا کے نکاح کا مطلب ہے کہ فواد کو لاکارنا۔“

ساحل نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ”کیا ہم ان بدروحوں کے خوف سے اپنی زندگی کے معاملات ہی ختم کر دیں۔“

عمارہ نے اپنا ہاتھ میز پر مارا۔ ”جب تک ہم ان کے شیطان ہمزاد کو قابو نہیں کر لیتے ہم لاپرواہ نہیں ہو سکتے۔ ہماری تھوڑی سی غفلت کئی لوگوں کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔“

ظفر نے عمارہ کی تائید کی۔ ”ساحل! عمارہ ٹھیک کہہ رہی ہے، میں وینا کے گھر والوں سے بات کروں گا کہ فی الحال اس شادی کا ارادہ ترک کر دیں نمائش میں ہونے والے واقعے سے پہلے ہی بہت خوفزدہ ہیں یقیناً میری بات سمجھنے کی کوشش

اس نے گاڑی کے دروازے پر بازو رکھا۔ ”کل دس بجے آپ سب کو بلا لیں۔“

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔“
ساحل گھر میں داخل ہوا تو اس کی والدہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ ”کہاں تھے تم۔ کب سے میں تمہیں فون کر رہی ہوں۔“

”کیوں خیریت تھی؟“ ساحل نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راحت اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ”جب تم موبائل ریسیو نہیں کرتے تو طرح طرح کے لوہام میرا سینہ چیرتے ہیں۔ کتنے لوگ قہر اُجھل ہو گئے ہیں۔ مجھے تو اس فکر میں خند نہیں آتی کہ میرا بیٹا خود ان بدروحوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرے بیٹے۔۔۔“

ساحل نے ماں کو اپنی باتوں کے حصار میں لے لیا۔
”آپ کو تو نخر ہوتا چاہیے کہ آپ کا بیٹا لوگوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ یہ شیطانی قتلوقات کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، قرآن پاک اور نماز پڑھنے والے مومن یا مومنہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ آپ آیتیں پڑھ کر مجھ پر پھونک دیا کریں اور اپنے بیٹے کو اللہ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جایا کریں۔ یہ بدروحیں آپ کے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔“

ردا کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ”اماں! بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے آپ خدا پر بھروسہ رکھیں اور دعا کریں کہ خدا کوئی ایسا راستہ دکھائے کہ ہم سب کو ان شیطانی ہمزاد سے نجات مل جائے۔“

ردا نے کھانا ساحل کے سامنے رکھا اور راحت کے پاس بیٹھ گئی۔ ”آپ کی دعا اس وقت ساحل کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔“

راحت نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ماں ہوں نا اس لیے پریشان ہو جاتی ہوں۔ نہ جانے کیسی آزمائشیں آگئی ہیں ہم سب کے لیے۔“ یہ کہہ کر راحت وہاں سے اٹھ گئی۔

ساحل پھر ردا اسی موضوع پر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ردا سے باتیں کر کے ساحل کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔۔۔۔۔ موسم خوشگوار تھا۔۔۔۔۔ نہ ہی سردی

کریں گے۔“

ساحل اور ظفر کچھ دیر کے بعد عمارہ کے گھر سے چل پڑے۔ دونوں بے حد پریشان تھے۔ حالات نے سنگین ترین صورت اختیار کر لی تھی۔ ظفر نے کارڈرائیو کرتے ہوئے ساحل کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”میرے گھر ہی چلو مل کر کچھ سوچتے ہیں اس مسئلے کے بارے میں۔“

ساحل نے ظفر کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”میں باتیں کر کر کے تھک گیا ہوں اب کچھ عملی طہ پر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں پلیز آپ سب سے رابطہ کریں، ہمیں مل کر اس مصیبت سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ہمارے پاس اب دقت نہیں ہے جس سے جو ہوتا ہے وہ کریں۔“

ظفر، ساحل کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اچانک اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ ”ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔“

”کیا؟“

”عمارہ کے منہ سے ”ہمزاد“ کا نام سن کر ہر طرف میڈیا میں سنسنی خیز خبریں پھیل گئی ہیں۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل چکا ہے۔ پولیس اور رجسٹرار سے محض توہمات پرستی سمجھتے ہیں مگر کچھ ایسے عالم ہوں گے جنہوں نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا ہوگا۔ کیوں نہ ہم ایک پریس کانفرنس کریں اور میڈیا کے ذریعے کسی کو مدد کے لیے پکاریں۔“

ساحل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”آپ کی بات میں دم ہے مگر میڈیا والے ہمارے لیے مسائل پیدا کر دیں گے، ہماری مدد کرنے کے بجائے اس معاملے کو Entertainment کے لیے استعمال کریں گے۔

مرقعہ معاملے لگا کر سنسنی خیز خبروں کے ذریعے لوگوں کی دلچسپی حاصل کریں گے۔ ہمیں اپنا کام نہیں کرنے دیں گے۔ ہمیں لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔

عمارہ تو لوگوں کے سامنے آ چکی ہے اگر کسی نے ہماری مدد کرنی ہوگی تو وہ خود سامنے آ جائے گا ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ زور عام کو کیسے ڈھونڈا جائے۔ کس طرح انسانوں کا قتل عام روکا جائے۔“ انہی باتوں میں ساحل کا گھر آ گیا۔

ظفر نے گاڑی روک دی۔ ساحل گاڑی سے اتر گیا،

تھی اور نہ ہی گری۔ خصوصاً رات میں ٹھنڈی تھیں۔ رات کے
دس بج رہے تھے راحت اور ردائے کمرے میں اپنے اپنے بستر
میں گھسی ہوئی تھیں۔

ساحل اپنے کمرے میں لینا گہری سوچ میں گم تھا۔
غینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عجیب سی بے چینی تھی جو
ذہن کو الجھائے جا رہی تھی۔ اسے شخص سی محسوس ہونے لگی۔ وہ
کمرے سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ اسے باہر کھلی ہوا میں
قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس نے صحن میں چار پائی بچھالی اور
اندر سے نکیہ بھی لے آیا۔

سر بانہ چار پائی پر رکھ کر وہ چپٹ لیٹ گیا۔ آسمان پر
ستارے کسی سیاہ چادر پر چمکتے نگینوں کی طرح دکھائی دے
رہے تھے۔ اس کی بے خواب آنکھوں میں وشاء کا خوبصورت
چہرہ بھلانا لگا۔ اس کی خوبصورت مسکراہٹ کے خیال
نے ساحل کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔ ایک
خوبصورت سے خیال نے ساحل کے دل کی بھر کنوں میں
اچھلی مچا دی۔

جب وشاء ان کے گھر آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں
اسے علم ہوا کہ مجھے کاجر کا حلوہ بہت پسند ہے اس نے ضد کی کہ
ردائے کاجر کا حلوہ بنانا سکھائے۔

ردائے مجھ سے محوے کا سامان منگوایا۔ میں سامان
لے کر آیا مگر من ہی من میں ہنس رہا تھا کہ جس لڑکی نے کبھی
چولہا نہیں جلا یا۔ وہ حلوہ کیسے بنائے گی۔ امی نے کاجر کی کش کر
دیں۔ ردائے وشاء کچن میں چلی گئیں حلوہ بنانے کے لیے۔

ردائے لڑائی چولہے پر رکھی اور اس میں کھی ڈال دیا۔
کھی کڑاڑانے کے بعد اس میں کش کی ہونٹ کاجر کی ذال میں
اور وشاء کو چمچ دے کر چولہے کے پاس کھڑا کر دیا۔ میں بھی ان
دونوں کی کارستانیاں دیکھنے کے لیے کچن میں ہی آ گیا۔ "میں
نے سوچا کہ میں بھی حلوہ بنانا سکھ لوں۔"

میں نے وشاء کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے
دیکھا، جو حلوہ میں چمچ بھی چین کی طرح چلا رہی تھی۔ ردائے کسی کام
سے باہر چلی گئی تھی۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"یہ تم حلوہ بنانا ہی ہو یا کڑاڑی میں نقش دنگار بنانا ہی ہو۔"
وشاء نزدں ہو کے چمچ ٹھیک طرح سے چلانے لگی تو

اس کا ہاتھ کڑاڑی سے لٹ گیا۔ وشاء چمچ کر پیچھے ہٹتی تو مجھ سے
جا لگی۔ میں نے چولہا بند کیا اور جلدی سے نیوب لے آیا۔ میں
نے اس کا ہاتھ تھاما اور زخم پر نیوب لگانے لگا، میں اس سے تڑپا
ردائی سے بولنے لگا۔ "کیا ضرورت تھی چولہے کا کام کرنے کی،
جبکہ تم نے گھر میں کبھی یہ کام نہیں کیے۔"

وشاء کی آنکھوں میں آنسو تھے، معمولی زخم سے بھی وہ
چھوٹی سی پٹی کی طرح رونے لگی تھی۔ میں اس کی ڈریسنگ کر رہا
تھا اور وہ بھگی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر اس طرح
مسکرا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ ایسا زخم تو بار بار لگے۔ ڈریسنگ
پوری ہوئی تو وہ تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔ راحت
کی آواز سے ساحل اپنے خیال سے چونک گیا۔

"ساحل بیٹا! باہر کیا کر رہے ہو اندر آ جاؤ۔" ساحل
نے اونچی آواز سے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا اندر ٹھن ہو
رہی تھی باہر کافی سکون ہے۔"

"تھوڑی دیر بعد آ جانا۔" راحت نے کہا۔ ساحل
نے پھر سے ستاروں پر نظر نہا دی۔ اس کی آنکھوں میں اللش
رنگ سے چمکائے، اس نے ستاروں سے نظر ہٹائی تو ایک
خوبصورت تہلی اس کے قریب قریب اتر رہی تھی۔

تہلی کے دیدہ زیب رنگوں پر تو نظریں جمائے کو دل
چاہ رہا تھا مگر من میں خوف کی ایک نیس بھی اٹھ رہی تھی
بھڑکنیں کسی انجانے سے خوف کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ تہلی
اڑتے اڑتے انار کے درخت پر بیٹھ گئی۔ ساحل کچھ دیر خاموشی
سے تہلی کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔
"ہر تہلی وشاء تو نہیں ہوسکتی۔"

"میں وشاء ہی ہوں۔" ساحل کو اپنے عقب سے آواز
آئی۔ وہ خوف کے جھکے سے پیچھے پلٹا مگر جونہی اس نے وشاء کو
دیکھا اس کا خوف ہوا ہوا گیا۔

وشاء انار کے درخت کی شاخ کو تھامے اس کے قریب
کھڑی تھی۔ جو خیال ساحل دیکھ رہا تھا وشاء جیسے اس خیال سے
نکل کر باہر آ گئی تھی کیونکہ اس نے وہی لباس زیب تن کیا ہوا
تھا۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت آنکھوں میں وہی دفا کی
چمک تھی۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"پہلے تو میرے معمولی سے زخم سے تڑپ اٹھتے تھے

اور اب مجھے اس طرح میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ تم ہی تو میرے رُسانِ حال تھے مگر تم نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ میں کس اذیت سے گزر رہی ہوں۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی مقناطیسیت تھی۔ ساحل اس کی طرف کھینچتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ ساحل نے اس کی بھٹی آٹکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”تم اذیت کی بات کر رہی ہو تم تو خوبصورت بلا ہو جو لوگوں کو اپنے رنگوں میں جو کر کے انہیں سرخِ خون میں نہلا دیتی ہو۔“

وِشا نے ایک ساعت میں ہی ساحل کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”تمہارے پاس اس وقت وہی وِشا ہے۔ جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے ہمراہ سے کچھ دیر کے لیے یہ روپ چرایا ہے۔ صرف ایک سوال پوچھنے کے لیے۔“

ساحل جذبات سے سلگتی کسی موم کی طرح پھسلنے لگا۔ اس نے وِشا کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے خود سے پیچھے کیا۔ وِشا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ساحل نے خود کو اور وِشا کو اسی مقام پر محسوس کیا جب ان دونوں کے دل ایک ہی جذبے کے لیے دھڑکتے تھے۔

ساحل نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیسا سوال؟“

”تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیا کیا تھا۔ کیا کی تھی میرے اندر۔ کیا تم میری وفا کی حدت سے واقف نہیں تھے؟“

ساحل نے وِشا کے آنسو پونچھے۔ ”اگر تم وہی وِشا بن کر مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو تو میں بھی وہی ساحل ہوں۔ کئی تم میں نہیں تھی مجھ میں تھی۔ میں تمہیں تمہارے ملازموں کے کوارٹرز جیسی جگہ پر نہیں رکھ سکتا تھا۔ معاشی طور پر اس قدر بد حال تھا کہ وہ آسائشیں تمہیں نہیں دے سکتا تھا جس کی تم نادہ تھیں۔

ایسی محبت کیا جو اپنے محبوب کو مشکل میں ڈال دے۔ تم تو سروی کی وہ دھوپ تھی جو جس کے آنکھن میں بھی اترتی ہر طرف تسکین بھر دیتی۔ غریب تو اپنے جذبات امیروں سے چھپا چھپا کہہ کھتا ہے تاکہ کوئی اس کی ٹہنی نہ کاڑے۔“

وِشا نے ساحل کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آؤ میرے ساتھ میں جس دنیا میں رہتی ہوں وہاں رشتے دولت کی دُور سے نہیں بندھتے۔ وہاں احساسات کے رنگ ہیں، وفاؤں کی خوشبو ہے۔ ادھر کی فضا محبت کے گیتوں سے بھکتی ہے۔ ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔“

اندرِ راحت کو اچانک خیال آیا کہ اس نے سولوی صاحب سے ساحل کے لیے تعویذ بنوایا تھا۔ وہ تعویذ اسے ساحل کو پہنا دینا چاہیے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھی، اس نے الماری سے تعویذ نکالا اور باہر صحن میں آگئی۔

ساحل جیسے اس ساحرہ کی باتوں کے طلسم میں گم تھا۔ راحت نے دیکھا کہ ساحل انار کے درخت کے قریب کھڑا ہے، وہ تعویذ لے کر اس کی طرف بڑھی۔ وِشا ساحل کے اور قریب ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ ساحل کی گردن کے قریب کیا تو اس کی نظر راحت کے ہاتھ میں تھامے ہوئے تعویذ پر پڑی وہ ایک ساعت میں ہی وہاں سے مائب ہو گئی۔

”ساحل۔“ راحت نے اسے پکارا مگر وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔

راحت اس کے قریب آئی اور اس کے گلے میں تعویذ پہنا دیا۔ ساحل نے بھر بھری سی لی اور گھبراہٹ سے انار کے درخت کے آس پاس دیکھنے لگا۔ ”وِشا! کہاں گئی۔“

راحت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کس چڑیل کا نام لے رہا ہے۔ چل اندر چل۔“

اس نے ساحل کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدم چلتی ہوئی اسے اندر لے گئی اور آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کرنے لگی۔

اگلے روز وہیں بچے ظفر نے اپنے سارے دوستوں کو اپنے گھر بلایا۔ ساحل کے نہ پہنچنے پر اسے تشویش ہوئی۔ اس نے ساحل کے گھر فون کیا۔ ”ہیلو۔“ راحت نے فون سنا۔ ”میں ظفر بول رہا ہوں۔ ساحل کو میں نے اپنے گھر بلایا تھا، کہاں ہے وہ۔“

بھائی کی آواز سن کر راحت رونے لگی۔ ”کیا بات ہے خیریت ہے۔۔۔“

”ساحل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ راحت نے گلہ گیر لہجے میں جواب دیا۔

”میں ایک کھٹے کے بعد چکر لگاؤں گا۔“ یہ کہہ کر ظفر نے فون بند کر دیا۔

مہمانوں سے فارغ ہونے کے بعد ظفر، ساحل کے گھر گیا، روتا کالج گئی ہوئی تھی۔ ظفر، ساحل کے چنگ کے قریب بیٹھا۔ ”یہ کیا بھئی ہمارا سولجر بیمار ہو گیا ہے۔“

ساحل مسکراتا ہوا پلنگ سے پشت لگا کے بیٹھ گیا۔ ”میں بیمار نہیں ہوں۔ بس معمولی سی کمزوری محسوس ہو رہی ہے اور سر میں درد سہائی خواجہواہ پریشان ہو رہی ہیں۔“

”کہاں سداخت؟“ ظفر نے پوچھا۔

”ای کچن میں ہیں۔“ ساحل نے بتایا۔

ظفر وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔

راحت اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ”تم کن تکلفات میں پڑ گئی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے چائے پی تھی۔ اور تم رو کیوں رہی تھی، ساحل تو ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔ معمولی سی کمزوری ہے۔ بخشتی وغیرہ دو ٹھیک ہو جائے گا۔“ ظفر نے کہا۔

راحت کی آنکھیں ابھی بھی اٹکھار تھیں، اس نے ظفر کی طرف دیکھا۔ ”ظفر بھائی! میں کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔“

”کس وجہ سے۔“ ظفر نے پوچھا۔

راحت نے پیالیوں میں چائے ڈالی اور ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کہنے لگی۔ ”آئیے ساحل کے پاس بیٹھتے ہیں وہ آپ کو خود بتائے گا کدات کو اس نے کس دیکھا ہے۔“

راحت چائے لے کر ساحل کے پاس آگئی۔ اس نے چھوٹے سے میز پر چائے رکھی۔ ظفر بھی ادھر ہی بیٹھ گیا۔

ساحل بے حد الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ظفر نے اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔ ”کوئی پریشانی ہے؟“

ساحل جیسے پہلے سے ہی بیتاب تھا وہ بلا تامل بولا۔ ”انگل رات میں نے دشا کو دیکھا۔“

”خواب میں؟“ ظفر نے پوچھا۔

”نہیں انگل میں نے اسے پورے ہوش و حواس میں دیکھا ہے، وہ اندر کے درخت کے قریب کھڑی تھی رات کے

کیا رہ بج رہے تھے میں کچن میں تھا تھا۔“ ساحل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اس نے آگے بڑھ کر ظفر کے ہاتھ تھام لیے۔

”انگل وہ وہی دشا تھی حساس اور جذبات سے بھرپور۔“

ظفر نے ساحل سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دل میں احساسات رکھنے والی دشا، مر چکی ہے جسے تم نے دیکھا ہے وہ اس کا شیطانی ہمزاو ہے۔“

ساحل ایک بار پھر جذبات کی رو میں بہنے لگا۔ ”انگل میرا یقین کریں وہ روریتی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا یہ روپ شیطانی ہمزاو میں کہیں گم ہو گیا ہے وہ بمشکل اس روپ میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔“

ظفر نے ساحل کے شانوں پر ہاتھ رکھے اور اسے سمجھانے لگا۔ ”دیکھو بیٹا! میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ میری دشا مر چکی ہے۔ جسے تم نے دیکھا ہے وہ ایک خوبصورت بلا ہے جو کتنے ہی لوگوں کو اپنا شکار بنا چکی ہے۔ وہ تمہیں دھوکہ دے رہی ہے ہمزاو یا تو اچھا ہوتا ہے یا بُرا دونوں خصوصیات ایک ہمزاو میں نہیں ہوتیں۔ کالے علم کرنے والے عامل کسی مرے ہوئے انسان کے اسی شیطانی ہمزاو کو قابو کرتے ہیں جو زندگی میں اسے بُرے کاموں کے لیے اکساتا ہے۔ عامل اس شیطانی ہمزاو کو سفلی کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں، تم نے آئندہ یہ غلطی نہیں کرنی اگر تمہیں دشا، ظفر آئے تو سورۃ الناس پڑھنا شروع کر دینا اور اس کے قریب مت جانا۔“

ساحل پر جیسے ظفر کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا وہ ابھی تک اپنی ہی بات پر قائم تھا، اس کی سوچیں دشا کے خیال میں ہی غرق تھیں۔ ”میں نے دشا کے بھیا تک روپ دیکھے ہیں مگر اس بار جس طرح میں نے اس کو دیکھا ہے، وہ دھوکہ نہیں ہے۔ وہ واقعی اذیت میں ہے۔“

ظفر غصے سے کھڑا ہو گیا۔ ”اذیت میں وہ نہیں ہے، وہ دوسروں کو اذیتیں دے رہی ہے اپنی سوچ تبدیل کر دینا اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی موت کی طرف دھکیل دے گا۔“

راحت، ظفر کو باہر تک چھوڑنے لگی۔ ”دیکھا ہے بھائی آپ نے ساحل کی انہی باتوں کی وجہ سے میں پریشان تھی۔“

ظفر نے راحت کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”ابھی تازہ بات ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ کوشش کرنا کہ وہ اکیلا نہ رہے۔ قرآنی آیات پڑھ کر پانی دم کر کے اسے پلایا کرو اس ناگہانی آفت سے خبردار نہ ہونے کے لیے ہمارے پاس بس یہی راستہ ہے۔ تم دعا کرنا کہ لوگوں کو ہم ان بدروحوں سے بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہم سب نے تو سروں پر کفن باندھ لیے ہیں۔ ہم میں سے کون کب لقمہ اجل ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔“

راحت نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اُنکی باتیں نہ کریں، جب اس کے بندوں پر ایسی مصیبت آجائے جس سے مقابلے کی سکت نہ رہے تو وہ کسی نہ کسی کو سیجا بنائے بھیجتا ہے آپ ایک کام کریں۔“

”کیا؟“ ظفر نے پوچھا۔

”میڈیا میں اس خبر نے سنسنی پھیلا دی ہے نمائش میں ہونے والے قتل کسی انسان نے نہیں بلکہ ہمزاد نے کیے ہیں۔ آپ اس بات سے نہ ڈریں کہ میڈیا والے آپ لوگوں کو پریشان کریں گے، آپ اور علامہ ایک پریس کانفرنس کریں آپ سارا مسئلہ لوگوں کے سامنے بیان کریں اور مدد مانگیں کہ کوئی ایسا مائل یا کوئی بھی شخص جو اس معاملے میں ان کی مدد کر سکتا ہے۔ آپ لوگوں سے رابطہ کرے۔“

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ یہ مشورہ مجھے توقیر نے بھی دیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ میڈیا والے ہمیں ہمارا کام نہیں کرنے دیں گے مگر صورت حال اس قدر گہرے ہے کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ہمارے پاس سوائے ارادے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ پریس کانفرنس کر لینی چاہیے۔ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔“

”آپ بس دیر نہ لگائیں، خدا کرم کرے گا۔ اب معاملہ آپ لوگوں کے بس کا نہیں رہا اور علامہ تو خود اس فیلڈ میں نئی ہے۔ اس کا تجربہ مجھ وہ ہے۔“ راحت نے ظفر کو ایک بار پھر سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں توقیر اور زبیر سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ظفر وہاں سے چلا گیا۔

ساحل کو کوئی بیماری نہیں تھی مگر ایسی نقابست تھی کہ اس

کے اعصاب مثل ہو گئے تھے، وہ چار روز تک ایسی ہی کیفیت میں رہا۔ پانچویں روز وہ خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔

مبصر اسامہ اپنے کلب میں لڑکوں کو مارشل آرٹ کی ٹریننگ دے رہا تھا، صبح کے دس بج رہے تھے اس نے لڑکوں کو دو گروپز میں تقسیم کر دیا تھا۔ دونوں گروپز ایک دوسرے کے بالقابل کھڑے تھے۔ ایک طرف سے ایک لڑکا آگے بڑھتا تو اس سے مقابلے کے لیے مخالف گروپ سے دوسرا لڑکا میدان میں آتا پھر ان کے درمیان کرائے کا چھوٹا سا مقابلہ ہونے لگا۔

مبصر اسامہ ان کے قریب کھڑا نہیں مختلف داؤبج یاد کر رہا تھا۔ دولڑکے کرائے کے خاص سفید لباس میں نجا کے خاص انداز میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ لڑکوں نے اپنے پیروں کو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کرتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو پھیلا لیا۔ انہوں نے بازوؤں کا کراس بناتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کرتے ہوئے انگوٹھے سمیت آپس میں جوڑ لیا، اور پھر Cat سٹائل میں اُپٹھتے ہوئے ایک دوسرے پر بھٹ پڑے۔ چھوٹے سے مقابلے کے بعد انہوں نے سیدھا کھڑا ہو کے سروں کو جھٹکا کے ایک دوسرے کو دوستی کا پیغام دیا۔

اسامہ نے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے تین مقابلے اور کرائے پھر اس نے انہیں بریک دے دی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کے اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔ دولڑکے کوئلڈ ریف لے کر اس کی طرف بڑھے۔ ان کے پاس پیپسی کے تین ٹن پیک تھے۔ ایک انہوں نے اسامہ کو دیا اور سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ”سر! آپ نے دس سال آدمی میں گزارے ہیں ہمیں کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں۔“

اسامہ نے اپنا کٹھن ہونے ہاتھ والا بازو ان لڑکوں کے سامنے کیا۔ ”اس واقعے کے بعد مجھے آرٹھ فورس کے کسی واقعے میں دلچسپی نہیں رہی۔ دس سال سر پر کفن باندھ کر اس ملک کی خدمت کی مگر جنوبی وزیرستان میں دہشت گردوں سے مقابلے کے دوران ہاتھ پر گولی لگی۔ فوج سے انعام یہ ملا کہ کسی زخمی کھوڑے کی طرح فوج سے علیحدہ کر دیا۔“

لڑکے نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔ ”سوری

سرا ہم آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ آری والوں سے آپ کا دل ٹوٹا مگر لوگوں کی خدمت کا جذبہ تو اب بھی آپ کے اندر موجزن ہوگا۔

اسامہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”اسی بات کا تو افسوس ہے کہ میری ملاقات میں اور تجربے میں کوئی کمی نہیں مگر میں لوگوں کے اس طرح کام نہیں آسکتا جس طرح پہلے فوج میں رہ کر ان کا تحفظ کرتا تھا۔“

دوسرے لڑکے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سر اس کلب کے ذریعے بھی آپ اپنا فن دوسروں کو دے کر لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔“

ایک لڑکے نے ریموٹ سے دیوار پر لگا LED TV آن کر دیا۔ نیوز چینل چل رہا تھا ایک سنسنی خیز خبر نے ان سب کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ نیوز کا سٹر ہاتھ میں مائیک لیے رومان ہوٹل کے باہر اپنی باتوں سے لوگوں کو چونکا رہی تھی۔

”آرٹ کی نمائش میں ہونے والے پچاس لوگوں کے قتل کی تحقیقات کے لیے بہت سی ٹیمیں کام کر رہی ہیں۔ پولیس، سی بی آئی، ریجنل سب انسپکٹر Crimnel کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے معصوم لوگوں کی جانیں لیں۔ ہمارے چینل پر ایک خبر نے لوگوں کی نیندیں اڑا دیں۔ سائیکا ٹرسٹ اور exorcist ڈاکٹر عمارہ کا کہنا ہے کہ ان سب اموات کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ ہے مگر لوگوں کی جانیں لینے والا کوئی انسان نہیں بلکہ ہمزاد ہے۔ ڈاکٹر عمارہ اور مسٹر ظفر نے ایک پولیس کانفرنس کی ہے دیکھتے ہیں کہ وہ ہم سب سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ اسامہ سمیت سب کی گولڈ ٹرکس ان کے ہاتھوں میں ہی رہ گئیں۔

عمارہ سامنے آئی۔ ظفر اور وہ اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ عمارہ نے اپنی بات شروع کی۔ ”ہمارا مقصد لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا نہیں بلکہ ہم تو اس شیطان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ ہم پولیس کی بات کو رد نہیں کر رہے۔ انہیں جس پر شک ہے وہ اپنے طور پر تحقیقات کریں مگر جو کچھ ہم جانتے ہیں ہم اس کے مطابق اس قاتل کو ڈھونڈیں گے۔ میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں جس کے مطابق نمائش میں لوگوں کا قتل جنہوں

نے کیا ہے وہ تمہیں ہمزاد ہیں۔

ہمزاد انسان کا ہی ایک روپ ہے۔ جو مرنے کے بعد انسان کے مردہ جسم سے الگ ہو جاتا ہے وہ ایک انسان کا ہی روپ ہے تو ہم کیوں اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ ہمیں ان شیطانوں سے مقابلہ کرنا ہے۔۔۔ ہمیں آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو آگے بڑھے اور اس جنگ میں ہمارا ساتھ دے۔“

سکرین پر عمارہ کا موبائل نمبر اور گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔ اسامہ نے اپنے موبائل پر وہ سب نوٹ کر لیا۔ اس خبر کے بعد مختلف لوگوں کے Coments آنے لگے۔ کسی نے عمارہ کی بات کا مذاق اڑایا اور کسی نے عمارہ کی باتوں کو سچ ماننے ہوئے اسے گہرائی سے لیا۔ اسامہ نے ٹی وی بند کر دیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس کی ٹیم کے کئی لڑکے عمارہ کی باتوں پر ہنس رہے تھے اور کئی خاموش بیٹھے اس کی باتوں کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اسامہ واش روم گیا۔ اس نے سینک کا غل کھولا اور رو دھوئے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہی منہ دھویا اور اپنی آنکھوں میں چھینٹے مارنے لگا۔ اس نے تولیہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں تولیہ نہیں تھا۔ اس نے دوسرے اسٹینڈ سے تولیہ اٹھایا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے چہرہ خشک کرنے لگا۔ اسے تل میں سے پانی گرنے کی آواز آئی۔ اس نے چوتکتے ہوئے تل کی طرف دیکھا کیونکہ اس نے اچھی طرح سے تل بند کر دیا تھا۔ غل پوری طرح کھلا ہوا تھا اور اس سے کافی پانی نکل رہا تھا۔

اسامہ سینک کی طرف بڑھا اور وہ بارہ غل بند کرنے لگا مگر اس کا وال اس قدر سخت تھا کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا تھا۔ سینک کے سوراخ میں ربر نہیں لگا تھا اس کے باوجود سینک میں پانی جمع ہو رہا تھا پانی پائپ کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

”یہ کیا گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ اسامہ سینک کی جالی چیک کرنے لگا۔ کہ اچانک سے واش روم کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور چٹخنی بھی لگ گئی۔ اسامہ کو خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”کون ہے۔“

سینک اوپر تک پانی سے بھر گیا اور پانی اُچھل اُچھل

کر باہر گرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر سینک کا سوراخ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہاتھ روم کے دروازے اور کھڑکیاں ہلنے لگیں۔ ہاتھ روم کی کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی چند منٹ سے کھل گئی۔

اسامہ کو محسوس ہوا جیسے آئینے میں کسی کا عکس ہے، اس نے سراو پر کرتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا تو پلک جھپکتے ہی وہ عکس غائب ہو گیا اور روشنی کی ایک تیز شعاع باہر سے کھڑکی کی جالی کو چیرتی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی اور اس سے منعکس ہو کر اسامہ کی بائیں آنکھ میں داخل ہو گئی۔

اسامہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ قدموں کو تھوڑا تھوڑا موڑتے ہوئے اس نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا کھڑکی کے ساتھ دیوار پر کوئی سایہ تھا جو اس کا نہیں تھا کیونکہ سائے کے دونوں ہاتھ تھے۔ وہ سایہ دھیرے دھیرے اسامہ کی طرف بڑھتا گیا اور پھر اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ جس کے ساتھ ہی اسامہ بیہوش ہو گیا۔

دروازے کی چھتی خود بخود کھل گئی۔ کافی دیر اسامہ کے باہر نہ آنے پر شاگردوں کو تشویش ہوئی۔ ایک لڑکا ہاتھ کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ سامنے سبز اسامہ بیہوش پڑا تھا۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر چیک کیا پھر اس نے دوسرے لڑکوں کو بلایا۔ تین لڑکوں نے مل کر اسامہ کو اٹھایا، وہ است اندر ہال میں لے گئے۔ انہوں نے اسے صوفے پر لٹایا۔ ایک لڑکا جلدی سے میڈیکل بکس لے آیا، انہوں نے اسے معمولی ہی ٹریٹمنٹ دی، جس سے اسے ہوش آ گیا۔

اس نے کانپتے ہونٹوں سے چاروں اور دیکھا جیسے تھوڑی دیر کے لیے اس کا ذہن ہو گیا ہو، کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں میں شناسائی سی جھانکنے لگی۔ ”مجھے کیا ہوا تھا؟“ اسامہ نے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سرا آپ بیہوش پڑے تھے۔ شکر ہے خدا کا کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔ اوپر جا کے آپ آرام کر لیں۔ ہم سب خود ہی پریکٹس کر لیں گے۔“ ایک لڑکے نے کہا۔

اسامہ اٹھنے لگا تو اسے خاصی غڑھا لگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لڑکا آگے بڑھا۔ ”سر میں آپ کو اوپر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

لڑکا اسامہ کو سہارا دیتا ہوا بالائی منزل تک چھوڑ آیا۔ سارے شاگرد دوبارہ اپنی پریکٹس میں مشغول ہو گئے۔ اسامہ اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا کہ واش روم میں کیا تھا، وہ کون سی بڑا سر رطافت تھی۔ جس نے اس کے قیام جیسے وجود کو ایک ہی جھٹکے میں غڈ حال کر دیا۔ ایسے ہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اس وقت جاگا جب ایک لڑکے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”سر۔۔۔“

اسامہ نے آنکھیں کھولیں۔ ”سر ہم سب جا رہے ہیں۔ ہماری پریکٹس مکمل ہو گئی ہے۔“ لڑکے نے بتایا۔

”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔“ اسامہ نے کہا۔

لڑکے کے جانے کے بعد اسامہ اپنے بستر سے اٹھا اب وہ خود کو تندرست و توانا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا، اس نے پردے پیچھے کیے شہر کا خوبصورت نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر اس خبر کی طرف چلا گیا، اس بار اسے یہ خبر کسی پٹی کی طرف نہیں لگ رہی تھی بلکہ اس کا ذہن اسے بار بار یقین دلانا رہا تھا کہ واقعی ہمزاد یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس خبر میں کہیں بھی کوئی جھوٹ نہیں ہے یہ ایک خوفناک حقیقت ہے۔

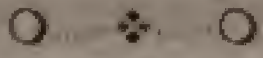
یہ ایک ناکہ بانی آفت ہے جو دھیرے دھیرے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ”میں اتنی دیر تک سوتا رہا۔“

اس نے خود کلامی کی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے فریج سے برگر نکالا اور اسے اودن میں گرم کر لیا۔ اس نے فریج سے کچپ بھی نکال لیا۔ وہ اپنا یہ مختصر سانچ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

○...○...○

اگلی صبح ہونے سے پہلے جب لوگ فجر کی نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ زرغام اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل میں مصروف تھا۔ وہ دریا کے کنارے ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان کے ہاتھ میں ایک آلو تھا۔ سورج طلوع نہیں ہوا تھا اس لیے ابھی اندھیرے کا ہی رات تھا۔

اس نے زرغام کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”سر! اپنا سامان سمیٹتے ہیں، سورج نکلنے والا ہے۔“ ان دونوں نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے نکل گئے۔



اسامہ حسب معمول صبح کے چھ بجے واک کے لیے گھر سے نکلا۔ گھر کے قریب ہی ایک کھلا میدان تھا۔ واک کے بعد وہ میدان میں ورزش کرنے لگا۔ وہ خود میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ سرچ کیے بغیر کچھ معلومات اس کے ذہن میں خود بخود جمع ہو گئی تھیں۔

اس کا ذہن اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ان سب حقائق پر یقین کرے۔ ایک رات میں وہ اسامہ نہیں رہا تھا۔ وہ یوگا کے انداز میں ہاتھوں کی انگلیوں اور پیروں کے ہتھوں پر وزن ڈالتے ہوئے جھکا ہوا تھا۔

اچانک سے اس کا پھولا ہوا سانس بحال ہو گیا، اس کی جسمانی قوت بڑھ گئی۔ آنکھوں کی پتلی کا رنگ سیاہ سے بنلا ہو گیا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا ذہن اپنے کسی ادھورے کام کی طرف مائل ہو گیا۔ وہ بے چینی سے اپنے ٹراؤز کی جیبیں ٹوٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ ایک چیز تھی۔ یہ کپڑے کا پاؤچ تھا اس نے وہ باہر نکالا اسے کھولا تو اس میں گینوں سے جڑا ہوا کلمہ تھا۔ جس میں عتیق، نیلم اور یا قوت کے پتھروں کو باریک باریک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیریں ایک طرف ایک انگلی سے منسوب تھی جس میں زرقون لگا تھا اور دوسری طرف وہ ایک کڑے سے جڑی تھیں۔ اسامہ کے لیے وہ نئی چیز تھی مگر اس کے ذہن میں اس چیز کی یادداشت موجود تھی، وہ اسے پہچانتا تھا۔ اس نے وہ پہچان لیا۔

گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ٹراؤز میں کوئی چیز نہیں تھی مگر اس کا وقت لمحہ بلمحہ بدل رہا تھا۔ اس نئی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے موجودہ وقت سے بھی نہیں کٹا تھا، مگر کوئی تھا جو اس کے ذہن میں داخل ہو کے اسے نئے راستے پر چلا رہا تھا۔



مادر اپنے کلیٹک میں گرم سمی بیٹھی تھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے اس لیے وہ ابھی فارغ تھی ابھی اس کے کلیٹک میں

لڑکے نے ایک ہاتھ میں ایمر جنسی لائٹ پکڑی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ اندھیرا چھٹ رہا تھا اور مدھم مدھم سی روشنی ہونے لگی تھی۔ زرغام نے جینز اور شرٹ کے ساتھ لاٹک کوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ لڑکا قمیص شلوار میں تھا۔

زرغام کے ہاتھ میں ایک کڑیا تھی جس نے سرخ رنگ کا دلہن کا لباس پہنا ہوا تھا۔ زرغام کے پاس ایک ڈبیہ میں بہت سی سوئیاں تھیں۔ اس نے ڈبیہ کھول کر زمین پر رکھ دی۔ اس نے کڑیا زمین پر لٹائی اور ڈبیہ سے سوئیاں نکالنے لگا۔

اس نے جیتے ہوئے نو جوان کی طرف دیکھا۔ ”ایک سوئی دلہن کے دماغ پر پور ایک سوئی دلہن کے دل پر۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک سوئی کڑیا کے سر پر لٹائی اور ایک سوئی کڑیا کے سینے پر لٹا دی۔ پھر زرغام نے وہ کڑیا ایک طرف رکھ دی اور ایک بڑی سی پلیٹ نکالی ساتھ ہی ایک چھوٹا سا شاپر نکالا۔ شاپر میں آنا تھا اس نے آٹا پلیٹ میں ڈال دیا۔

نو جوان نے آلو کو بمشکل قابو کر کے اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ آلو توڑنے لگا۔ نو جوان نے سر کٹے توڑتے آلو کو خشک آٹے کے ہار نکال دیا۔ آلو کے بچے نو جوان کے ہاتھوں میں تھے، وہ اسے آٹے پر دائرے میں کھانے لگا جس سے آلو کے جسم سے نکلتا خون آٹے پر دائرے بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ نو جوان اپنا ناپاک منتر بھی پڑھتا جا رہا تھا۔

زرغام کا یہ شاگرد اپنا کام بڑی مہارت سے کر رہا تھا۔ ان دونوں کو اپنا کالا جادو طلوع آفتاب سے قبل مکمل کرنا تھا۔ زرغام نے تھوڑا سا پانی ڈال کر اس خون لے آئے کو گوند دیا۔ پھر اس نے لکڑی کی ایک ٹرے پر اس آٹے کو رکھ کر اس کا ایک پتلا بنا دیا۔ اس نے اس پتلے کے جسم پر بہت سی سوئیاں لگا دیں۔

اس نے دلہن بنی کڑیا اس پتلے کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے وہ لکڑی کی ٹرے دریا میں بہا دی اور انتہائی سفاکی سے ہٹنے لگا۔ ”جاؤ دلہن اپنا دولہا ساتھ لے جاؤ۔ اس بار کام اٹتا ہے۔ دولہا، دلہن کو لے کر نہیں جائے گا بلکہ دلہن وہ لے جائے گی مگر دھیان رہے کہ کچھ دیر بعد یہ کشتی ڈوب جائے گی اور آنے کا دولہا پانی میں کھل جائے گا۔“

نو جوان کے لبوں پہ بھی شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کوئی مریض نہیں تھا۔ وہ کسی مہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ فون کی بیل بجی۔ اس نے فون اٹھایا تو ظفر لائن پر تھا۔

”کیسی ہو.....؟“ ظفر نے پوچھا۔

”بس ٹھیک ہوں.....“ عمارہ نے رندھی ہوئی آواز

میں کہا۔

ظفر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ہم ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکے ابھی مل کر کچھ کرنے کا وقت ہے اور ساحل.....“

”ساحل کو کیا ہوا.....؟“ عمارہ نے پوچھا۔

”تم تو سائیکائرسٹ ہو تم اس کا علاج کر سکتی ہو.....“

”لیکن مسئلہ کیا ہے.....؟“

ظفر نے عمارہ کو ساری بات بتائی کہ کس طرح ساحل کو وٹا نظر آئی۔ عمارہ سب سن کر سخت پریشان ہو گئی۔

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ ساحل کو تو سمجھایا جا سکتا ہے مگر وٹا اس کا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ساحل کی جان کو خطرہ ہے۔“ ظفر بھی پریشان ہو گیا۔

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”نی الحال تو آپ ساحل کو میرے پاس بھیجیں۔ میں اسے سمجھا دوں پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے بہت اُمید تھی کہ خیام ہماری مدد کرے گا مگر پچاس لوگوں کی اموات کے بعد مجھ سے بھی کوئی اُمید نہیں رہی۔“

ظفر نے عمارہ کی بات کی تردید کی۔ ”یہ بہت پیچیدہ اور راز کی باتیں ہیں، ہم نہیں جان سکتے ہیں کہ خیام نے ایسا کیوں کیا تم اس سے مدد جانی عمل کے ذریعے سے بات کرو۔“

”اس نے مجھے منع کیا تھا کہ اسے عمل سے بلائے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس نے کہا تھا کہ جب ہمیں اس کی مدد کی ضرورت ہوگی تو وہ آجائے گا۔“ عمارہ نے بتایا۔

ظفر نے اسے تسلی دی۔ ”خدا پر بھروسہ رکھو ضرور کسی نہ کسی کو سچا بتا کے بھیجے گا، ہم نے جو میڈیا کے ذریعے مدد کی اپیل کی ہے اس سے ہمیں فائدہ ضرور ہوگا۔ ہم خیام کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ کوئی انسان نہیں ہمزو ہے۔ ہمدی سوچ اور ہمارا علم محدود ہے۔“

عمارہ نے لمبا سانس کھینچا۔ ”شاید میں زیادہ جذباتی ہو

رہی ہوں بہر حال ساحل والا مسئلہ تو پریشان کن ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے ساحل کو میرے پاس بھیجیں۔“

”ٹھیک ہے میں آج ہی ساحل سے بات کرتا ہوں۔“ ظفر نے فون بند کر دیا۔

ساحل اپنے کپڑے استری کر رہا تھا، روتا کان لُج جا چکی تھی۔ راحت ساحل کے پاس آئی۔ ”چھوڑو! میں استری کرتی ہوں۔“ ساحل نے بہت پیار سے ماں کا ہاتھ پیچھے کیا۔ ”میری پیاری امی جان میں کر لوں گا۔ آپ میری جراثیم اور بوٹ نکال دیں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ راحت نے پوچھا۔

”ایک جاب کے لیے اپلائی کیا ہے، اُسی کے انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔“

”اور تمہاری CSS کی تیاری.....؟“

”وہ تیار ہی ہوئی رہے گی..... میرے لیے چھوٹی سی جاب بہت ضروری ہے۔ جس سے میں گھر کا کچھ خرچہ بھی نکال سکوں اور پڑھائی کے لیے بھی وقت نکال سکوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ پہلے جو بھی ہوا اس پر میرا بس نہیں تھا، میں CSS کی تیاری نہیں کر سکا۔ مگر اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کسی کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی۔ آپ اور رونا بھی میری ذمہ داری ہیں۔ میں پوری محنت سے اب CSS کی تیاری کروں گا۔“ ساحل نے استری کی ہوئی پینٹ ہینگر پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

راحت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ساحل کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ”خدا تمہیں کامیاب کرے۔“

چہرہ مڑے میں گئی اور وہاں سے تعویذ اٹھا کے لے آئی۔

اس نے تعویذ ساحل کے گلے میں ڈالا۔ ”تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یہ تعویذ گلے میں نہ رکھو۔ خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے گا۔“

ساحل نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ ”نہ اتنا دھم کیا کریں..... مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر ساحل دوبارہ اپنی شرٹ استری کرنے لگا۔

راحت گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ساحل کپڑے تبدیل کرنے لگا تو اس نے اپنے چہرے کو چھو ل۔ ”لوہ

میں نے تو شیو کی ہی نہیں۔“

ہے، مجھ پر ہو جائے گی۔“

اس نے کپڑے استری اسٹینڈ پر رکھے اور واش روم کی طرف بڑھا۔ اسے تعویذ کا خیال آیا واش روم میں جانے سے کہیں تعویذ کی بے ادبی نہ ہو اس خیال سے اس نے تعویذ جگلے سے ابھر کر استری اسٹینڈ پر رکھ دیا۔

”آپ کو تو نوکری اور بھی مل جائے گی مگر مجھے میری ماں نہیں ملے گی۔“ لڑکی نے پھر منت کی۔

اس نے شیو کی اور پھر کپڑے تبدیل کر لیے۔ پھر وہ تیزی سے اپنی موٹر بائیک کی طرف بڑھا۔ ”ای دروازہ بند کر لیں۔ مجھ پر ہورہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“

ساحل نے بائیک سٹارٹ کی تو لڑکی جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ ادھر راحت گھر کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اس نے استری اسٹینڈ سے کپڑے اٹھائے تو اس کی نظر تعویذ پر پڑی اس نے تعویذ اٹھایا۔ ”یہ لڑکا کبھی میری بات سمجھ گیا ہے نہیں لیتا۔ میرے کہنے کے باوجود اس نے تعویذ اُچار دیا۔“

راحت، بیٹے کی آواز سن کر سارے کام چھوڑ کر باہر آ گئی ساحل جا چکا تھا۔ ”اللہ کے حوالے“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

وہ تعویذ اٹھا کے اندر لے گئی۔ ساحل لڑکی کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا مگر اس کا ذہن اس نوکری کی طرف ہی تھا۔ ”میں اب اس انٹرویو کے لیے نہیں پہنچ سکتا۔ جانے ایسی نوکری دوبارہ ملے گی بھی یا نہیں۔“ اس نے چوڑی سے راستے کی طرف دیکھا۔ ”اور کتنی دور ہے تمہارا گھر۔“

تقریباً بیس منٹ کے بعد ساحل مین روڈ پر تھا جہاں خاصی ٹریفک تھی۔ اس کی موٹر بائیک بھی اب آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے بینڈل پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”کیا مصیبت ہے، سارا وقت تو میرا نہیں لگ جائے گا۔ مجھے ذرا پہلے ٹھکنا چاہیے تھا۔“ کچھ دیر بعد گاڑیوں کی بھیڑ نرم ہوئی تو اس نے اپنی بائیک کی سپیڈ دوبارہ تیز کر دی۔

”بس نزدیک ہی ہے۔ آپ سیدھا جا کے دائیں طرف مڑ جائیں۔“ لڑکی نے انتہائی معصومیت سے کہا۔

نہ جانے کہاں سے اچانک سفید چادر اوڑھے ایک لڑکی ہاتھ کو لہراتی ہوئی اس کی بائیک کے آگے آ گئی۔ فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے ساحل نے بمشکل بریک لگائی، ممکن تھا کہ بائیک اس لڑکی سے جا ٹکراتی۔ ساحل غصے میں بائیک سے اترا اور لڑکی پر برس پڑا۔

لڑکی نے ساحل کو خاموش کر دیا۔ ساحل سیدھا جا کے دائیں طرف مڑ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے کے بعد سڑک کے ساتھ ساتھ قبرستان کی دیوار شروع ہو گئی۔ لڑکی نے ساحل سے قبرستان کے داخلی دروازے کے قریب بائیک روکنے کے لیے کہا۔ ساحل نے بائیک روک دی۔ لڑکی بائیک سے اتری تو ساحل بھی بائیک سے اتر گیا۔

”اندھی ہو یا مرنے کا شوق ہے۔ جانتی ہو جس طرح میں نے بریک لگائی ہے یا میں مرنے یا تم۔“ لڑکی کے ہاتھ میں دوائی کی بوتل تھی اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔

اس نے دوائی کی بوتل ساحل کو دکھائی اور گھوٹیر لہجے میں بولی۔ ”میری ماں سخت بیمار ہے اگر میں نے یہ دوا بروقت نہ پہنچائی تو وہ مر جائے گی۔ میں نے کتنے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی مگر کوئی نہیں دیکھا۔ دور دور تک کوئی رکشہ بھی نہیں ملا۔“

”یہ تم قبرستان میں کہاں جا رہی ہو؟“ گندی رنگت والی دہلی پتلی سی وہ لڑکی اٹھا دیا انیس سال کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی غزالی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا۔

اس نے روتے روتے ساحل کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں آپ کی منت کرتی ہوں، آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں۔“

”اندرو آؤ میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔“

لڑکی نے روتے روتے ساحل کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں آپ کی منت کرتی ہوں، آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں۔“

ساحل نے گھڑی دیکھی۔ ”مجھے تو انٹرویو کے لیے جانا

ساحل نے گھڑی دیکھی۔ ”مجھے تو انٹرویو کے لیے جانا

گوئے کہ اس قدر بے چین اور گھبرائی ہوئی لڑکی میں اچانک حمل کیسے آگیا۔ اس لڑکی کی بات میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ ساحل اسے منع نہ کرے کہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

وہ دونوں چھوٹے سے تنک سے راستے پر چل رہے تھے۔ اس راستے کے دونوں طرف قبریں تھیں۔ اکثر قبرستان میں کوئی نہ کوئی شخص دکھائی دیتا ہے مگر اس قبرستان میں مکمل سناٹا تھا۔ دور دور تک سوائے ان دونوں کے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”یہ قبریں جو مہرت کی کہانیاں سناتی ہیں۔ کبھی ڈراتی ہیں، کبھی رلاتی ہیں۔ انسان کے غم سے نڈھال پتھر پتھر جو دیکھ دینا سے چھپا کے خود میں سمو لیتی ہیں۔“ ساحل اپنے دھیان میں پل رہا تھا۔

لڑکی نے پلٹ کر پوچھا۔ ”تم بھی ڈرتے ہو ان قبروں سے۔“

”نہیں۔“ اس نے نہیں ڈرتا۔“
”اچھا۔۔۔ آج پتہ چل جائے گا۔“ لڑکی نے تسخیرانہ انداز میں کہا۔
”کیا مطلب؟“

لڑکی نے جواب دینے کے بجائے اپنی انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ سامنے کوٹھڑی دیکھ رہے ہیں وہی میرا گھر ہے۔“

”تمہارا بھائی یا والدہ کون ہوں گے اس لیے تم لوگ قبرستان میں رہتے ہو اور تم تو بہت پریشان اور جلدی میں تھیں اب کیوں اتنا آہستہ چل رہی ہو، جا کے ماں کو واہ۔“
لڑکی چلتے چلتے رُک گئی، اس نے دوا کی بوتل ہوا میں اچھال دی۔ ”دوا کا تو بہانہ تھا۔۔۔ مجھے تو تم سے کسی کو ملوانا تھا۔“
ساحل گھبرا سا گیا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو۔“

”اندر کوٹھڑی میں کوئی تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔“

ساحل کو تعویذ کا خیال آیا جو اس کے گلے میں نہیں تھا۔ وہ واپس پلٹنے لگا۔ ”مجھے کسی سے نہیں ملنا۔“

اچانک وشاء کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”کہاں جا رہے ہو۔ صرف ایک بار مجھاپنی جھٹک دکھاؤ۔“

ساحل نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو وہ آواز کوٹھڑی کی طرف سے آرہی تھی۔ وشاء کی آواز نے ساحل کو بے چین کر دیا۔ اس پر عجیب سا حیرت طاری ہو گیا جس میں اس کے ذہن میں اسی وشاء کا خیال ابھرنے لگا جو اسے چاہتی تھی۔

اس کے قدم بے خودی میں اس کوٹھڑی کی طرف اٹھنے لگے۔ جو نئی ساحل کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ جیسے اس کی سانسیں تنہم گئیں۔ اس پر دل کے احساسات کا فسون چھا گیا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تکمیل کا روپ لیے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

وشاء دلہن کے سرخ لباس میں ایک پرانی سی چارپائی پر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”وشاء۔۔۔۔۔“ جو نئی ساحل کے منہ سے وشاء کا نام نکلا۔ کمرے کا ماحول کسی ظلم سے چند سی ساعتوں میں بدل گیا۔ نئی کی کوٹھڑی کسی شاندار کمرے میں تبدیل ہو گئی۔ وشاء دلہن بنی محلی بستر کے خوبصورت پنک پر بیٹھی تھی۔ ساحل نے مبہوت نظروں سے اپنے لباس کی طرف دیکھا، اس کا لباس بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے براؤن شیردازی اور پٹوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا اس کے سر پر کھلا تھا۔ یہ سہمی تبدیلی اس کی سماعت میں سرگوشیاں کر رہی تھی کہ آج اس کی اور وشاء کی شادی ہے۔ آج وہ اور وشاء ایک ہونے والے ہیں۔ جس محبوب کا غم اس کے لیے عمر بھر کا روگ بن گیا تھا۔ آج وہ غم اس کی عمر بھر کی خوشی میں بدلنے جا رہا تھا۔

خوشی کے ایک خوبصورت احساس کے ساتھ ساتھ دماغ کی کوئی قوت تھی جو اسے وہاں سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کی سوتیلی کسی کی تانی ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ دھیرے دھیرے وشاء کی طرف بڑھنے لگا اس قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہی کم سن لڑکی چار دروازے پر کھڑی تھی۔

وہ لڑکی ساحل کی طرف دیکھ کر مسکرائے گئی، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں، ایک سی پل میں اس کا سادہ سا لباس سبز رنگ کی ٹرتی اور لپٹے میں بدل گیا۔ اس کا چہرہ بھی بدل گیا۔ ساحل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت پر تھی۔

جس کے لیوں پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

اس بار اس کے ذہن نے اسے پوری طرح جھٹک دیا۔ اسے ہوش آنے لگا کہ وہ یہاں سے نکل جائے وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا تو دشا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”مجھے اس طرح چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

ایک بار پھر ساحل اپنے ہوش کھو گیا۔ وہ دوبارہ دشا کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دشا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ پری جیسی دکھ رہی تھی۔ خوبصورت اور معصوم۔۔۔۔۔ وہ حسن اس دنیا کا تھا ہی نہیں۔۔۔ وہ کسی کے خوابوں کی شہزادی تھی یا کسی مصور کا تخیل۔۔۔۔۔ جو بھی تھی وہ ساحل کی تھی۔

اس نے اپنی دکتی آنکھوں سے ساحل کی آنکھوں میں بھانکا۔ ”اب یہ دشا تم سے کبھی دور نہیں جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔“

ساحل کی نظریں دشا کے چہرے پہ ٹھہر گئیں۔ خود پر رشک کرنے کو دل چاہ رہا تھا مگر کوئی شاہد تھا جو دماغ میں کروٹیں بدل رہا تھا، ایسے سراپا حسن کا مالک بنے جا رہا تھا مگر خوشی کے اس احساس میں دبی چٹکریوں کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ دشا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حور یہ کو کوئی اشارہ کیا حور یہ وہاں سے چلی گئی، کچھ دیر کے بعد وہ کاغذ کی جی ہوئی پلیٹ میں لپٹ گیا۔ کہنا لے کر آئی۔

وہ مسکراتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھی۔ وہ پلیٹ لے کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”اپنا ہاتھ لو پر کرو، میں تمہیں یہ کہنا پہنچا دوں۔“

دشا نے شرماتے ہوئے پلکیں جھکا دیں۔ ساحل نے حور یہ سے مویہ کے پھولوں کا کہنا کہن لیا۔ کہنا پہنچتے ہی اس کی مدہوشی کو جھنجھوڑتی ہوئی اس کی دہنی تو تیں سو گئیں۔ اسے دشا کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ اپنی زندگی کے دوسرے بدشتوں سے بے خبر ہو گیا۔

دشا پلنگ سے نیچے اتری اور اپنے بھاری بھر کم عروسی جوڑے کو سنبھالتی ہوئی ساحل کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ ساحل کی طرف بڑھایا۔ ”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں ایک ایسی جگہ دکھاتی ہوں جسے کچھ کر تم دنگ دہ جاؤ گے۔“

ساحل مسکراتا ہوا دشا کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ دشا دروازے کی طرف بڑھی اور وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ باہر ایک خوبصورت لان تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ باغ تھا جس میں بے شمار پھل دار درخت تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے مالٹوں کے درختوں کے قریب آ گئے۔ دشا نے ایک لمحے کے لیے بھی ساحل کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ درختوں کے بیچ میں ہی نیچے جانے کا راستہ بنا ہوا تھا وہاں ایک میزمری بھی دکھائی دے رہی تھی۔ دشا اس میزمری کی طرف بڑھی تو ساحل نے تعجب سے پوچھا۔ ”یہ ہم نیچے کہاں جا رہے ہیں۔۔۔؟“

دشا نے مسکراتی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا۔ ”جو جگہ تمہیں دکھانا چاہتی ہوں، وہ یہیں تو ہے۔“ ساحل بھی دشا کے ساتھ ساتھ اس زینے سے نیچے اترنے لگا۔ حور یہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔

میزمری زیادہ لمبی نہیں تھی دشا نیچے اتر گئی۔ ساحل آخری زینے تک پہنچا تو کانور کی خوشبو اس کے حلق تک اتر گئی۔ وہ نیچے اترتا اس کے پیروں تلے کچی زمین تھی۔ ساحل نے چاروں اور نظر دوڑائی۔ تو سسٹناہٹ کے جھٹکے سے اس کا پورا وجود کانپ اٹھا۔

جس آسمان کو وہ اوپر دیکھ کر آیا تھا وہی آسمان یہاں بھی دکھائی دے رہا تھا، مگر یہاں رات کا اندھیرا تھا، آسمان میں ستارے ٹنڈار ہے تھے۔ اس کے دماغ کی رگیں ٹس ٹس کرنے لگیں، ایک میزمری اترنے سے وہ کس دنیا میں آ گیا جہاں اس وقت رات ہے۔ دور دور تک ہنرے کا نام و نشان نہیں بس ہر طرف مٹی ہی مٹی ہے۔ مٹی کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان میں پانی کی ایک تھیل دکھائی دے رہی ہے۔

لفظ یہ مشکل انک انک کے ساحل کی زبان سے نکلے۔ ”یہ دہشت ناک اور بے اسرار جگہ ہی دکھانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ جہاں پھولوں کی خوشبو کے بجائے کانور کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔“

دشا مسخرا نہ انداز میں بولی۔ ”پھولوں کی خوشبو تو ایک فریب ہے جذباتوں جیسا فریب۔ جس میں مدہوش ہو کے انسان اپنے آپ کو کھود دیتا ہے، لہذا سانس کھینچ کر اس کانور کی خوشبو کو خود میں سرایت کر لو۔ یہی اصل حقیقت ہے باقی سب

فریب ہے۔

جیسی گہری ہے۔

”کیا مطلب.....؟“ ساحل بوکھلا سا گیا

ساحل نے کسی سبے ہوئے بچے کی طرح فوراً ہی جھیل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

وشاء ہنستے ہوئے ساحل کے قریب آگئی۔ ”تم تو خوفزدہ ہو گئے۔ میں تو تمہیں یہ جھیل دکھانا چاہتی تھی۔ آؤ جھیل کے پاس چلتے ہیں پھر واپس لوپر چلے جائیں گے۔ تمہیں یہ جگہ اچھی نہیں لگ رہی تو ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر تم میرا ہاتھ چھوڑ دو میں خود چلنا چاہتا ہوں۔“

جھیل کا پانی شفاف اور چمکدار تھا۔ ساحل نے جھیل میں اپنا عکس دیکھا تو اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ساحل نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تم میرے شانے پر سر رکھے کھڑی ہو مگر جھیل میں تمہارا عکس کیوں نہیں دکھائی دے رہا۔“

وشاء نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا اور نفی کے اشارے میں اپنی انگشت ہلائی۔ ”ایسی جگہ میرا ہاتھ چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ تمہیں ایسا کچھ بھی نظر آسکتا ہے جس سے تم اپنا ہوش کھو دو۔“

وشاء تسخیرانہ انداز میں ہنسنے لگی۔ ”کیونکہ تم انسان ہو اور میں ہمزاد فکر مت کرو آج میں انسان اور ہمزاد کا یہ فرق ختم کر دوں گی۔“

”تم مجھے حریف قرار دی ہو.....“ ساحل کا حلق خشک ہونے لگا۔

یہ کہہ کر وشاء نے ساحل کو جھیل کی طرف دھکا دے دیا۔ ساحل چیخا ہوا گہری جھیل میں جا گرا۔ اسے تیراکی نہیں آتی تھی۔ جھیل کا گہرا پانی اسے نیچے کی طرف کھینچتا مگر وہ کوشش کر کے بار بار پانی کی سطح پر آتا اور لمبے لمبے سانس لے کر موت سے لڑنے کی کوشش کرتا۔

”کیا کروں، یہ جھیل ہے ہی ایسی جگہ اور میں تمہیں یہ جھیل دکھانا چاہتی ہوں۔“ جھیل دیکھتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

موت اور زندگی کی اسی کشمکش میں ساحل نے دیکھا کہ ایک جوان وشاء اور حریف کے سامنے کھڑا ہے۔ وشاء کی آواز ساحل کی سماعت سے نکرانی۔ ”خیام تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

جبکہ اس جوان کا چہرہ خیام کا نہیں تھا۔ ساحل بس اتنا ہی سن سکا پھر وہ گہرے پانی کے آگے بے بس ہو گیا۔

ساحل نے لمبا سانس کھینچا اور حوصلہ کرتے ہوئے وشاء کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جونی اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہوئے وہ پانی کی تہہ کی طرف گرنا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں سانس کی جگہ منہ سے طبلے نکل رہے تھے۔ وہ اپنی موت کو بالکل سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا۔

”مٹی اس قدر نرم تھی کہ وہ جس جگہ پاؤں رکھتا وہاں اس کے قدموں کا نشان بن جاتا۔ وہ جھیل کے قریب گئے تو عجیب سا شور ساحل کی سماعت سے نکل آیا۔ جیسے بہت سی عورتیں اور مرد آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ اس نے آوازوں کی سمت میں پلٹ کر دیکھا تو اس کا سانس اس کے حلق میں ہی اٹک گیا۔ آنکھیں باہر کو اٹلی پڑیں۔“

اسے خیال میں اپنی ماں جانے نماز پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ موت سامنے بانٹیں پھیلائے کھڑی تھی اور سماعت میں ردالوہ ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہاتھ سے پھسلتی زندگی کی ڈور کو کیسے تھامے رکھوں، شاید اب چند لمحوں کا فاصلہ تھا اس کی زندگی اور موت میں۔

سفید کفن میں بہت سے مرد اور عورتیں ہوا میں معلق ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے ان کے وجود غیر مرئی اور باطنی تھے۔ وہ کسی بھی کثیف چیز سے ہوا کی طرح گزر جاتے۔

اس کا جسم تیزی سے تہہ کی طرف گر رہا تھا۔ اچانک

ساحل کو جھیر جھیریاں آنے لگی تھیں۔ اس کی روح کپکپا رہی تھی..... اس کی وجدانی اور لاشعور کی سوئی ہوئی توتلیں بھی دھیرے دھیرے جاگ رہی تھیں۔

وشاء نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو، سامنے جھیل کی طرف دیکھو جو تمہاری آنکھوں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا، ایک ساعت میں ہی سب کچھ بدل گیا۔۔۔۔۔ وہ حسیل میں نہیں تھا۔

وہ جس جگہ پر تھا۔۔۔۔۔ وہ تنگ سی جگہ تھی، اس کے چاروں طرف مٹی ہی مٹی تھی۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی کھلی ہوئی قبر میں لیٹا ہے۔ اس کھلی ہوئی قبر کے دہانے پر وہی جوان کھڑا ہے۔ جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ جوان نے اپنا دایاں ہاتھ ساحل کی طرف بڑھایا ساحل بمشکل قبر سے باہر نکلا۔ وہ مبہوت نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قبرستان میں سوائے اس کے اور اس جوان کے اور کوئی نہیں تھا اس نے قبر کے قریب کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

”وہاں کون رہتا ہے؟“

جوان سب سے پہلے بولا۔ ”اندھ تمہاری دہن بیٹھی ہے اس کوٹھری میں کوئی نہیں رہتا۔ ابھی تک تمہیں سمجھ نہیں آئی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔“

ساحل کا جسم غصہ سے تھما، اسامہ اسے سہارا دیتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے گیا۔ ”میری موٹر بائیک۔“ ساحل نیم غنودگی کی حالت میں بمشکل بولا۔

”وہ میں منگواؤں گا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے تمہیں گاڑی میں ہی جانا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اسامہ نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اسامہ ساحل کے گھر پہنچا تو راحت نے دروازہ کھولا۔

”کیا ہوا میرے بیٹے کو۔۔۔۔۔؟“ بیٹے کو اس طرح اسامہ کے کندھے سے لٹکے ہوئے دیکھا تو وہ تڑپ کے کدہ گئی۔ ”کچھ نہیں ہوا، بس غنودگی ہے۔“ یہ کہہ کر اسامہ ساحل کو اس کے کمرے تک لے گیا۔ اس نے ساحل کو بستر پر لٹا دیا۔ ساحل کو کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہی ہے، اس نے تو جیسے نشہ آور چیز کھائی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے ہی سو گیا۔

راحت کچھ بولنے لگی تو اسامہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔

راحت مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے اسامہ کا ہاز و کھاز۔

”بیٹے تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ آخر ہوا کیا تھا۔“

ساحل نے راحت کی بے چینی آنکھوں میں جھانکا۔

”جائے نماز بچھالیں اور اپنے رب کا شکر ادا کریں جس کے آپ نے بیٹے کو اس شیطان کے شیعے سے بچا لیا۔ جس کے کالے چاد کے کھیل میں آج ساحل نے اپنی زندگی ہار دینی تھی۔ جس وشاء کے لیے ساحل دیوانہ ہوا پھر رہا ہے وہ زر غام کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ جو زر غام کے اشارے پر ساحل کے لیے جال بچھائی ہے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو آپ کا بیٹا اس دنیا میں نہ ہوتا۔“

راحت نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم کون ہو، میں تمہیں نہیں جانتی مگر جو احسان تم نے اس بے بس ماں پر کیا ہے اس کا بدلہ تمہیں خدا دے گا۔“

”آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔ آپ ساحل کے پاس بیٹھیں مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ ساحل کی موٹر بائیک بھی منگوانی ہے۔“ یہ کہہ کر اسامہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ راحت ساحل کے پاس جا کے بیٹھ گئی۔

ساحل گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔ راحت اس کے بال سہلانے لگی۔ ”میں تو بے خبر اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے دُعا میں مانگ رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا بیٹا کس مصیبت میں گرفتار تھا۔“

راحت اپنے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے اٹھی اور الماری سے سورہ یٰسین نکال کر لے آئی۔ وہ ساحل کے پاس بیٹھ کے سورہ یٰسین پڑھنے لگی۔ سورہ یٰسین پڑھنے کے بعد اس نے ساحل کی طرف پھونکا اور پھر جائے نماز بچھا کر شکرانے کے نفل پڑھنے لگی۔ خود کو کتنا ہی سمجھاتی مگر اس کے آنسو نہیں ٹھہر رہے تھے۔

اس نے نفل پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور اسامہ کے لیے دُعا میں مانگنے لگی۔ اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ راحت نے دُعا مکمل کی اور جائے نماز تہہ کر کے رکھ دیا اور فون کی طرف بڑھی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ راحت نے ریسپونڈر کان سے لگایا۔

(جاری ہے)